مُدیر:
نوید ظفر کیانی

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا کیا کہاں

چوکے

کالم گلوچ

کتابی چہرے

قہقہہ نواز

آئینہ خانہ

منظوم لطیفے

فیس بک موج میلہ

جستہ جستہ

اُرسلانؔ بلوچ، اظہر سعید مجوکہؔ، نارنگ ساقی، عطا الحق قاسمی، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر محمد یونس بٹ وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

ادب میں فحاشی کا چلن عام ہے خصوصاً قدیم شعرا اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاں فحاشی کے نمونے وافر ملتے ہیں منٹو، عصمت اور احمد ندیم قاسمی کے ہاں تو فحاشی کے مظاہر تلخ حقائق کے بیاں کے طور پر ملتے ہیں لیکن کچھ ادیبوں نے خالص فحاشی بھی لکھی ہے اور اس کے لئے انہوں نے اصلی اور قلمی دونوں نام استعمال کئے ہیں اور ان کی شہرت بطور فحش نگار کے ہی ہے حالانکہ وہ اچھے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں اور فحش تحریروں کے علاوہ بھی ان کی اچھی تحریریں موجود ہیں۔ بد قسمتی سے مزاح کی دنیا بھی فحاشی سے پاک نہیں اور اکثر مزاح نگاروں کے ہاں فحاشی کے کم یا زیادہ نمونے مل جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں قدیم مزاح نگار مبارک باد کے مستحق ہیں جن کی تحریروں میں فحاشی کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا مثلاً پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، مرزا فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، احمد جمال پاشا کے ہاں شستہ اور شائستہ مزاح ملتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مزاح کی کامیابی کے لئے فحاشی کی آمیزش قطعی ضروری نہیں اور اگر خیال میں تازگی ہے تو ایسا مزاح مقبول عام ہوگا، بغیر کسی فحاشی یا ذو معنی اشارے یا لفظ کے لیکن اکثر مزاح نگاروں کے ذو معنی الفاظ کے استعمال کے باعث مزاح میں سے فحاشی کو الگ کرنا اتنا آسان نہیں۔

موجودہ دور میں تھیٹر نے طنز و مزاح کی اچھی روایت ڈالی اور کئی شاہکار ڈرامے سامنے آئے مثلاً بڈھا، ٹرنک اور بوسکی، جنم جنم کی میلی چادر، وغیرہ جن میں طنز و مزاح بغیر فحاشی کے خالص صورت میں موجود ہے۔ تماثیل اور رفیع پیر تھیٹر کے اکثر ڈرامے اسی معیار پر ہیں لیکن بد قسمتی سے رفتہ رفتہ اندھی کمائی کے شوق میں اکثر تھیٹر والوں نے ذو معنی جملوں کی صورت اور واہیات گانوں پر ڈانس کی شکل میں فحاشی کو فروغ دیا حتیٰ کہ بات تقریباً عریاں ڈانس اور ڈائریکٹ فحش گوئی تک پہنچ گئی۔ حتیٰ کہ مجبوراً حکومت کو حرکت میں آنا پڑا اور تھیٹر کی سرگرمیاں محدود ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئیں، یعنی تھیٹر کا انجام بھی وہی ہوا جو ہماری فلم انڈسٹری کا ہو چکا ہے۔ فلم میں بھی اچھی کہانی، فن اور معیار کی بجائے فحاشی کا شارٹ کٹ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

تھیٹر ذمہ داران سے فحاشی کی وجہ پوچھی جائے تو ان کا ایک ہی رٹا رٹایا جواب ملتا ہے کہ "ڈیمانڈ" تو ڈیمانڈ کرنے والے تو کل کو یہ بھی ڈیمانڈ کر دیں گے کہ اپنی بیٹیوں کو سٹیج پر ہمارے سامنے ننگا کھڑا کر دو تو کیا یہ اس کو پورا کر سکیں گے؟

دراصل وجہ ڈیمانڈ نہیں پیسے کی ہوس ہے کہ کسی بھی طریقے سے کمایا جائے اور زیادہ سے زیادہ۔ پھر اس میں اخلاقی قدروں کا یہی حال ہوگا، ورنہ عوام کا مزاج تو میڈیا خود بناتا ہے۔ اگر معیاری شستہ اور شائستہ ڈرامے تیار کئے جائیں گے تو عوام کا مزاج بھی ویسا ہی بن جائے گا اور معیار کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور چیز کی ڈیمانڈ ہی نہیں کریں۔ جو لوگ معیار نہیں دے سکتے، وہ فحاشی کا شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں یعنی خود عوام کا مزاج بگاڑتے ہیں اور پھر بہانہ تراش لیتے کہ عوام یہی چاہتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے کہ پہلے کسی کو نشے پر لگایا جائے اور پھر جب نشہ نہ ملنے پر اس کا بدن ٹوٹنے لگے تو نشے کو اس کی ضرورت اور ڈیمانڈ بنا کر دے دیا جائے۔

خادم حسین مجاہد

ولائتی زعفران

مارک بالا/نوید ظفر کیانی
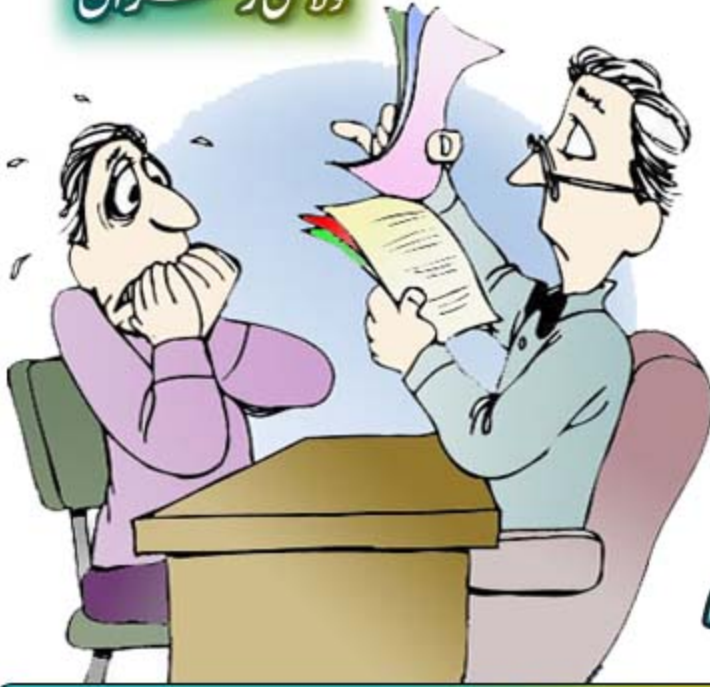
مجھے نوکری چاہئے

یہ ڈکاہی تمثیلچہ ۲۰۱۲ء کے سالانہ اجتماع میں "سپارکل کمپنی" کے ملازمین اور صارفین کے سامنے اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے۔

راوی خواتین وحضرات! السلام علیکم، آپ کے سامنے ایک خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس کا عنوان ہے "مجھے نوکری چاہئے۔" میں دیکھ رہا ہوں کہ لفظ "خاکہ" پر آپ میں سے بہت سوں کے منہ لٹک گئے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ کوئی بور قسم کا خاکہ نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ یہ اگرچہ ویسا ہی بور قسم کا خاکہ ہے جس میں ہمارے آباء، دادا، پردادا، لکڑ دادا وغیرہ پیش ہوتے رہے ہیں۔ اگر وہ اس قدر خلوص کے ساتھ بور ہوتے رہے ہیں تو امیدِ واثق ہے کہ آپ کو بھی بور ہوتے ہوئے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوگی۔ تو حاضرین، آپ سب تیار ہیں بور ہونے کے لئے؟ اگر آپ کا جواب ہاں یا نہیں یا دونوں میں ہے تو حاضرِ خدمت ہے اس خاکے کا پہلا منظر۔ یہ ایک نوجوان کی کہانی ہے جو تھمقران کمپنی لمیٹڈ نامی کمپنی میں ملازمت کے لئے بے چین ہے، واضح رہے کہ یہ ایک بہت بڑی کمپنی ہے جس کی برانچیں ایک چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔

پہلا منظر نوجوان انٹرویو دے رہا ہے (ظاہر ہے کہ باس انٹرویو لے رہا ہے)

باس میں آپ کے کوائف دیکھ سکتا ہوں؟

(نوجوان اپنے کوائف باس کی طرف بڑھاتا ہے۔ باس اُسے لے کر زور زور سے پڑھتا ہے)

باس میرا نصب العین ایک ایسی بین الاقوامی کمپنی میں نوکری کرنا ہے۔ جس میں ایک اچھی سی کافی مشین لگی ہوئی ہو!۔۔۔ایں۔۔۔۔اچھی سی کافی مشین لگی ہوئی ہو؟

نوجوان جی جناب! میری دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ اپنے دن کا آغاز ہمیشہ ایک خوشگوار مذاق سے کرنا چاہیئے۔ پسند آیا آپ کو یہ مذاق؟

باس تم فوراً سے پہلے یہاں سے جا سکتے ہو۔ تمھیں فائر کیا جاتا ہے۔

نوجوان — فائر کیا جاتا ہے؟ لیکن جناب میں تو آپ کی کمپنی کا ملازم ہی نہیں ہوں۔

باس — مجھے پتہ ہے لیکن میری اماں کہا کرتی ہیں کہ اپنے دن کا آغاز ہمیشہ کسی نہ کسی کو فائر کر کے کرنا چاہیئے۔

نوجوان — جناب، کم از کم آج تو آپ کو اپنے دن کا آغاز کسی کو ہائر کر کے کرنا چاہیئے۔

باس — ہائر، فائر۔۔۔ ہائر فائر، آہا۔۔۔ کیا خوب قافیہ بن رہا ہے اِن دونوں لفظوں میں۔۔۔ چلو ایسا کرتے ہیں، ایک چھوٹا سا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں کہتا رہوں گا فائر، ہائر ۔۔۔ ہائر، فائر ۔۔۔ فائر، ہائر ۔۔۔ ہائر، فائر ۔۔۔ اور الارم لگا دیتا ہوں، دیکھتے ہیں کہ الارم جب رُکے گا تو میں اُس وقت کون سا لفظ بول رہا ہوں گا، ہائر یا فائر۔۔۔ اگر اُس وقت میں ہائر کہہ رہا ہوں گا تو تمھیں کمپنی میں ہائر کرلیا جائے گا اور اگر فائر کہہ رہا ہوں گا تو تمھیں فائر کر دیا جائے گا، بغیر ہائر کیئے۔۔۔ بولو منظور ہے؟

نوجوان — ٹھیک ہے جناب، گیم شروع کریں۔

باس — ہائر، فائر۔۔۔ فائر ہائر۔۔۔ ہائر، فائر۔۔۔ فائر ہائر۔۔۔ فائر فائر فائر فائر فائر فائر فائر فائر۔۔۔

نوجوان — دیکھیں دیکھیں اب آپ کھیل میں بے ایمانی کر رہے ہیں۔

باس — نہیں! میں بے ایمانی نہیں کر رہا ہوں، خود دیکھ لو، دفتر کی کھڑکی نے واقعی آگ پکڑ لی ہے۔

(نوجوان بوکھلا جاتا ہے)

نوجوان — **(زور زور سے آواز دیتے ہوئے)** پولیس کو بلائیں ۔۔۔۔۔۔ ارررے میرا مطلب ہے فائر بریگیڈ والوں کو بلائیں!!

(نوجوان اپنا موبائل فون اُسے تھما دیتا ہے، باس فون پر نمبر ڈائل کرتا ہے اور بولنے لگتا ہے)

باس — ہیلو۔۔۔ ہائر انجن۔۔۔ ار ۔۔۔ فائر انجن والے بات کر رہے ہیں؟ میں قہقران مہقران کمپنی کا باس بول رہا ہوں۔ میرے دفتر میں آگ لگ گئی ہے۔

فائر انجن والا — فکر مت کریں، پہلے میرے چند سوالوں کے فرداً فرداً جواب دیں۔۔۔

باس — میں باس ہوں، باس صرف سوال کرتے ہیں، سوالوں کے جواب نہیں دیتے۔

فائر انجن والا — اگر آپ نے میرے سوالوں کے جواب نہیں دیئے تو میں آپ کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے قاصر رہوں گا۔

باس — اوہ اچھا اچھا، سوال داغئے۔

فائر انجن والا — کیا آپ کے دفتر کی انشورنس ہوئی ہوئی ہے؟

باس — ، ہوئی ہوئی ہے۔

فائر انجن والا — اچھا تو کیا آپ کے دفتر کے سب لوگ سانس ٹھیک ٹھیک لے رہے ہیں؟

باس — جی ہاں، میرا یہی خیال ہے۔۔۔ ذرا ٹھہریئے، میں اس نوجوان کو چیک کرتا ہوں۔

(باس نوجوان کے پاس آتا ہے اور اُس کے دونوں نتھنوں کو بند کر کے دیکھتا ہے، نوجوان زور سے چلاتا ہے)

باس — **(فون پر)** جی بالکل، یہ نوجوان سانس لے رہا ہے۔

فائر انجن والا — اِس صورتحال میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کوئی ایمرجنسی وغیرہ نہیں ہے۔۔۔ چنانچہ فائر انجن آپ کے پاس تین دنوں کے اندر اندر پہنچ جائے گا۔

باس — اوہ ٹھہریں، ٹھہریں۔۔۔ مجھے اس نوجوان کی سانسوں کا ایک بار پھر معائنہ کرنے دیں۔

(باس نوجوان کے دونوں نتھنوں کو دوبارہ بند کرتا ہے، نوجوان بے چین ہو کر چلاتا ہے۔۔۔ بچاؤ ۔۔۔ بچاؤ)۔

باس کیا یہ ایمرجنسی کی بات نہیں؟

فائر انجن والا جی بالکل ہے۔۔۔ ہمارے ادارے کے ضابطہ نمبر ۶۱۶ کے مطابق جب کوئی مدد کے لئے پکارے اور بچاؤ بچاؤ کہے تو یہ ایمرجنسی کا موقع ہوتا ہے۔۔۔ ہم جتنی جلد ممکن ہو سکا، آپ کے آفس پہنچ رہے ہیں۔

(باس دوبارہ نوجوان کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

باس فائر انجن کے ہمارے آفس پہنچنے میں ابھی کچھ وقت ہے تو کیوں نہ اس دوران ہم انٹرویو کا سلسلہ جاری رکھیں؟

نوجوان جناب! دفتر آگ کی پلیٹ میں ہے، ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔

باس یہ تو کوئی اچھی بات نہیں، یہ اس دفتر میں تمھارا پہلا دن ہے اور تم ابھی سے یہاں سے بھاگنے کی تیاری کر رہے ہو۔

نوجوان ٹھیک ہے جناب، تو پھر پوچھیں سوال مجھ سے۔

باس ٹھیک ہے، میں تم سے ریاضی کا ایک نہایت آسان سوال کرتا ہوں۔ آج صبح، ہماری سٹاف بس ایمسٹرڈیم سے چلنا شروع ہوئی، وہاں سے ۲۵ ملازمین بس میں سوار تھے، پہلے سٹاپ پر بس میں تین ملازمین بس میں سوار ہوئے، اگلے سٹاپ سے دو، اگلے چار سٹاپ سے کوئی ملازم بس میں سوار نہ ہوا، اس سے اگلے سٹاپ سے تین ملازمین بس میں سوار ہوئے اور اس سے اگلے سٹاپ سے دو ملازمین۔۔۔ اس سے اگلے سٹاپ پر۔۔۔

نوجوان (بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے) جناب، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس دوران ہم فائر، ہائر والا کھیل جاری رکھیں۔

باس سنو تو سہی۔۔۔ اگلے سٹاپ سے صرف ایک ملازم بس میں آیا، اگلے چار مقامات سے کوئی ملازم بس پر سوار نہیں ہوا اور آخری سٹاپ سے صرف تین ملازمین بس میں سوار ہوئے، اچھا اب یہ بتاؤ کہ بس کتنے مقامات سے گزری؟

نوجوان میں یہ تو نہیں جانتا لیکن جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی کمپنی کو ایک سٹاپ تا سٹاپ نان سٹاپ بس کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ فائر بریگیڈ کو اس قدر مقامات پر قیام نہیں کرنا پڑے گا۔

باس اچھا تو اگلا سوال۔۔۔ فرض کرو کہ بس بحفاظت دفتر پہنچ چکی ہے، تو اس وقت دفتر میں کتنے ملازمین ہوں گے

نوجوان کوئی بھی نہیں۔

باس کوئی بھی نہیں۔۔۔ بھلا وہ کیسے؟

نوجوان جب کہیں آگ لگ جاتی ہے تو دفتر کا عملہ دفتر خالی کر جاتا ہے۔ آپ کے ملازمین بھی دفتر کو خالی کر کے دفتر کی عمارت سے دور کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو چکے ہوں گے۔

باس واہ۔۔۔ متاثر کن، تمہارے جواب میں ذہانت جھلک رہی ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی بقایا زندگی تم میرے دفتر میں ملازمت کر کے گزار دو!

نوجوان بقایا زندگی؟ رہ ہی کتنی گئی ہے میری بقایا زندگی! اگر آگ اسی طرح تیزی سے پھیلتی رہی تو میری بقایا زندگی بیس منٹوں سے زیادہ نہیں بچے گی۔

باس اب جبکہ تم میرے ملازم بن چکے ہو تو مجھے یاد آیا ہے کہ ہمارے دفتر میں ایک بہت عمدہ کافی مشین موجود ہے۔ آؤ چلو، کافی پیتے ہیں۔

راوی واہ بھئی واہ۔۔۔ان دو بوریت کے مارے افراد نے تو اپنا کردار بخوبی ادا کیا ہے۔اب ہم چلتے ہیں اس تمثیلچے کے دوسرے منظر کی طرف۔اس منظر میں باس اُس نوجوان کا تعارف اپنے عملے کے دو مزید ملازمین سے کروائے گا۔ پہلا ملازم ایمسٹر ڈیم ہے جبکہ دوسرا روٹر ڈیم۔۔۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں، یہی سوچ رہے ہیں ناں کہ۔۔۔۔دھت تیرے کی!

دوسرا منظر: باس اور نوجوان کافی مشین والی جگہ جاتے ہیں جہاں اُن کی ملاقات دفتر کے دو ملازمین سے ہوتی ہے۔

ایمسٹر ڈیم ہیلو باس! کیا ہمارے دفتر والوں نے ابھی سے دیوالی کا تہوار منانا شروع کر دیا ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارا دفتر خاصا روشن ہو گیا ہے۔

نوجوان ارے عقلمندو! وہ آگ ہے، یہ ایمرجنسی کا موقع ہے، تہوار کا نہیں۔

ایمسٹر ڈیم کیا کہا۔۔۔ایمرجنسی؟ تو یہ آگ ہے، خیر، فکر مت کریں، بارشوں کا موسم آئے گا تو یہ آگ خود بخود بجھ جائے گی۔

نوجوان کک۔۔۔کیا کہا؟ بارشوں کا موسم، تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے، تب تک تو اس آگ نے دفتر کی عمارت کو تباہ کر دینا ہے۔

ایمسٹر ڈیم فکر مت کرو، دنیا کی کوئی طاقت ہمارے دفتر کو تباہ نہیں کر سکتی، اگر کوئی ایسا کر سکتا ہے تو وہ ہے اس دفتر کا عملہ!

نوجوان ایں۔۔۔کیا؟

باس ارے ہاں ایمسٹر ڈیم اور روٹر ڈیم۔۔۔بھئی ہماری کمپنی کے نئے ملازم سے ملو، یہ ہیں ڈیم ڈیم صاحب، ہمارے نئے ملازم، فی الحال بے عہدہ ملازم۔

ایمسٹر ڈیم ہیلو ڈیم ڈیم!

نوجوان ہیلو ایمسٹر ڈیم!

روٹر ڈیم ہیلو ڈیم ڈیم!

نوجوان ہیلو روٹر ڈیم!

روٹر ڈیم کیوں یار، تم نے کل بھارت اور برطانیہ کے درمیان ہونے والا کرکٹ میچ دیکھا؟ سہواگ نے ایسی ایسی دھنائی کی ہے کہ کیا بتاؤں، اور ''اوجا'' نے تو کشتوں کے پشتے لگا دیے، وکٹیں خشک پتوں کی طرح اُڑ رہی تھیں۔۔۔بھارت کی ٹیم نے تو آگ ہی لگا کر رکھ دی۔

نوجوان تصحیح کر لو، بھارت نے انگلینڈ کے خلاف نہیں بلکہ اس دفتر میں آگ لگا دی ہے۔کیا خیال ہے؟ کیا ہمیں فائر الارم نہیں بجا دینا چاہیئے تاکہ دفتر کے ملازمین ہوشیار ہو جائیں۔

روٹر ڈیم نہیں، اس کی قطعاً ضرورت نہیں، الارم کی آواز سن کر تو وہ نیند سے جاگ پڑیں گے۔

نوجوان تو کیا وہ دفتر میں آ کر سو جاتے ہیں؟

روٹر ڈیم ہاں، سوتے تو وہ رہتے ہیں لیکن ہر وقت نہیں۔۔۔ سوتے وہ اُس وقت ہیں جب اُنھیں کام کرنا پڑتا ہے۔

راوی: اِن چاروں اصحاب کی گفتگو کے دوران ایک اور صاحب دفتر میں داخل ہوتے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں، یہ کون صاحب ہیں؟

تیسرا منظر: ایک نیا فرد دفتر میں داخل ہوتا ہے۔

باس (خاصے غصے سے) تم دفتر میں اب آ رہے ہو، اِس وقت! گھڑی دیکھو، گیارہ بج کر سولہ منٹ ہو چکے ہیں۔

فائر مین معذرت چاہتا ہوں، میں فائر مین ہوں۔

باس تم فائر مین ہو، سپر مین ہو یا سپائیڈر مین، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، مجھے دفتر میں نظم و ضبط چاہیئے اور بس!

فائر مین جناب، میں فائر مین ہوں، آپ کا ملازم نہیں، میں

یہاں آگ بجھانے آیا ہوں۔

باس: اوہ اچھا اچھا، تو تم وہ والے فائر مین ہو، کافی کا کپ لو گے؟

فائر مین: کافی؟ نہیں جناب، کافی سے آگ نہیں بجھائی جا سکتی۔

باس: نہیں نہیں، میرا مطلب ہے کہ تم کافی پیو گے؟

راوی: کافی مشین کے نزدیک اِن صاحبان کی اس لغو گفتگو کے دوران، فائر مین آگ بجھانے کی کوشش کرتا ہے اور چند منٹوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے اور دوبارہ کافی مشین کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ آیئے دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

نوجوان: تمھارا بہت بہت شکریہ فائر مین، آگ اس قدر تیزی سے پھیل رہی تھی کہ مجھے تو تشویش ہو چلی تھی۔۔۔تم نے میری جان بچائی ہے۔

ایمسٹرڈیم: یہ جو تم نے جان بچانے کی بات کی ہے تو اس سے مجھے یاد آیا ہے کہ میں نے ابھی تک ایم ایس ایکسل کا وہ جدول محفوظ نہیں کیا ہے جس پر میں پچھلے دو گھنٹوں سے کام کر رہا تھا۔ اچھا اللہ حافظ، اب آپ سب سے اُس وقت ملاقات ہو گی جب اگلی دفعہ آگ لگے گی۔ (کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)۔

روٹرڈیم: میں بھی چلتا ہوں، انشاء اللہ اب آپ سے اُس وقت ملاقات ہو گی جب اگلی دفعہ آگ لگے گی۔ (کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

باس: اچھا بھئی اگلی آتشزدگی کے وقوعے تک اللہ حافظ (کمرے سے باہر نکل جاتا ہے، فائر مین بھی ساتھ ہی نکل جاتا ہے، نوجوان کمرے میں اکیلا ہے)

نوجوان: (دہشت زدہ ہو کر چلاتا ہے) کیا؟ یہاں دوبارہ بھی آگ لگنی ہے؟

راوی: ڈیم ڈیم حقیقی معنوں میں خوفزدہ ہے اور اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ پہلے روز ہی اس کمپنی کی ملازمت کی آفر قبول نہ کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اب بھی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کے حصول کے لئے پورے شد و مد سے کوشاں ہے۔ اگلے روز وہ نوکری کے لئے ایک اور انٹرویو پر جاتا ہے۔ ریسیپشن پر وہ اُس کمپنی کے باس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں وہاں کیا ماجرا ہوتا ہے۔

باس: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) ہیلو!
(نوجوان مشاہدہ کرتا ہے کہ اُس کمپنی کا باس بھی ہو بہو کھکھران میکھران کمپنی کے باس جیسا ہے۔ اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل جاتی ہیں اور وہ زور سے چلاتا ہے "اوہ! نہیں" اور دفتر سے بھاگ نکلتا ہے۔)

راوی: یہاں اس خاکے کا اختتام ہوتا ہے۔ ڈیم ڈیم نے اپنی بقایا زندگی کے لئے جو کوائف بنائے ہیں اُس میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ "میرا نصب العین ایک ایسی بین الاقوامی کمپنی میں نوکری کرنا ہے جس میں۔۔۔آگ سے بچنے کا خصوصی انتظام ہو"۔۔۔اب اُسے اچھی کافی کی کوئی اتنی زیادہ خواہش نہیں رہی، یوں بھی کافی کا ٹھرک خود اپنی جان سے زیادہ نہیں ہوتا۔ آپ کا اس خاکے کو برداشت کرنے کا بہت بہت شکریہ۔۔۔اللہ حافظ۔

سید جالب دہلوی نے اودھ کے تعلقداروں اور روساء کے تعاون سے ۱۹۱۶ء میں لکھنو سے ایک رسالہ "ہمدم" جاری کیا۔ جالبؔ مرحوم اکبرالہ آبادی کے خاص دوستوں میں تھے۔ اکبرؔ نے "ہمدم" کے اجراء پر اپنا پیغام تہنیت یوں پیش کیا ؎

خوب ہے نام اس کا گر "ہمدم" رہے — دم نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

پرانے چاول

الشغری

عظیم بیگ چغتائی

چودھری صاحب سے میری پہلی ملاقات تو جب ہوئی جب میں دوسری جماعت میں داخل ہوا۔ جس وقت میں درجہ اول میں آیا تو دیکھا کہ چودھری صاحب مرغا بنے ہوئے ہیں۔ اس مبارک پرند کی وضع قطع چودھری صاحب کو مجبوراً تھوڑی دیر کے لیے اختیار کرنا پڑتی تھی۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھے اور سبق یاد کرنے کے وجوہ اور اس کے خطرناک نتائج پر گفتگو رہی کہ ماسٹر صاحب کے ڈنڈے نے یہ عارضی صحبت درہم برہم کردی۔ میں تو گرفتار تھا اس لیے بچ گیا۔ اور چودھری صاحب الگ بٹھائے گئے۔ یہ تو گویا پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کالج تک ساتھ رہا۔

بی۔ اے میں چودھری صاحب عازمِ بیت اللہ ہوئے۔ حج کرنے میں سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ حاضریاں کم ہوجائیں گی اور امتحان میں شرکت کی اجازت نہ ملے گی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ حج سے جو واپس ہوئے تو اپنا نام کالج کے نوٹس بورڈ پر آویزاں پایا۔ ان لڑکوں کی فہرست میں جو کالج سے غیر حاضر رہنے کی پاداش میں امتحان سے روکے جانے والے تھے۔

''ذرا غور تو کیجئے'' چودھری صاحب بولے ''یہ ستم نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر کرکٹ کی ٹیم مہینے بھر کے لیے باہر جائے تو سب کو حاضریاں ملیں۔ اگر لڑکے چتوڑ کا قلعہ اور دہلی کے کھنڈر دیکھنے جائیں تو شعبۂ تاریخ کے پروفیسر صاحب اس سیر سپاٹے کو حصۂ تعلیمی سمجھ کر حاضریاں پوری کروائیں۔ آخر تکمیل دینیات کے سلسلے میں اگر کوئی حرمین شریف جائے تو اس کو کس بناء پر پوری حاضریاں نہ ملیں؟ جیسے اور مضامین مثلاً اقتصادیات و تواریخ ہیں ویسے دینیات بھی لازمی مضمون ہے''۔

اُن کی کوششیں رائیگاں نہ گئیں اور محکمۂ دینیات کے پروفیسروں نے چودھری صاحب کی پوری حاضریاں دلوائیں

اور امتحان میں شرکت کی اجازت مل گئی۔

۱

حج سے پہلے وہ چودھری صاحب تھے اور حج کے بعد ''الحاج الشذری الہندی'' بہت غور وخوض کے بعد تمام عربی قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے حجاز میں پہنچ کر لفظ ''چودھری'' معرب ہو کر ''الشذری'' ہوگیا تھا اور یہ ارتقائی نشوونما چودھری صاحب کی ذات شریف میں اس قدر حلول کرگئی تھی کہ خالص عرب کا باشندہ تو کوٹ پتلون بھی پہن سکتا ہے مگر ''الشذری'' اس سے مجبور تھے۔ اور عربی جبہ وقبہ پسند کرنے لگے تھے لیکن باوجود مختصر ڈاڑھی اور عربی لبادہ اور انتہائی کوشش کے وہ کسی طرف سے عرب معلوم نہ ہوتے تھے۔ ان کی تمام کوششیں اپنے کو عرب بنانے میں بالکل اسی طرح ضائع جاتی تھیں جس طرح بعض دیسی عیسائی کوٹ پتلون پہن کر غلط اُردو دیدہ و دانستہ بولتے ہیں اور غلط انگریزی مجبوراً اور تہ پہ تہ سفید پاؤڈر کی لگاتے ہیں مگر حقیقت نہیں چھپتی اور بعینہٖ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کمرے میں قلعی ہوئی ہے اس میں کسی زمانہ میں ضرور باورچی خانہ تھا۔ نہ یورپین انٹر میں بیٹھنے سے کام چلتا ہے اور نہ یورپین نرخ پر چائے خریدنے سے۔ غرض یہی حالت چودھری کی تھی کہ عرب بننے کی تمام کوششیں رائیگاں جاتی تھیں۔

میں نے اور اُنہوں نے تعلیم ساتھ پائی تھی۔ دونوں کی عربی دانی کی قابلیت بھی برابر تھی۔ اگر وہ روانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھ سکتے تھے تو اٹک اٹک کر میں بھی پڑھ سکتا تھا۔ رہ گیا سوال معنی کا تو یہ کبھی طے نہ ہوسکا کہ میں اس میں ان پر فوقیت رکھتا ہوں یا وہ مجھ پر۔ لیکن حج سے واپس آنے کے بعد ان کو بہت سی چیزوں کی عربی معلوم ہوگئی تھی اور اس کا میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

چودھری صاحب کا اتنا پرانا ساتھ، پھر اتفاق کی بات کہ ساتھ ہی عراق کا سفر درپیش ہوا۔

بغداد کی گلیوں میں دو آدمی ۔۔۔ میں اور شذری ۔۔۔ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ دونوں میں سے واقعہ دراصل یوں ہے کہ ایک بھی عربی نہیں جانتا۔ شہر کی چیخ و پکار کیا ہے؟ یقین مانیے کہ گویا چاروں طرف قل ہو اللہ پڑھی جارہی ہے۔ میں اور چودھری صاحب دونوں عربی نہیں جانتے۔ لیکن پھر بھی مجھ میں اور چودھری صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

''تم احمق ہو'' بھائی شذری نے کہا ''ارے میاں عربی بولنا اور سمجھنا اس قدر آسان ہے کہ وہ ہر شخص جو ہماری اور تمہاری طرح اردو جانتا ہے اور فارسی میں بھی قدرے دخل رکھتا ہے بڑی آسانی سے عربی بول اور سمجھ سکتا ہے''۔

میں نے تنگ آکر کہا ''خدا گواہ ہے، آج تیسرا دن ہے کہ بغداد آئے ہیں مگر میری سمجھ میں یہاں کا ایک حرف نہیں آتا۔ طبیعت ہے کہ الٹی جاتی ہے۔ خدا کی پناہ تربوز مانگو تو چھوارے دے رہے ہیں اور روٹی مانگو تو پانی۔ یہاں سے جلدی بھاگنا چاہیے۔ میری عمر تو گذر جائے گی اور یہ عربی سمجھ میں نہ آئے گی''۔

اِدھر تو میرا یہ حال اور اُدھر بھائی شذری کا یہ خیال کہ کچھ نہیں صرف معمولی اُردو میں۔ مثل، دَل، اَل گم وغیرہ لگاؤ بس عربی ہوگئی۔ اسی بنا پر چودھری صاحب بقول خود عربی دانی کا قائل ہی نہ ہوتا تھا۔ اگر سڑک پر دو آدمیوں میں حجت یا لڑائی ہو رہی ہو تو چودھری صاحب کا فرض ہوتا کہ لڑائی کی وجہ سے مجھے آگاہ کریں اور یہ ظاہر کریں کہ عربی سمجھتے ہیں۔ یا پھر کہیں سائن بورڈ پر نظر جائے تو ناممکن کہ اس کی تفسیر میرے سامنے نہ پیش ہو۔ مجھ کو یہ باتیں ان کی کہاں تک تکلیف نہ دیتیں جبکہ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ حضرت کسی طرح بھی مجھ سے زیادہ عربی سمجھنے کے اہل نہیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم دونوں مدینہ کے قاضی صاحب سے ملنے جارہے تھے۔ راستہ میں چودھری صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر ایک چائے کی دکان پر چڑھ گئے۔ آٹھ درجن فنجان کا آرڈر دیا گیا۔ میں نے تعجب سے چودھری صاحب کی طرف دیکھا۔ اوّل تو مجھ کو اس قسم کی چائے سے کوئی دلچسپی نہیں کہ پھیکی سیٹھی بغیر دودھ کی چائے بیٹھے شیشے کے فنجانوں میں پی رہے ہیں۔ اور پھر یہاں ایک

نہ دو بلکہ آٹھ درجن فنجان چائے جو کسی طرح بھی نہ پی سکتا تھا۔

میں نے چودھری صاحب سے کہا ''آخر یہ کیا حماقت ہے؟''

چودھری صاحب تنک کر بولے ''دام ہم دیں گے،تم کیا جانو۔عربی سمجھتے نہیں، نہ یہاں کے نرخ کا پتہ، دیکھو آج ہم تم کو دکھاتے ہیں کہ کسی ملک میں جانا اور وہاں کی زبان سمجھنا کتنا مفید ہوتا ہے''۔

غرض چائے آئی اور خوب پی اور لنڈھائی۔ پھر بھی بچ رہی۔ آخر کہاں تک پیتے مگر چودھری صاحب نے ''زرمی خورم'' کر ڈالا۔

جب چائے کا بل پیش ہوا تو چودھری صاحب سٹپٹائے۔ قریب قریب دو ڈیڑھ پیسہ فی فنجان طلب کر رہا تھا اور چودھری صاحب ایک درجن فنجان کے دام ایک یا ڈیڑھ پیسہ کے حساب سے دے رہے تھے۔کہاں ایک پیسہ فی فنجان اور کہاں ایک پیسہ فی درجن۔ جب غلط سلط عربی سے معاملہ نہ سلجھا تو حضرت شذری نے دکاندار کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پر لا کھڑا کیا۔اور دکاندار کے کھمبے پر جو نرخ لکھا ہوا تھا۔اس کی طرف دکاندار کی توجہ مبذول کرائی کہ جب کھلم کھلا نرخ لکھ رہا ہے تب آخر کیوں دام زیادہ مانگتے ہو؟ دکاندار نے اس عبارت کو پڑھا کچھ چکرایا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ سارے میں اس سرے سے اس سرے تک تمام دکانوں پر خواہ وہ چائے کی ہوں یا کھجوروں کی، اور یا گوشت کی، بڑے بڑے سیاہ حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔جس کا اُردو میں ترجمہ ہوتا تھا۔''ایک پیسہ میں ایک درجن فنجان چائے۔''

دکاندار نے کہا ''میں نے یہ نہیں لکھا، کوئی مردود سارے بازار میں یہی لکھتا چلا گیا۔اور میں اس کا ذمہ دار نہیں۔''

مجھے ایک دم سے خیال آیا اور میں نے چودھری صاحب کو ہندوستان کے اسی قسم کے اشتہار یاد دلائے ''ایک پیسہ ایک درجن چائے کی پیالیاں'' یا پھر'' گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے''۔ یہ مرض عراق میں بھی پھیلا ہوا ہے۔اس بدعت کی ذمہ دار چائے کی کمپنیاں تھیں نہ کہ کوئی چائے والا۔

میں نے چودھری صاحب کی عربی دانی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ چودھری صاحب کا یہ کہنا کہ'' آپ کون ہوتے ہیں۔ دام میرے گئے یا آپ کے'' مجھ کو خاموش کر دینے کے لیے کافی تھا۔

(۲)

چائے پی کر ہم حضرت قاضی صاحب کے یہاں گئے۔ بدقسمتی سے وہ نہ ملے، اور اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑ کر دریا کے کنارے پہنچے۔

عراق میں ایک ناؤ ایسی بھی ہوتی ہے، جیسے گول پیالہ۔خوش قسمتی سے ایسی ہی ناؤ ملی۔ میں تو چپ کھڑا رہا اور چودھری صاحب نے ہندوستانی عربی یا باالفاظ دیگر عراقی اُردو میں بات چیت شروع کی۔ خدا معلوم انہوں نے کیا کہا اور ملاح نے کیا سمجھا مگر نتیجہ اس گفت و شنید کا یہ ہوا کہ ہم دونوں ناؤ میں بیٹھ گئے اور دریا کی سیر ہونے لگی۔اس ناؤ کی تعریف کے چودھری صاحب نے پل باندھ دیئے۔ کہنے لگے کہ''اس ناؤ میں خاص بات یہ ہے کہ بھنور یعنی گرداب میں پڑ کر بھی نہیں ڈوبتی۔''

میں نے تعجب ظاہر کیا تو انہوں نے کہا کہ'' دیکھو ابھی اسے گرداب میں لے چلیں گے، تاکہ تم خود دیکھ لو!''

میں نے کہا'' خدا کے واسطے رحم کیجئے۔ مجھ کو ذرہ بھر بھی شک نہیں، آپ سچ کہتے ہیں اور مجھ کو تسلیم ہے کہ کم بخت ناؤ حضرت نوحؑ کی کشتی کا مقابلہ کرلے گی۔''

مگر وہ نہ مانے پر نہ مانے بیچ دریا کے بہاؤ سے ذرا ہٹ کر برے زور و شور سے بھنور پڑ رہا تھا جس کو دیکھنے سے ڈر لگتا تھا۔ چودھری صاحب ملاح سے غلط سلط عراقی اُردو بول رہے تھے۔ چونکہ لفظ عمیق جانتے تھے لہٰذا تمام تر دریا کی گہرائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اب ملاح سے انہوں نے اس خوفناک بھنور کی طرف انگلی اٹھا کر کہا کہ ''غریق کشتی من الگرداب۔'' لفظ گرداب پر انگلی سے بھنور کی شکل بنائی اور بھنور میں ناؤ لے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ خدا کے واسطے میرے اوپر رحم کرو۔مگر وہ میری سنتے ہی نہ تھے۔ ''ٹھہرو جی۔'' کہہ کر میرا ہاتھ انہوں نے جھٹک دیا۔ ملاح

نے نہ معلوم اُن سے کیا کہا جس کو یہ قطعی نہ سمجھے ہوں گے مگر بات چیت بھلا کیسے رک سکتی۔ عربی میں فارسی اور انگریزی تمام الفاظ بولے جاتے خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ان کی بلا سے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ میں چیختا پیٹتا رہ گیا اور ملاح نے تیزی سے کشتی کو لے جا کر گرداب میں ڈال دیا اور کشتی نے چرخ گھومنا شروع کیا۔ جب کشتی گھومی تو اوّل تو مجھے ڈر لگا۔ لیکن پھر لطف آیا۔ ہم دونوں کشتی کا کنارہ پکڑے نیچے پانی کو دیکھنے لگے۔ یہ لطف بہت عارضی تھا اور میرا سر چکرایا۔ میں نے واپس چلنے کو کہا۔ اِتنے میں موذی ملاح نے پانی میں پتوار ڈال کر ناؤ کی گردش میں اضافہ کردیا۔ چودھری صاحب ہنس رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ ''خدا کے واسطے بس کرو۔ میرا سر پھٹا۔''

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے پانی کی سطح پر الٹا لٹکا ہوا گھوم رہا ہوں۔ اب چودھری صاحب کو بھی چکر آئے۔ وہ دراصل ضبط کررہے تھے۔ ورنہ اُن کی اور میری حالت یکساں تھی۔ وہ پھر ہنس رہے تھے لیکن میں تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور زور سے چلایا کہ ''خدا کے واسطے ناؤ روکو۔''

چودھری صاحب اِس خیال میں تھے کہ جب جی چاہے گا رکوالیں گے۔ چنانچہ اب اُنھوں نے خود ڈگمگاتے ہوئے ملاح سے کہا ''ایھا الشیخ شدۃ المن الدقص اخرج من الگرداب۔''

بانگڑو ملاح واللہ اعلم سمجھتا بھی ہوگا یا نہیں کہ فارسی میں بھنور کو گرداب کہتے ہیں۔ اور پھر الشذری اور خود اس کے عربی کپڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور دریا کا شور اور پھر لٹو کی طرح ناؤ کی گردش، سمجھنا تو درکنار ملاح نے سنا بھی کہ نہیں۔ اس نے سنا اور نہ سمجھا اور نہ سننے یا سمجھنے کی کوشش کی اور اللہ کا نام لے کر دانتوں سے اپنے ہونٹ دبا کر ''ایاغ'' کہہ کر زور سے پتوار پانی میں ڈال کر ناؤ کو اور بھی گھن چکر کردیا۔ میں تو آنکھیں بند کرکے چلا کر سجدے میں گرا اور ادھر الشذر ''یا ایھا الشیخ'' کا نعرہ مار کر جو اپنی جگہ سے ہٹے تو میرے سر پر نازل ہوئے۔ اٹھے اور پھر گرے اور لوٹن کبوتر کی طرح لوٹنے لگے۔ ایک طرف اپنے گھٹنے توڑ رہے تھے تو دوسری طرف اپنی داڑھی اور ٹھوڑی سے میری پیٹھ۔ ان کی ٹھوڑی میری پیٹھ میں کس طرح لگ رہی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ میں ایسے وقت میں بھی پچھتا رہا تھا کہ ناحق میں نے کہہ سن کر ان کی ڈاڑھی کم کرائی۔ میں سجدے میں پڑا ''سبحان ربی الاعلی کہے جارہا تھا۔'' ''خدا کے واسطے نکالو''۔

اُدھر الشذری بوکھلا کر چلائے ''شدۃ المن الرقاصہ ایے ایھا الشیخ خدا کے واسطے اخرج من الگرداب ارے مرا۔''

میں پھر چلایا ''ہائے مرا''۔

اِدھر اس ناہنجار ملاح نے ایک مرتبہ اور پانی میں پتوار ڈال کر زور سے چکر کی تیزی میں اضافہ کردیا۔ میری یہ حالت ہوگئی کہ سر پھٹا جارہا تھا اور یقین ہوگیا کہ سر چکرا کر اب موت واقع ہورہی ہے۔ چودھری صاحب نے اب دہائی اور تہائی دینا شروع کی اور میں پڑے پڑے ان کی کوششوں کی داد دے رہا تھا۔ وہ چلا رہے تھے ''اے نالائق شیخ ----- بر حمتک کم بخت اشدۃ من الرقص۔۔۔ ارے اخرج ۔۔۔ من الگرداب، اے موذی ناؤ نکال۔''

چکرا کر وہ میرے اوپر پھر گرے۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا، ساری دنیا گھوم رہی تھی۔ چودھری صاحب نے پھر دھاڑ کر کہا ''ایھا الشیخ ایے الو۔۔۔ ابن الالو والخنزیر۔۔۔ قسم خدا کی۔۔۔ واللہ ۔۔۔ ارے بھئی شیخ ارے اشدۃ المن الرقص۔۔۔ ارے مرے۔۔۔ ابے روک ۔۔۔ روک ۔۔۔ اے نکال۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ ابے ایھا الشیخ من الموذی اخرج من الماء الگرداب۔۔۔ نالائق ۔۔۔ بدمعاش۔۔۔ واللہ ۔۔۔ بھئی شیخ!''

مگر توبہ کیجئے بھلا ان باتوں سے کہیں ناؤ رکنے والی تھی سر پٹک پٹک کر ہم دونوں بے ہوش ہوگئے۔

نہ معلوم کتنی دیر بعد آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو دریا کے کنارے بے بس پایا۔ مارے درد کے سر پھٹا جارہا تھا۔ تمام چائے دریا برد ہوچکی تھی۔ نہ طاقتِ رفتار تھی، نہ طاقتِ گفتار۔ بڑی دیر تک اس پسپائیت کے عالم میں پڑے رہے۔ بڑی کوششوں کے بعد بھائی

شنذری نہ معلوم کس طرح اٹھ کھڑے ہوئے کہ چاروں شانے چت گرتے اور اُدھر وہ نابکار ملاح ہنس رہا تھا اور اپنی مزدوری کا طالب تھا، اِدھر الشذری مزدوری نہ دیتے تھے اور اپنی گردابی عربی اس نقاہت میں بول رہے تھے۔

جب ایک فارسی داں حضرت کا ادھر سے گذر ہوا تو معاملہ صاف ہوا۔ ادھر الشذری نے ملاح کی شکایت کی کہ ہم دونوں کو اس نے ناؤ میں چرخ دے کر اَدھ مرا کر دیا اور مزدوری مانگتا ہے۔ اور ادھر ملاح نے کہا کہ ''ایسے لوگ بھی کم دیکھنے میں آئے ہوں گے کہ مارے چکر کے مرے جا رہے تھے مگر بار بار یہی کہتے تھے کہ ناؤ کی شدت کے ساتھ رقص کراؤ۔ میرا خود سر چکرا گیا۔ اور دگنی مزدوری واجب ہے۔''

''ارے کم بخت چودھری۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں کہا ''یہ تمہاری عربی میری جان لے لے گی۔ یاد رکھو اگر میں مر گیا تو یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا۔''

قصہ مختصر ملاح کو مزدوری دینی پڑی اور ہم گدھوں پر لاد کر گھر پہنچائے گئے۔ بھیجا ہل گیا تھا۔ اور ہلنا جلنا دوبھر تھا۔ رہ رہ کر میں الشذری کو کوستا تھا کہ ''ملعون تیری گردابی عربی نے میری جان لے لی۔''

تین چار روز تک دونوں کا حال پتلا رہا۔ معلوم ہوا کہ اکثر لوگ ناؤ کو گرداب میں ڈلوا کر رقص کراتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر چودھری صاحب نہ قائل ہوئے۔ وہ بھی یہی کہے گئے کہ ''یہ سب شرارت ملاح کی تھی اور اس نے جان بوجھ کر ہماری لسی بنا ڈالی۔'' واللہ اعلم

اِسی ہفتے میں جب ہم دونوں کے دماغوں میں توازن قائم ہو گیا تو مدینہ منورہ کے قاضی صاحب کے یہاں پہنچے۔ قاضی صاحب موصوف کو ابنِ سعود کے حملہ کی وجہ سے وطن چھوڑنا پڑا تو حیدرآباد پہنچے، وہاں سرکار نظام سے سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر ہوگئی۔ کچھ عرصہ تک ہندوستان کی سیاحت کی، پھر عراق میں سکونت پذیر ہوگئے۔ انہوں نے اچھی طرح سفر کیا تھا اور ہندوستانیوں سے اُن کو محبت تھی۔

ایک فارسی داں عراقی کرم فرمانے ہم دونوں کو قاضی صاحب سے ملایا۔ وہ بہت جلد مختصر سا تعارف کرا کے چلے گئے اور ہم دونوں رہ گئے۔ چودھری صاحب نے فوراً حسبِ عادت غلط سلط عربی بولنا شروع کر دی۔ قاضی صاحب ایک لفظ فارسی کا نہ جانتے تھے اور ٹھیٹ عربی میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر کسی جملے کے دو ایک لفظ جو اُردو میں رائج ہیں۔ میں سمجھ لیتا تو اندازے سے جملہ کا تھوڑا بہت مطلب بھی سمجھ لیتا، ورنہ قاضی صاحب کی گفتگو سمجھنا دشوار تھی۔ مگر بھائی الشذری شاید مجھ سے دوگنا سمجھ رہے تھے۔ قاضی صاحب حیدرآباد، بمبئی، لاہور، دہلی، آگرہ وغیرہ کی سیر کر چکے تھے۔ اِتنا تو پتہ چلتا تھا کہ ان مقامات کا ذکر کر رہے ہیں باقی میری سمجھ میں کچھ آتا نہ تھا۔ لیکن بھائی الشذری بیچ میں بار بار بول اٹھتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ قاضی صاحب کی گفتگو حرف بحرف سمجھ رہے ہوں۔ میرے بارے میں وہ بہت پیشتر ہی قاضی صاحب سے یہ کہہ کر خاموش ہو چکے تھے کہ ''لاعلم لسان العربی۔'' یعنی یہ عربی قطعی نہیں جانتے۔ لہٰذا اب قاضی صاحب بھائی شنذری کی طرف مخاطب تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ سمجھ رہا ہے حالانکہ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ اِتنا ہی قاضی صاحب کی گفتگو

ایک طالبِ علم، جو فیض احمد فیض کا بہت مداح تھا، ایک کالج میں داخلے کے لئے گیا تو وہاں ''فیض ہال'' کا نام پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

''آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ فیض احمد فیض کے نام پر ہال دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے'' اُس نے اپنے ساتھی سے کہا جو اُسی کالج کے انتظامی امور پر فائز تھا۔

دراصل یہ ہال ''فیض محمد'' کے نام پر ہے'' اُس کے ساتھی نے بتایا ''فیض احمد فیض سے اس کا کوئی تعلق نہیں!''

''اچھا!'' طالبِ علم نے حیرانی سے کہا ''کیا وہ بھی کوئی رائٹر تھے؟''

''بالکل!'' اُس کے ساتھی نے کہا ''اُنہوں نے کالج کے لئے چیک لکھا تھا۔''

سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے جتنا کہ میں۔ آگرہ کے لفظ کے ساتھ ایک ہی جملے میں تاج محل کا نام آیا اور پھر تعریفی الفاظ۔ اس موقع پر الشذری سمجھ رہے تھے کہ تاج محل خوان کی ملکیت ہے۔ کیونکہ خود آگرہ کے باشندے تھے۔ اظہارِ خصوصیت ضروری سمجھا اور قاضی صاحب سے انہوں نے کہا ''انا اھل بلدہ آگرہ۔'' یعنی میں بھی شہر آگرہ کا رہنے والا ہوں۔ قاضی صاحب سمجھ گئے۔ فوراً ہی انہوں نے کہا ''مگر تم تو علی گڑھ سے آئے ہو۔''

میں بھی اندازاً مطلب سمجھ گیا اور شذری بھی۔ اس پر الشذری بولے ''انا اھل آگرہ مگر طالب علم من الدار العلوم فی علی گڑھ۔''

قاضی صاحب باوجود ''مگر'' کے سمجھ گئے کیونکہ علی گڑھ یونیورسٹی کا نام سن چکے تھے۔ بطور شکایت کے الشذری نے کہنا چاہا کہ آپ آگرہ آئے مگر علی گڑھ نہ آئے۔ لفظ آئے کی عربی تو جانتے نہ تھے، یا یاد نہ تھی، لہٰذا نازل ہونا استعمال کیا ''حضرت نزول فی آگرہ من الممبئی لا نازل علی گڑھ۔''

قاضی صاحب سمجھ گئے اور تیزی سے وجہ بیان کرنے لگے جو نہ الشذری سمجھے اور نہ میں۔ مگر الشذری سر ہلا رہے تھے اور بولے ''ھنا دار العلوم علی گڑھ معروفا کثیر المن الھند والدھر۔'' یعنی علی گڑھ یونیورسٹی ہندوستان اور دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ اس کے بعد ہی قاضی صاحب نے پوچھا کہ بمبئی سے علی گڑھ کتنی دور ہے۔ اب الشذری ذرا چکرائے کیونکہ نہ تو عربی گنتی جانتے تھے اور نہ میل کی عربی۔ میری تجویز کہ الف لیلہ کا الف بمعنی ہزار اور فرسخ بجائے میل کام دے جائے گا۔ اُنہوں نے ''ٹھہرو جی'' کہہ کر روک دی اور قاضی صاحب سے بولے ''فاصلہ ازعلیگڑھ من الممبئی یک لیل و یک نھار۔'' یک لیل و یک نہار کلمہ کی انگلی سے بتا کر جوش کے ساتھ انگلی ہلائی۔۔۔ ایسے کہ باوجود کہ قاضی صاحب فارسی نہ جانتے تھے مگر مطلب قطعی سمجھ گئے، ایک دن ایک رات کا سفر ہے۔ میں بھی الشذری کی قابلیت کی داد دینے لگا۔ لیکن قاضی صاحب نے فوراً ہی سرسید کا تیزی سے کچھ ذکر کر کے ایک اور ٹیڑھا سوال اٹکا دیا، وہ یہ کہ سرسید مرحوم کے کوئی اولاد میں سے ہے بھی کہ نہیں اور ہے تو کیا کرتا ہے؟ مگر الشذری تو عربی زبان کے ماہر ہو چکے تھے۔ میری تجویزوں کو رد کرتے ہوئے بولے کہ ''ٹھہرو جی مجھے عربی بنانے دو۔'' بہت جلد الشذری نے قاضی صاحب کو جواب دیا ''سید راس مسعود بن سید جسٹس محمود بن سرسید۔'' اِس پر قاضی صاحب نے پوچھا کہ ''سیّد محمود کیا کرتے ہیں؟'' تو میں نے الشذری سے کہا کہ کہہ دو ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' مگر الشذری نے میری تجویز رد کر کے کہا ''رحمتہ اللہ علیہ'' واقعی مناسب جواب تھا اور قاضی صاحب سمجھ گئے۔ لیکن الشذری نے اور بھی واضح کر دیا اور اپنے جواب کو مکمل کر کے دہرایا ''سید راس مسعود بن سید جسٹس محمود رحمتہ اللہ علیہ بن سر سید علیہ الرحمتہ۔'' اور پھر اس پر بھی بس نہ کی اور کہا ''بجیرتم و التعجب کہ حضرت نزول حیدر آباد و لا تعارف من الراس مسعود صدر محکمہ تعلیمات حیدر آباد۔'' قاضی صاحب سمجھ گئے اور شاید اظہارِ تاسف کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نے قاضی صاحب سے اجازت چاہی تو قاضی صاحب نے ہم دونوں سے جو کچھ بھی کہا، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھائیں۔ واپسی پر چودھری صاحب نے راستے میں اپنی عربی دانی کا سکہ میرے اوپر بٹھانے کی کوشش کی اور میرا ناک میں دم کر دیا۔ انہوں نے عربی قواعد زبان کی رو سے میرے تمام تجویز کردہ جوابات غلط بتائے اور کئی لفظوں کے بارے میں سخت بحث رہی، وہ کہتے تھے کہ عربی میں اور میں کہتا تھا کہ فارسی۔

تنگ آ کر اپنی جان چھڑانے کے لیے میں نے تسلیم کر لیا کہ ''بیشک آپ کو مترجم کی امداد کی قطعی ضرورت نہیں۔'' شاید وہ اور میں دونوں ناؤ والا قصہ بالکل بھول گئے تھے۔

۳

بعدِ مغرب ہم دونوں قاضی صاحب کے یہاں پہنچے۔ بدقسمتی سے قاضی صاحب گھر پر نہ تھے۔ حبشی ملازم جس نے ہمیں صبح دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ ہم لوگ دعوت کے سلسلہ میں آئے ہیں۔

بڑی بدتمیزی سے پیش آیا اور اس نے لے جا کر ہمیں کمرے میں بٹھایا۔ ہم لوگوں کی بدقسمتی، ہاں بدقسمتی کہ یہ حبشی چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں ایک دوسرا حبشی ملازم آ گیا۔ یہ اس حبشی ملازم سے زیادہ خطرناک اور زیادہ حبشی تھا۔ مجھے صرف دو چیزوں سے ڈر لگتا ہے۔ ہندوستان میں بلڈاک سے اور عراق میں حبشی ملازم سے، واللہ اعلم ہندوستانیوں کو دوسرے قسم کے کتے کیوں نہیں ملتے اور عراقیوں کو دوسری قسم کے ملازم۔

جب کافی دیر ہو گئی اور دعوت کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے کہا کہ ''چودھری صاحب! یار کہیں غلطی تو نہیں ہوئی اور دعوت کل شب کو تو نہیں ہے۔''

واقعہ بھی ہے کہ دعوت کے گھر میں تو خود بخود کچھ مہمان کو دعوت کے آثار معلوم ہو جاتے ہیں۔ فرش، روشنی، میز کرسی اور دوسری تمام چیزیں جو گھر میں نظر آتی ہیں یہ کہتی ہیں کہ ''اے مہمان آج تیری دعوت ہے'' مگر یہاں تو فضا ہی سرد تھی اور کچھ رنگ و بو کا پتہ نہ تھا۔ جب میں نے شبہ ظاہر کیا تو چودھری صاحب بھی گھبرائے اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دعوت کے سلسلے میں جو قاضی صاحب سے باتیں ہوئی تھیں ان میں لفظ ''رات'' اور ''کھانا'' تو یاد پڑتا تھا مگر ''آج'' یا کل کا خیال نہیں۔ بہت یاد کیا مگر بیکار، نہ تو ''آج'' کی عربی معلوم تھی اور نہ ''کل'' کی۔ اگر قاضی صاحب نے ان الفاظ کا استعمال بھی کیا ہوگا تب بھی یاد نہ رہا۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے الشذری نے اس حبشی کو پکارا ''ایھا الشیخ ھذا اللیل مجمع الطعام۔'' یعنی دعوت با طعام کا مجمع آج ہی رات کو ہے۔ اس حبشی نے ہم دونوں کو سر سے پیر تک دیکھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ غور کر رہا تھا کہ ہمارا ظاہر ہماری اصلیت سے مختلف ہے بدقسمتی سے وہ غور سے یہی دیکھ رہا تھا۔ مگر ہم دونوں کیسے اس تہ کو پہنچے۔ خوب اچھی طرح ہم دونوں کو بار بار تعجب سے دیکھ کر کچھ جواب دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ چینی زبان بولا یا لاطینی، خاک سمجھ میں نہ آیا تو بھائی شذری بولے ''انا الھندی ولا لسان العربیہ انت قل عجلت۔'' بقول کسے خرابی ہو اس عربی جاننے والے کی جس کے سامنے بھائی شذری اس طرح عربی کی ٹانگ توڑیں۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ ہم ہندی ہیں، لسان عربی نہیں جانتے۔ تم عجلت سے بولتے ہو۔ وہ شاید سمجھ گیا۔ اور اس نے بہت رسانیت سے پوچھا۔ مگر وہ بھی سمجھنا ناممکن تھا۔ لیکن کچھ ایسا شبہ ہوا کہ شبہ ہوا کہ کھانے کو پوچھتا ہے۔ میں نے چودھری صاحب سے کہا کہ ''بھائی خوب اطمینان کر لو، محض اندازے سے کام نہ لو۔'' مگر وہ نہ مانے اور کہنے لگے سر ہلا ہلا کر ''ہاں ہاں نعم نعم نعم۔''

اُس نے معاملہ سمجھ کر سر ہلا دیا اور اشارہ کیا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کمرے میں لا کر بٹھایا۔ اس کمرے میں معمولی فرش تھا

اور بہت اجڑا سا کمرہ تھا۔ میں نے چودھری صاحب سے پوچھا کہ "آخر ہم یہاں کیوں بیٹھیں گے۔" مجھے برا معلوم دیا کہ چودھری صاحب خوامخواہ اپنی عربی دانی کے سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ میں نے بگڑ کر کہا کہ "تم غلط کہتے ہو، اس نے ہرگز یہ نہیں کہا۔ تم خاک نہیں سمجھتے۔ خواہ مخواہ مجھ پر رعب جماتے ہو۔"

اس پر چودھری صاحب بھی بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ "جب عربی نہیں جانتے تو خواہ مخواہ مجھ سے کیوں الجھتے ہو؟"

جھائیں جھائیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سینی میں کھانا آ گیا۔ میں نے نرمی سے اب چودھری صاحب سے کہا کہ "بھئی آخر پوچھو تو کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ میزبان خود ندارد۔" کہنے لگے کہ "میں دریافت کرتا ہوں۔" آپ حبشی سے پوچھنے لگے "لا قاضی صاحب؟" یعنی قاضی صاحب نہیں ہیں؟ "فی نزول بیتکم والشرکتہ لناطعام۔" یعنی یہ کہ اپنے گھر پر کب آئیں گے اور کیا ہمارے ساتھ طعام میں شرکت نہ کریں گے؟

دراصل الشذری کی عربی بہ نسبت عربوں کے میں زیادہ سمجھتا تھا۔ واللہ اعلم وہ حبشی کیا سمجھا کچھ نہ کچھ تو ضرور سمجھا جو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "نہیں آئیں گے۔" اور کچھ تیزی سے بول کر ہاتھ کے اشارے سے ہم سے جلدی کھانے کو کہا۔

میں نے الشذری سے کہا "ہمیں ہرگز اس طرح نہ کھانا چاہئے کیونکہ یہ کوئی ڈھنگ نہیں کہ میزبان ندارد، ہم کھانے بیٹھ جائیں۔"

اس پر شذری بگڑ کھڑے ہوئے کہ "تم عربی سادگی سے واقف نہیں۔ یہ بھی کوئی ہندوستان ہے کہ لازمی طور پر میزبان نوالہ گننے کے لیے ضرور ہی موجود ہو۔"

میں نے پھر الشذری سے کہا کہ ایک مرتبہ حبشی سے پھر جو شذری نے سوال کیا تو وہ بگڑ کھڑا ہوا۔ اور بدتمیزی سے ہاتھ کو جھٹکے دے کر نہ معلوم کیا بکنے لگا۔ اور پھر غصے ہو کر اشارہ سے کہا کہ کھانا کھاؤ۔ اب الشذری مجھ سے خفا ہونے لگا "جو میں کہتا ہوں وہ تم نہیں سنتے اس طرح بھی دعوتیں ہوتی ہیں۔" پھر حجاز کی اسی قسم کی ایک آدھ دعوت کا تذکرہ کیا۔ جو خود انہوں نے کی تھی اور جب میں نے کہا کہ کوئی لفنگا آ کر تمہارے یہاں کھا گیا ہو تو میرے اوپر بے حد گرم ہوئے اور کھانے کو "بسم اللہ" کہہ کر آگے ہاتھ بڑھایا۔ خوان پوش جو ہٹا تو میری روح پرواز کر گئی۔ کیونکہ وہاں سوائے آب گوش اور روٹی کے اور کچھ بھی نہ تھا اور یہاں میں گویا بھوک پر دھار رکھ کر آیا تھا یہ آب گوش عجیب کھانا ہے خدا ہر ہندوستانی کو اس سے امن میں رکھے، بازاروں میں آپ دیکھ لیجئے کہ بڑی سی دیگ میں گوشت کے ٹکڑے گھلائے جا رہے ہیں۔ کچھ واجبی سا نمک اور روایتاً کہا جاتا ہے کہ از قسم لونگ وغیرہ بھی پڑتا ہے۔ بس اسی جوشاندے کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے۔ بوٹی ہڈی سے کوئی سروکار نہیں۔ جب دیگ کا پانی کم ہو جاتا ہے تو ڈال دیا جاتا ہے۔ مگر شاید ایک دفعہ کے علاوہ پھر نمک تو پڑتا نہیں۔ کیونکہ آب گوش کا پھیکا ہونا لازمی ہے۔ غرض یہ آب گوش تھا۔ جس کا لبالب بھرا ہوا بڑا سا پیالہ بازار سے دو پیسے کو آ سکتا تھا۔ میں نے ناامید ہو کر الشذری سے کہا "بھئی مجھ سے یہ نہیں چلے گا۔ کیا معلوم تھا ورنہ گھر سے کھانا کھا کر آتے۔"

القصہ ہم نے کھانا شروع کیا۔ مجھ سے دو لقموں سے زائد نہ کھایا گیا۔ وہ عربوں کی سادگی پر لیکچر دے رہے تھے۔ اور میں شوربے کی سادگی پر لیکچر دے رہا تھا۔ جو آب رواں سے بھی زیادہ پتلا تھا۔ میری دانست میں اس سے وضو قطعاً جائز ہوگا۔ غرض میں کھانے کے بجائے کھانے سے کھیلنے لگا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں گھر جا کر کھاؤں گا۔ مگر الشذری گویا ہٹ پہ ہٹ لگا رہے تھے آؤٹ ہونے سے پہلے ہی دو طویل القامت عرب وارد ہوئے۔ فوراً ہی بھائی الشذری نے ہاتھ کے اشارے سے ھذا طعام کہہ کر ان کو مدعو کیا۔ اپنے ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ ایسے موقع پر بھوکے بھی ہوں تو کہہ دیتے ہیں کہ "بسم اللہ کیجئے، خدا زائد دے۔" مگر عراق میں بھوک نہ بھی لگ رہی ہو تب بھی آپ کا آدھا کھانا آپ کے کہنے سے پہلے ہی کھا جائیں گے۔ فوراً یہ دونوں کھانے لگے اور وہ بھی شاید شارٹ ہینڈ میں۔ کیونکہ بس چار لقموں ہی میں میدان صاف کر دیا۔ اتنے میں حبشی ملازم آیا۔ اور

اس نے انہوں نے بلا تکلف کھانے کو کہا بڑی تیزی سے ان دونوں نے باتیں کیں۔ اور پھر ہم دونوں کی طرف گھور کر اس طرح دیکھا کہ بس کھا ہی تو جائیں گے، ادھر دوسری طرف اس نالائق حبشی نے آنکھیں گھمانا شروع کیں۔ میں کچھ گھبرایا اور الشذری بھی چکرائے کہ اتنے میں ایک غریب نے برہم ہو کر الشذری سے کہا ''ہندی مکار اولاد الکلب۔''

الشذری تیزی سے خفا ہو کر بولے ''انا اھل السلام۔''

اس پر وہ پھٹ پڑا، اور دوسری طرف سے حبشی نے اپنے دانتوں کو چمکا کر گویا مغلظات سنانا شروع کیں۔ بڑی تیزی سے دونوں عرب اور حبشی ہم دونوں کو مغلظات سنا رہے تھے لیکن بھائی شذری بھی کسی سے کم نہ تھے اور وہ اپنی بے تکی اڑا رہے تھے ''انا حبیب القاضی صاحب انا مدعونی طعام ھذ اللیل انت بداخلاق، انت توھین وتشھیر انا قلت الفساد بالقاضی صاحب۔''

یعنی ہم قاضی صاحب کے دوست ہیں ہمیں آج رات دعوت میں مدعو کیا گیا۔ تم بداخلاق ہو، ہماری توہین وتشہیر کرتے ہو۔ اس فساد کا تذکرہ ہم قاضی صاحب سے کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال تھا کہ اگر کہیں جلدی سے کھانا نہ آتا تو نوبت غل غپ تک پہنچتی اور عجب نہیں جو ہم اور شذری دونوں وہیں جام شہادت نوش کرتے۔ عربوں کی بھی طبیعت عجیب ہے۔ آدمی سے لڑائی ان کی نہیں ہوتی بلکہ بات کی۔ ادھر کھانا آیا اور ادھر خلق مجسم بن گئے۔ ہم دونوں کو ان دونوں نے جبراً راضی کر کے کھانا شروع کیا۔ میں نے تو ایک لقمہ لے کر ہاتھ کھینچا مگر بھائی شذری نے اور کھایا۔

اِتنے میں قاضی صاحب آ گئے مع تین چار احباب کے۔ ان دونوں عربوں نے دور کر ان سے سلام علیک کی اور فوراً رخصت، قاضی صاحب کے ساتھ ہمارے وہ فارسی داں عراقی کرم فرما تھے جنہوں نے ہمارا قاضی صاحب سے تعارف کرایا تھا۔ جب سب آ کر دوسرے کمرے میں بیٹھے تو بھائی الشذری نے کھانے کے وقت جو بدتمیزیاں ہوئیں ان کی سخت شکایت کی اور بالخصوص حبشی کی۔ وہ سخت متعجب ہوئے کہ ''ہائیں تم کھانا کیسے کھا چکے؟ کھانا تو اب آئے گا۔'' اب میں الشذری کی طرف دیکھتا ہوں، اور وہ میری طرف۔

قاضی صاحب حبشی پر آگ بگولا ہو کر گویا برس پڑے۔ اگر کسی نے غضبناک عرب کو دیکھا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس نے غضبناک شیر دیکھا ہے اور پھر جب کہ عرب کے مہمان کی توہین کی گئی ہو مگر حبشی نے جو جواب قاضی صاحب کو دیا اس سے وہ صرف خاموش ہی نہیں ہو گئے بلکہ ان کا غصہ رفو چکر ہو گیا اور شرمندہ ہو کر وہ معافی مانگنے لگے۔

قصہ مختصر ان فارسی دان حضرت نے بہت جلد معاملہ صاف کر دیا۔ واقعہ دراصل یوں تھا کہ باہر دوپہر کو قاضی صاحب کو دو سائل ملے ان سے قاضی صاحب نے کھانے کو کہا تھا کہ اول وقت آ کر کھانا کھا جانا۔ ادھر اس حبشی سے کہہ دیا تھا کہ ''شام کو دو سائل آئیں گے، ان کو کھانا کھلا دینا۔'' قبل اس کے کہ وہ سائل پہنچیں، ہم دونوں جا پہنچے اور پھر بھائی الشذری کی عربی دانی! حبشی نے الشذری سے جب پوچھا کہ ''کیا تم وہی دونوں ہو جو بازار میں قاضی صاحب سے ملے تھے اور کھانے کو کہا تھا؟'' اس کا جواب الشذری نے محض اس وجہ سے اثبات میں دیا تھا کہ حبشی کی گفتگو میں اگر وہ کوئی لفظ سمجھے تھے تو وہ ''طعام'' کا تھا۔

جب دونوں سائل آئے اور انہوں نے حبشی سے کھانے کو کہا تو ایک طرف تو حبشی خفا کہ ہم دونوں نے اس کو دھوکا دیا اور دوسری طرف یہ سائل خفا کہ ہم دونوں کو کھانا یہ دونوں دھوکا دے کر کھا گئے۔

خمیازہ اس غلط فہمی کا زیادہ تر خود بھائی شذری نے بھگتا جو خوب پیٹ بھر کر کھا چکے تھے، کیونکہ جب دسترخوان لگا اور اس پر بائیس قسم کے انواع واقسام کے کھانے مثلاً انجیر کی کھیر اور سرید وغیرہ چنے گئے تو میں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور بھائی شذری کو دیکھ رہا تھا کہ ان کی حالت قابل رحم تھی۔

چودھری صاحب اس حادثۂ دعوت کے بعد کچھ دن تو قائل رہے۔ جگہ جگہ میں ان پر فقرے چست کرتا۔ مگر بہت جلد بھول گئے اور پھر وہی عادت کہ سمجھیں نہ سمجھیں مگر عربی بولنے سے باز نہ

آتے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ تین عرب دوست ہمارے یہاں آئے ان کو الشذری نے محض عربی بولنے کی نیت سے لگا لیا تھا۔ میں ان سے بہت تنگ تھا کیونکہ یہ تینوں بالکل اجڈ تھے اور جو کچھ بھی پاتے ڈھونڈ کر کھا جاتے۔

میتھی کا ساگ اور قیمہ جو ہندوستان کا تحفہ کہئے بہترین پکا ہوا ایک روز کل کا کل کھا گئے اور پھر قدر اس کی یہ کہ اس کو گھاس اور گوشت کہتے۔ غرض میں ان کی بدعتوں سے تنگ تھا۔

یہ تینوں آئے اور الشذری سے دماغ پچی کرنے لگے۔ بھائی شذری کے سر میں سخت درد تھا اور وہ رومال باندھے ہوئے تھے، ان نالائقوں نے الشذری سے کچھ کہا۔ جو کسی طرح ہم دونوں سمجھ گئے وہ کہتے تھے کہ" قریب ہی پڑوس میں ایک حکیم رہتا ہے، وہاں چلو، ابھی فوراً درد سر جاتا رہے گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، شذری راضی ہو گئے۔ ہم دونوں مع ان تینوں کے وہاں پہنچے۔ یہ حکیم بھی عجیب احمق صورت اور وضع کا تھا۔ عطائی معلوم ہوتا ہے۔ ایک بڑے سے تخت پر بیٹھا تھا۔ الشذری نے نبض دکھائی اور جس طرح بھی ہو سکا اپنا حال بیان کیا اس نے جو کچھ کہا، نہ میں سمجھا اور نہ الشذری۔ مگر بھائی الشذری نے مجھ سے کہا کہ" بھائی تم نہیں سمجھے، یہ دراصل یہ کہہ رہا ہے کہ دوا ذرا تلخ ہوگی۔ اگر تم منظور کرو تو میں علاج کروں ورنہ نہ کروں۔ علاج کی تکلیف سر درد کی تکلیف سے بہتر ہے اور پھر ان تینوں عربوں نے کہا کہ دوا پلانے میں یا علاج کرانے میں ہم تم کو پکڑ لیں گے۔"

میں اس وقت تو بھائی الشذری کی عربی دانی کا قائل ہو گیا۔ کیونکہ جب دوبارہ دونوں نے کہا تو مجھ کمبخت کی بھی یہی سمجھ میں آیا کہ الشذری ٹھیک سمجھے ہیں۔ اب بھائی شذری کا ماتھا دیکھنے کے لئے ان کو تخت پر لٹا دیا گیا۔ وہ تخت پر چت لیٹ گئے اور میں برابر کھڑا تھا۔

میں نے الشذری سے کہا کہ" یہ کیا معاملہ ہے، تم کو لٹایا کیوں ہے دوا تو بیٹھ کر پی جاتی ہے۔ ذرا پوچھ لو، کہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

اس پر الشذری تیز ہو کر بولے کہ" تم سمجھتے ہو نہیں۔ خدا معلوم ہر بات میں دخل کیوں دیتے ہو؟ وہ پہلے پیشانی دیکھے گا یا کچھ اور دیکھے گا۔"

میں چپ ہو رہا۔ اتنے میں گردن زدنی حکیم نے ایک میلا سا چمڑے کا بیگ نکالا۔ اس میں سے ایک بورے سینے کا سالوہے کا سوا نکالا۔ اس کو سنبھال کر اس نے اس طرح چودھری صاحب کا سر پکڑ کر آنکھوں کے سامنے نچایا کہ جیسے ان کی آنکھ پھوڑنا چاہتا ہے۔ میں کم مگر شذری زیادہ گھبرائے۔ وہ تیزی سے آنکھ بچا کر اٹھے کہ کہیں نوک آنکھ میں نہ لگ جائے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ اٹھ سکیں وہ تینوں کھرپے جو حکیم کے اشارے کے شاید پیشتر ہی سے منتظر تھے۔ ایک دم سے حکیم کا اشارہ پاتے ہی بھائی شذری پر ٹوٹ پڑے۔ میں گھبرایا اور سمجھا کہ ضرور کوئی سازش ہے اور اُدھر الشذری نے ایک کوہ شگاف نعرہ مار کر چھڑانے کی کوشش کی۔ چشم زدن میں گتھم گتھا ہونے لگے اور تخت گویا اکھاڑہ بن گیا۔ عربی لبادہ اڑا اڑ کر اس بلوے میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کمبل کے نیچے بھیڑیں۔

"ارے مجھے بچاؤ ـــ خدا کے واسطے ـــ کمبخت بدذات ـــ دوڑو ـــ قتل ـــ قتل ـــ" بھائی شذری نے بدحواس ہو کر یہ الفاظ کہے کہ میں بوکھلا گیا۔ اپنے عزیز دوست کو ان ناہنجاروں سے بچانا میرا فرض تھا۔ اس دھما چوکڑی میں میں بھی شریک ہو گیا۔ میں بھی دوڑ پڑا، اور پہلے ہی حملے میں میں نے حکیم کو اڑنگا لگا کر چت کیا مگر چونکہ یہاں تو جان کا معاملہ تھا۔ لہٰذا میں فوراً اُٹھ کر پھر حملہ آور ہوا۔ بھائی شذری بڑے طاقتور تھے اور کسی طرح چار طاقتور عربی سے قابو میں نہ آتے تھے۔ بھائی شذری پکار رہے تھے "انا القتل ـــ ابے یا جی ـــ نالائقون

> "آنکھیں بڑی نعامت ہیں بابا!"
> سماعت کی توفیق نہ ہوتی تو اندھے گداگر کا یہ جملہ بھی کیسے سُن پاتے؟ ثابت ہوا کان بھی بڑی "نعامت" ہیں بابا!
> "بات سے بات" از انور مسعودؔ

۔۔۔میری کہنی ٹوٹی۔۔۔اُلو۔۔۔گدھو۔۔۔ابنِ خنزیر۔۔۔ابنِ کلب۔۔۔پاجی۔۔۔پاجیوں۔۔۔پواجج ارے چھوڑو۔۔۔"

خوب کشتم کشتا ہورہی تھی۔ اُدھر میں بھی گتھا ہوا تھا۔ ایک عرب کی کمر پکڑ کر اس کو گرانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ کشتی کے پیچ کئی جانتا ہوں مگر وہاں تو عربی کپڑوں میں پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ بازو کدھر ہے اور ٹانگ کہاں اور پھر آدمی بھی مسٹنڈے تھے۔ اسی کوشش میں ہاتھا پائی کرنے میں اس عرب کی کہنی میری آنکھ میں اس زور سے لگی کہ میں چکرا کر گرا۔ اب بھلا میں کیا لڑتا۔ چشم زدن میں ان ظالموں نے الشذری کو چت کردیا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور پھر ستم یہ کیا کہ اس کشتم کشتا میں ان موذیوں نے بھائی شذری کو نہ معلوم کس نوکدار چیز پر چت لٹایا تھا کہ وہ بری طرح ان کی پشت میں گڑ رہی تھی اور وہ سخت بے چین تھے "اے ایھا الشیوخ ھذا شئی بزرگ تحت پشت۔" یعنی میری پیٹھ کے نیچے کوئی بڑی سی چیز ہے۔ "اشد من الموت۔۔۔ارے ذرا چھوڑو۔۔۔کروٹ ہی لینے دو۔۔۔قسم خدا کی میں مرا۔۔۔مرا۔۔۔ابے خنزیروں۔۔۔حماروں۔۔۔ظالموں" وغیرہ وغیرہ۔

میں آنکھ بند کئے ہوئے مشکل سے چکراتا ہوا اٹھا۔ دوسری آنکھ سے میں دیکھنے لگا کہ کیا ہورہا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ موذی توشذری کی جان پر تلے ہوئے ہیں۔ بری طرح گرفت میں تھے اور ایک عجیب کاروائی ہورہی تھی۔ وہ یہ کہ ان کی پیشانی اسی سوئے سے بری طرح مرغ مسلم کی طرح گودی جارہی تھی۔ اب وہ اس ڈر کے مارے جنبش بھی نہ کرتے تھے کہ کہیں ہاتھ چوک جائے تو آنکھ نہ پٹ ہوجائے۔

میں نے دل میں کہا یہی غنیمت ہے اور اب میں سمجھ گیا کہ یہ علاج ہورہا ہے۔ بہت جلد ان کی پیشانی لہولہان ہوگئی۔ بڑی تیزی سے خون پونچھ کر ایک کپڑا بھگوا کر باندھا گیا اور الشذری چھوڑ دیئے گئے۔

"ارے کم بختو! تم نے مجھے کس چیز پر چت لٹایا کہ میری پیٹھ میں سوراخ کردیا۔" یہ کہہ کر کراہتے ہوئے الشذری اٹھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لرکی قسم کا ایک چھوٹا سا تالا جس میں اس کی کنجی مع دوسری چابیوں کے گچھے پر شذری کو چت لٹا کر تین عرب ان کی چھاتی پر کودوں دل رہے تھے۔ غصے میں آکر بھائی شذری نے اس نامعقول تالے کو مع کنجیوں کے بھنا کر دور پھینکا اور پھر اردو عربی اور فارسی کو ملا کر نہ معلوم ان تینوں عربوں اور حکیم کو کیا کچھ سنا ڈالا۔ ادھر حکیم کھڑا مسکرا رہا تھا اور اپنی کارروائی پر خوش ہوکر نمک پاشی کررہا تھا۔

بہت جلد معاملہ صاف ہوگیا۔ نہ بیچارے حکیم کی خطا تھی اور نہ ان تینوں عربوں کی۔ اگر خطا اور غلطی تھی تو خود بھائی شذری کی۔ مترجم کی خدمات انجام دینے کے لئے ایک ہندوستانی آگئے اور معلوم ہوا کہ حکیم بیچارے نے سب کچھ بھائی شذری کو سمجھا دیا تھا کہ کس طرح سوئے سے پیشانی گودی جائے گی اور سخت تکلیف ہوگی۔ درد قطعی جاتا رہے گا۔ پھر یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ چاروں دوست تم کو پکڑ لیں گے بلکہ حکیم کو شکایت تھی کہ میں نے بجائے علاج میں مدد دینے کے بڑی گڑبڑ کی۔ کیونکہ میں نے اڑنگا لگا حکیم کو چت گرادیا تھا۔ ان تمام باتوں کو خوب اچھی طرح حکیم نے سمجھا دیا تھا اور شذری نے رضامندی ظاہر کی تھی۔ پھر اب شکایت کیسی؟

میری آنکھ میں درد ہورہا تھا ورنہ میں بری طرح الشذری کی وہیں خبر لیتا۔ حکیم کی فیس ادا کرنی پڑی۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس چپقلش کے بعد بھلا دردسر کا کیا کام، پتہ تک نہ رہا۔ ہاں تخت پر کشتی کرنے کی وجہ سے گھٹنوں میں البتہ سخت چوٹیں آئی تھیں جو پہلے ہی سے ناؤ میں گر کر مضروب تھے مگر یہ چوٹیں ایک طرف اور اس نامراد چھوٹے سے تالے نے جو پیٹھ میں برما چلایا تھا، اس کی تکلیف ایک طرف بس زخم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ اس چھوٹے سے تالے کی کنجی گوشت میں پیوست ہوکر رہ گئی تھی اور کہیں اس آپریشن میں تھوڑی دیر اور لگتی ہے تو عجب نہیں کہ گوشت کاٹ کر وہ اندر گھس جاتی۔

وہ دن اور آج کا دن شذری کا عربی بولنے کا شوق ایسا رخصت ہوا کہ پھر کبھی عربی نہیں بولے۔ جتنے دن عراق میں رہے دبے رہے اور اگر کہیں موقع ہوتا تو یہی کہتے کہ بھئی کچھ سمجھے نہیں، بغیر مترجم کے کام نہ چلے گا۔

قندِ شیریں

مچھلی سے مگرمچھ تک

محمد ایوب صابر

مچھلی وہ آبی مخلوق ہے جسے ممالیہ یا غیر ممالیہ دونوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح آج کل ایک انسان دوسرے کو مار کے زندہ رہتا ہے اسی طرح سمندر میں ہر بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا کر زندہ رہتی ہے۔ مچھلی اور مگرمچھ کہنے کو تو ایک ہی پانی میں رہتے ہیں لیکن اِن کے درمیان آج تک حکومت اور حزبِ اختلاف کی طرح دوستی کا رشتہ استوار نہیں ہو سکا۔ مگرمچھوں کی تعداد پانی کے اندر مچھلیوں کے مقابلے میں ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کے باوجود مگرمچھ پانیوں پر اپنی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں ایک فیصد طبقے نے بھی مگرمچھوں اور مچھلیوں کے رہن سہن کا بغور جائزہ لے کر ۹۹ فیصد عوام پر حکم چلانا سیکھا ہے۔

ایک ''فارغ البال'' دانشور کا دعویٰ ہے کہ مگرمچھ دراصل مچھلی کی ہی ایک قسم ہے۔ مگرمچھ کے پاؤں ہوتے ہیں جبکہ مچھلی پیروں سے محروم ہوتی ہے۔ اپنے اس نظریے کے دفاع میں موصوف نے لکھا ہے کہ چونکہ مگرمچھ کا تعلق سمندر کے اشرافیہ قبیلے سے ہے اور اشرافیہ کو بوقتِ ضرورت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے اِس لئے مگرمچھ کے لئے پاؤں اشد ضروری ہیں ورنہ بھاگتے وقت سر پر کیا رکھے گا؟ اس کے برعکس مچھلیوں نے تو اِسی سمندر میں جینا، مرنا اور شکار ہونا ہے اِس لئے انہیں پاؤں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

وہ رعایا ہیں اور رعایا کسی بھی ملک کی مستقل رہائشی ہوتی ہے۔ محاورہ ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کر دیتی ہے اسی طرح ایک منصوبہ ساری حکومت کو شرمندہ کر دیتا ہے۔ ملک کے اندر بیروزگاری، لاقانونیت، اقرباء پروری کا سیلاب آیا ہوا ہے اس کے باوجود مگرمچھ چین کی بانسری بجا رہے ہیں بلکہ مچھلیوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے بیان داغ دیا جاتا ہے کہ ملک سے غربت اور بیروزگاری کم ہو رہی ہے۔ اسمبلی ہال مچھلی مارکیٹ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک جانب نعرے بازی ہو رہی ہوتی ہے اور دوسری جانب قانون سازی کا کھیل جاری ہوتا ہے۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد اسمبلی ممبران فرماتے ہیں کہ اسمبلی میں کیا ہوا اس کا صحیح علم تو نہیں ہو سکا لیکن کچھ قانون سازی قسم کی چیز ہوگئی ہے جو قانون چٹکی بجا کر اسمبلی سے پاس کر دیا جاتا ہے اسے حکومت کی تبدیلی کے بعد ''بائی پاس'' کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ہمارے صاحبان پانی میں رہنے کے آداب کب سیکھیں گے اگر کوئی سنجیدہ دانشور حکومت کو مخلص مشورہ دیتا ہے تو اُسے جواب ملتا ہے کہ مچھلی کے جائے کو تیرنا مت سکھاؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ عوام کے منہ میں سبسڈی نام کا کانٹا کیسے دیا جاتا ہے تاکہ شکار کرنے میں آسانی رہے۔ آسٹریلیا کے بین الاقوامی شہرت کے حامل مگرمچھ شکاری اسٹیو ارون نے ساری زندگی مگرمچھوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے گزار دی لیکن اس کی موت ایک مچھلی کا کانٹا دل میں لگنے سے ہوئی تھی۔ اس کی موت ہمارے لئے ایک سبق بھی کہ تنگ آمد بجنگ آمد کی طرح کبھی کبھی مچھلی بھی مگرمچھ سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ مچھلیاں آخر کب تک ماہیء بے آب کی طرح تڑپتی

رہیں گی۔ انہوں نے احتساب کا علم بلند کردیا ہے تو مگرمچھوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ حالات سے تنگ آکر ڈولفن جیسی شریف النفس مچھلی بھی خطرناک شارک بن جاتی ہے۔

پچھلے دنوں لندن کی ایک سڑک پر مگرمچھ کو ٹہل قدمی کرتے دیکھ کر لوگ سراسیمہ ہوگئے۔ انہوں نے مگرمچھ سے پوچھا کہ تم اس طرح سرِ عام کیوں گھوم رہے ہو؟ تو اُس نے اطمینان سے کہا کہ میں کھلی فضاؤں کا لطف اٹھانے کے لئے شاہراہِ بے دستور پر نکلا ہوں جب اُسے اپنے تالاب کا پتہ پوچھا گیا تو اُس نے یوں جبڑے سی لئے جیسے رشوت لیتے ہوئے پکڑے گیا ہو۔ دراصل لندن میں کچھ لوگوں نے اپنے گھروں میں چھوٹے تالاب بنا کر مگرمچھ پال رکھے ہیں۔ اِسی لئے اکثر لوگ خاص مواقع پر لندن کا رخ کرتے ہیں تاکہ وہاں کے محفوظ تالابوں سے محظوظ ہوسکیں۔ حکومت برطانیہ نے اِن مگرمچھوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔

دنیا میں نئے نئے واقعات رونما ہورہے ہیں۔ پچھلے دنوں برطانیہ کے ڈیونیومین نامی شکاری نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے گرم غبارے کا سہارا لیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس طرح میں دوسرے شکاریوں سے زیادہ دور تک جھیل میں جاسکتا ہوں۔ اِس کے علاوہ گرم غبارے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر مچھلی بھون کر کھانے کو دل چاہے تو وہیں بیٹھے بیٹھے گرم غبارے میں بھون کر کھانے کا اہتمام بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں کی مچھلیوں کو بھی اپنے خلاف اِس نئی سازش کا علم ہوگیا۔ انہوں نے ڈیونیومین کے کانٹے کو منہ لگانے سے انکار کردیا۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لندن کی مچھلیاں بھی چالاک ہوتی ہیں۔ ہماری بھولی بھالی مچھلیاں آج تک شکاریوں کی سازشیں نہیں سمجھ سکیں۔ ہمارے ملک کی مچھلیوں کو جال میں پھانسنے کے تمام فیصلے باہر ہی ہوتے ہیں۔

چین کے مشرقی صوبے یانکسی کے شہر ژین یو میں واقع ژیانو جھیل میں مچھلیاں خود شکار ہونے کے لئے بے چین ہیں۔ شکاری اِس نئی صورتحال سے پریشان ہیں کہ خود سپردگی کی انتہا تک پہنچی ہوئی اِن مچھلیوں کی اتنی بڑی تعداد کو کیسے سنبھالا جائے۔ مچھلیاں خود کو پکڑوانے کے لئے پانی کے اوپر چھلانگیں لگاتی نظر آتی ہیں۔ وہاں کی مچھلیوں نے شکاریوں کو انتباہ کیا ہے کہ اگر ہمیں جلدی شکار نہ کیا گیا تو ہم جھیل سے براہِ راست فرائنگ پین میں چھلانگ لگا دیں گی پھر تم شکار کرنے کے مزے سے محروم رہ جاؤ گے۔ اِسے کہتے ہیں جھیل سے کودا، فرائنگ پین میں اٹکا۔ اس نئی صورتحال نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ میں شکاری سے خوامخواہ لٹھم لٹھا ہورہا تھا۔ شکاری تو بالکل معصوم نکلا۔ ساری غلطی مچھلیوں کی ہے جو خود شکار ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ جب مچھلیوں نے کے اندر ایسا شوق شکار پیدا ہوگیا ہے تو پھر کون کہے گا کہ ایک مچھلی سارے

جل کو گندہ کر دیتی ہے۔ میں نے خوامخواہ سے اِس بارے میں دریافت کیا تو اُس نے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے کہا کہ اُس جھیل میں مگرمچھوں نے بسیرا کر لیا ہو گا لہٰذا مچھلیوں کا موقف ہے کہ اِن مگرمچھوں کا شکار ہونے سے بہتر ہے کہ ہم اچھلتے کودتے ہوئے فرانگ پین تک پہنچ جائیں۔

ایک خبر کے مطابق پچھلے دنوں سسلی کے پولیس اسٹیشن کے باہر ایک چھوٹی سی سنہری مچھلی تڑپ رہی تھی۔ ایک پولیس اہلکار کولن ٹیلر جب وہاں سے گزرا تو اس کی نظر اچانک سنہری مچھلی پر پڑی۔ اس نے پولیس اسٹیشن کے واش بیسن میں پانی بھر کر مچھلی کو اُس کے اندر آزاد چھوڑ دیا۔ سارجنٹ کا کہنا تھا کہ ہمیں اپنے تھانے کے باہر اکثر چیزیں ملتی ہیں لیکن پہلی مرتبہ ایک ایسی چیز ملی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مچھلی پولیس کے چھوٹے سے تالاب سے نکل کر اپنے بڑے سے تالاب میں جانے کے لئے بے چین ہے۔

ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ پولیس بڑی مچھلیوں پر ہاتھ نہیں ڈالتی صرف چھوٹی مچھلیوں کا ہی شکار کرنا پسند کرتی ہے۔ جہاں اُن کو چھوٹی سنہری مچھلی ہاتھ لگی فوراً پکڑ لی اور پکڑتے ہی اپنے تالاب میں قید کر ڈالی۔ اِس مچھلی کو بھی سونے کا انڈہ دینے والی مچھلی سمجھ کر پکڑا گیا ہے۔ اب کوئی مگرمچھ جب تک اس چھوٹی مچھلی کی ضمانت نہیں دے گا اِس بے چاری کو پولیس اسٹیشن کے واش بیسن میں قید رہنا پڑے گا۔

مغربی ہند کی ۵۸ سالہ دیوا لینن ونکر اپنی ۱۹ سالہ بیٹی کے ساتھ وشامری ندی میں کپڑے دھونے گئی تھی جہاں مگرمچھ نے لڑکی پر اچانک حملہ کر دیا۔ یہ صورتحال ونکر کے لئے انتہائی پریشان کُن تھی مگر اُس نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں اور مگرمچھ پر کپڑے دھونے والے ڈنڈے سے حملہ کر دیا۔ خاتون کا حملہ اس قدر تابڑتوڑ تھا کہ مگرمچھ بچے آنسو رونے لگا۔ خاتون کے حملے سے پہلے ہی مگرمچھ اُس کی بیٹی کو جبڑے میں دبا چکا تھا۔ بیٹی کی محبت نے اُسے اتنی طاقت دے دی کہ ۱۳ فٹ لمبے مگرمچھ سے بھی نہیں گھبرائی اور ۱۰ منٹ تک اُس سے لڑنے اور مارنے کے بعد بیٹی کو بچا لیا۔ اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمت اور حاضر دماغی ایک ساتھ ہو جائے تو انسان ہر مشکل کام کو آسان بنا سکتا ہے۔

ونکر نے اپنی بیٹی کو بچا کر بہت شہرت حاصل کی ہے۔ اب اربابِ اختیار وہ ڈنڈا خریدنا چاہتے ہیں جس سے اُس نے مگرمچھ کو بھگایا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک اس ڈنڈے کی خریداری کے لئے ڈانڈے ملا رہے ہیں۔ شنید ہے کہ ہمارے ہاں بھی مگرمچھوں کو سبق سکھانے کے لئے وہی ڈنڈا خریدنے کا ڈول ڈال دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے مگرمچھوں کو اِس ڈنڈے کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑیا۔ وہ جانتے ہیں کہ ڈنڈا بھی اُن کے سامنے ڈنڈے کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔ اِس کے علاوہ ہمارے ہاں صاحبانِ حل وعقد سوچنے میں اس قدر دیر لگا دیتے ہیں کہ اُن کے اگر مگر سے پہلے ہی مگرمچھ اپنا کام کر چکا ہوتا ہے۔

اب احساس ہو رہا ہے کہ میں نے یہ مضمون تحریر کرنے کے بعد پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لینے کی کوشش کی ہے۔ کہیں ایسا نہ وہ کہ وہ میرے قلم کی روشنائی ہی خشک کر ڈالے۔ خیر کوئی بات نہیں سچائی سامنے لانے کے لئے کسی کو تو زہر کا پیالا پینا پڑتا ہے۔

حماد احمد، لاہور

بچپن کے مفروضے

بچپن میں بہت سے دلچسپ مفروضات انسان کے دماغ میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ بڑا ہونے اور عقل وشعور میں اضافے کے بعد ان میں سے اکثر مفروضات سو فیصد غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ اِن میں سے کچھ مفروضات تو انسان نے خود ہی اپنی محدود سمجھ اور سوچ کی وجہ سے گھڑے ہوتے ہیں اور کچھ مفروضات بڑے لوگوں سے سن کر دماغ میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ فہم وفراست میں اضافے کے بعد انسان جب بھی اِن عجیب وغریب مفروضات کو سوچتا ہے تو چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر جاتی ہے کہ ماضی میں ہم کیسے مفروضات سوچا کرتے تھے اور اِن مفروضات کے سو فیصد درست ہونے کا یقین بھی ہوا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ قبل اپنے چند دوستوں سے بچپن کے ان مفروضات کے متعلق گفت وشنید کی تو انتہائی دلچسپ مفروضات سامنے آئے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجئے:۔

کمپیوٹر پر کچھ گیمز ایسی ہوتی ہیں جنہیں کھیلنے کے لئے کم سے کم دو یوزرز کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اگر بالفرض دوسرا یوزر موجود نہ ہو تو کمپیوٹر بذات خود دوسرے یوزر کا کردار ادا کر لیتا ہے تا کہ "اکلوتے یوزر" کے لئے گیم کھیلنا ممکن ہو سکے۔۔۔ ایک دوست کے بقول وہ بچپن میں ہمیشہ اس بات پر یقین رکھا کرتے تھے کہ دراصل کمپیوٹر یوزر کے نام پر ایک عدد جیتی جاگتی شخصیت "جاپان" میں بیٹھ کر گیم کھیل رہی ہوتی ہے۔ اس بات پر بھی یقین ہوتا تھا کہ گیم بنانے والی کمپنی اِس "جاپانی یوزر" کو محض اس لئے اچھی خاصی رقم کی ادائیگی کرتی ہے تا کہ وہ پاکستانی بچوں کے خلاف کھیل کر انہیں ہرا سکیں۔

ایک دوست کے بقول وہ بچپن میں پھل کھانے سے محض اس لئے اجتناب کیا کرتے تھے کہ اگر غلطی سے بھی پھل کا بیج پیٹ کے اندر چلا گیا تو جسم کے اندر ایک عدد پھلدار پودا اُگ آئے گا جسے تن آور درخت بننے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

بعض والدین اپنے بچوں کو سمجھایا کرتے ہیں کہ گاجریں کھانے سے انسانی نظر تیز ہو جاتی ہے۔ ایک دوست کے بقول یہ فرمان سننے کے بعد وہ محض اس لئے "جفت تعداد" میں گاجریں کھایا کرتے تھے کہ دونوں آنکھوں کی نظریں برابر مقدار میں ہی تیز ہوں۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ "طاق تعداد" میں گاجریں کھانے سے ایک آنکھ کی نظر دوسری آنکھ کی نسبت کمزور رہ جائے۔

ایک دوست اپنے بچپن میں یہ سوچا کرتے تھے کہ ٹی وی پروگرام کے دوران "بیک گراؤنڈ" میں جو چند خفیہ لوگوں کے ہنسنے

کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں وہ دراصل کمپیوٹر سکرین کی پچھلی طرف بیٹھ کر پروگرام دیکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ موصوف بذاتِ خود ٹی وی کے انتہائی قریب جا کر بیٹھتے۔ جیسے ہی دوسری طرف سے ہنسی کی آواز آتی تو موصوف بھی جواب میں زور وشور سے ہنستے تا کہ سکرین کے پچھلی طرف موجود خفیہ لوگوں تک "جوابی ہنسی" کی آواز باآسانی پہنچ سکے۔

ایک دوست بتا رہے تھے کہ بچپن میں وہ پرانی ویڈیو ریکارڈنگز دیکھ کر ہمیشہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ ہماری دنیا انیس سو پچاس سے قبل بلیک اینڈ وائٹ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ تب کے تمام مناظر میں کہیں بھی کوئی ہریالی یا دیگر رنگ نظر نہیں آتے تھے، بلکہ ہر چیز کالی یا سفید ہی دکھائی دیتی تھی۔

کچھ بچے یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بڑا ہونے کے بعد انسان کو خود بخود ہر چیز کا علم ہو جاتا ہے۔ ایسے عظیم بچے اپنے اس مفروضے کی بدولت علم حاصل کرنے سے اجتناب ہی کرتے ہیں اور یہ سوچ کر بڑا ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ بڑا ہونے کے بعد سب کچھ خود بخود ہی معلوم ہو جائے گا۔

کچھ بچے جب اپنے والدین کے ساتھ بس میں سوار ہوتے ہیں تو یہ نہیں سمجھ پاتے کہ بس ڈرائیور کو ہماری منزل کا علم کیسے ہو گیا جبکہ ہم نے انہیں بتایا ہی نہیں۔۔۔ نتیجتاً یہ بچے اس بات پر یقین کر لیتے ہیں کہ بس ڈرائیور کے پاس "مائینڈ ریڈنگ" کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور وہ تمام سواریوں کا دماغ پڑھ کر یہ جان لیتا ہے کہ کون سی سواری نے کہاں جانا ہے۔۔۔ (ایسے بچوں کو بڑے ہو کر معلوم ہوتا ہے کہ سواری دراصل بس کا روٹ دیکھ کر ہی بس میں سوار ہوتی ہے، منزل پوچھنے یا بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی)۔۔

ایک "ذہین دوست" بچپن میں یہ سوچا کرتے تھے کہ اگر کوئی باس اپنے ملازم کو نوکری سے "فائر" کرتا ہے تو وہ دراصل اس ملازم کی طرف فائر یعنی آگ کی ایک چنگاری پھینکتا ہے۔ ملازم اس چنگاری سے اپنی جان بچا کر بمشکل بھاگتا ہے اور خوف کے مارے اگلے دن ملازمت پر واپس نہیں آتا۔ اسی غیر حاضری کی دوران اسے ملازمت سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

> مشاعروں کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں دستِ جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے راہ سکوں کو ہلا ڈالا کبھی چشمِ دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیاں کے کان بہرے ہو گئے شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بدگمان ہو گئے جب شوق کا دریا امنڈا تو کششِ دل سے جذبِ مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا، بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔
>
> دیباچہ مسدسِ حالی از الطاف حسین حالی

کچھ ناول انتہائی طویل ہوتے ہیں۔ ناول کے آغاز میں جس بچے کا تذکرہ ہو رہا ہوتا ہے وہ ناول کے اختتام تک انتہائی ضعیف ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسا ناول پڑھنے والے بچے "ناول نگار" کے صبر و تحمل کو داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتے کہ اس نے ناول کے آغاز سے لے کر اختتام تک بچے کے ضعیف ہونے کا انتظار کیا اور یوں (بچوں کی سوچ کے مطابق) پچاس، ساٹھ سال کے عرصے کے بعد بمشکل ناول مکمل ہوا۔

کچھ مغربی ممالک میں جگہ جگہ روڈز پر یہ پیغام لکھا ہوتا ہے کہ "پی کر" گاڑی چلانا سخت منع ہے۔ وہاں مقیم ایک دوست بچپن میں ایک مرتبہ اپنے والد سے محض اس وجہ سے اختلاف کر بیٹھے کہ ان کے والد محترم آم کا ملک شیک "پی کر" گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ ایسے میں دوست کو یہ ڈر و خوف محسوس ہوا کہ کہیں والد محترم کو قانون توڑنے کے جرم میں پولیس گرفتار نہ کر لے۔

کچھ بچے یہ سوچا کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ٹیکسی ڈرائیور کی ملازمت مل جائے تو اسے پہلی فرصت میں اپنی گاڑی پر پیلے رنگ کا پینٹ کرنا لازم ہے، بصورت دیگر کسی بھی وقت ملازمت چھن سکتی ہے۔

بہت سے بچے یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہرا ے ٹی ایم مشین کے اندر ایک بوڑھا، تجربہ کار، ایماندار اور فرض شناس بندہ چھپ کر بیٹھا ہوا ہے جو کہ ہرا ے ٹی ایم کارڈ ڈالنے والے شخص کو اس کی ڈیمانڈ کے عین مطابق رقم گن کر ادا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کارڈ بھی واپس کر دیتا ہے۔

ایک دوست کے بقول اس کی تاریخ پیدائش پانچ جنوری اور دوسرے بھائی کی چھ جنوری تھی۔ اسی وجہ سے موصوف بچپن میں اپنے آپ کو دوسرے بھائی کی نسبت ہمیشہ بڑا محسوس کرتے رہے۔ حالانکہ جس بھائی کی تاریخ پیدائش چھ جنوری تھی، وہ عمر میں اس سے دو سال بڑا تھا۔

ایک دوست کے بقول وہ اپنے چاچو کی ایک بات پر یقین کر کے اپنا سارا بچپن ہی برباد کر گئے۔ ان کے چاچو نے یہ سمجھایا تھا کہ جب بھی آئس کریم والے انکل میوزک بجائیں تو وہ دراصل یہ پیغام دینا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ "اب میرے پاس آئس کریم ختم ہو چکی ہے، محض آوازوں پر ہی دل بہلائیں"۔ اُس دوست نے دل و جان سے اس مفروضے کو تسلیم کر لیا، یوں جب تک اس کا بچپن برقرار رہا، آئس کریم والے انکل کی آئس کریم بھی (میوزک بجانے کی وجہ سے) ختم ہی رہی۔

ایک دوست کے بقول اسے بچپن میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ "منی لانڈرنگ" سخت ترین قانونی جرم ہے۔ ایک بار اس کی امی نے کپڑے دھوتے ہوئے اس کی شرٹ میں موجود سو روپے کا نوٹ بھی دھو دیا۔ وہ دوست بیچارہ کافی عرصے تک ڈرتا رہا کہ لانڈری میں پیسے (منی) دھلنے کی وجہ سے کہیں پولیس کا گھر میں چھاپہ نہ پڑ جائے۔

ایک دوست کے بقول وہ بچپن میں بہت عرصہ تک اس بات پر یقین رکھتے رہے کہ "کافی" خواتین کے لئے ہوتی ہے اور "چائے" مرد حضرات کے لئے۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ اس نے اپنی والدہ کو ہمیشہ کافی اور اپنے والد کو ہمیشہ چائے پیتے ہی دیکھا تھا۔

ایک دوست کی سوچ ہوا کرتی تھی کہ اگر دورانِ ڈرائیونگ اشارے پر سرخ بتی کو جلتا دیکھ کر گاڑی نہ روکی جائے تو سرخ بتی میں سے ایک سرخ رنگ کا پینٹ نکلتا ہے اور گاڑی پر گر جاتا ہے۔ یوں گاڑی پر لگے سرخ نشانات دیکھ کر ٹریفک وارڈن با آسانی "مجرم گاڑی" کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ایک دوست جب بھی لینڈ لائن ٹیلی فون کو اٹھاتے تو "ڈائل ٹون" کی آواز سنائی دیتی۔ وہ بیچارہ ہمیشہ یہی سمجھتا کہ کوئی ٹیلی فون آپریٹر مسلسل "اووووووووووووووووووووووووووووں" کی طویل آواز نکالتا چلا جا رہا ہے۔ دوست کے بقول اس نے متعدد مرتبہ یہ چیک کرنے کی کوشش کی کہ ٹیلیفون آپریٹر "اووووووووووووووں" کرنے کے دوران وقفہ کرتے ہوئے یا سانس لیتے ہوئے کیسا سنائی دیتا ہے، مگر "اووووووووووووووں" کے علاوہ کبھی بھی کچھ سنائی نہ دیا۔۔۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن اتفاقیہ طور پر ٹیلیفون میں سے "اووووووووں" کی آواز نہ سنائی دی تو اس کی امی نے اسے سمجھایا کہ آج ٹیلی فون "ڈیڈ" ہو گیا ہے۔ وہ بیچارہ پریشانی کے مارے یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ ٹیلی فون ڈیڈ نہیں ہوا بلکہ "اووووووووں" کی دلکش آواز نکالنے والے ٹیلی فون آپریٹر کا ہی "بیڑہ پار" ہو گیا ہے۔۔

ایک دوست ہمیشہ یہی سوچا کرتے تھے کہ ڈیپارٹمنٹل سٹورز سے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں خریدی جا سکتی جو کہ "سیل" پر نہ لگی ہو، چاہے وہ چیز دکان میں بہت زیادہ مقدار میں ہی کیوں نہ موجود ہو۔

ایک دوست کی سوچ یہ تھی کہ اگر کسی مجرم کو بیس سال قید کی سزا سنا دی جائے اور پندرہ سال بعد ہی اس کا انتقال ہو جائے تو پولیس مزید پانچ سال تک اس کی لاش کو قید میں رکھتی ہے تا کہ قانونی تقاضے پورے کئے جا سکیں۔

انتظار حسین نے اپنی کتاب میں ایک دو جگہ مظفر علی سید کا بھی ذکر کیا ہے۔ کنہیا لال کپور سے انتظار حسین نے کہا "کپور صاحب! سنا ہے کہ آپ کے دوست مظفر علی سید آپ پر کام کر رہے ہیں"
کپور صاحب نے جواب دیا "ہاں سید صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے انہیں لکھ بھیجا ہے کہ یہاں ایک سکھ مجھ پر کام کرنے کے درپے تھا، مگر ایک سکھ کے ہاتھوں جھٹکا ہونے کے مقابلے میں مجھے ایک سیّد کی چھری سے ذبح ہونا منظور ہے۔"

ڈاکٹر عزیز فیصل

پنڈی اسلام آباد کی ادبی تقاریب کے چند شگفتہ پہلو

جڑواں شہروں یعنی پنڈی اسلام آباد کی ادبی مجالس اپنے کنٹینٹ کے لحاظ سے ہمیشہ بھرپور رہتی ہیں۔ جہاں ایسی محافل شعروادب کی ترویج میں اپنا کردار موثر طور پر سرانجام دیتی محسوس ہوتی ہیں، وہاں کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں کہ جو شگفتگی سے مالامال ہوتے ہیں۔ مصنف، عینی شاہد ہونے کی پاداش میں، اِن میں سے چند واقعات بیان کرنے کی جسارت کرتا ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

نوٹ خوف فسادِ خلق کے سبب بعض نام مخفی اور بعض ظاہر کردئے گئے ہیں۔

وقوعہ نمبر ایک ایک شاعر کو دعوت کلام دی گئی۔ موصوف نے احسان نما اطلاع دیتے ہوئے سٹیج پر کہا "ایک مختصری غزل پیش خدمت ہے۔"

ظاہر ہے ایسا اعلان کانوں کو بھلا ہی لگتا ہے۔ ان سب حاضرین محفل نے اس اعلان کا بطورِ خاص خیر مقدم کیا جو موصوف کی "ادبی تخلیقی صلاحیتوں" کا ایک طویل عرصے سے شکار تھے۔ لیکن شرکائے محفل کی امیدوں پر بالٹیوں پانی اس وقت پھرا جب موصوف نے اپنی مختصر غزل کے آٹھ اشعار پیش کرڈالے۔ ابھی یہ سانحہ کماحقہ ہضم نہیں ہوا تھا کہ معزز شاعر اگلی ہی سانس میں نہایت اطمینان سے فرمانے لگے "اب اس غزل کا پہلا مقطع پیش خدمت ہے۔"

یوں غزل کا حسنِ مقطع سنانے کے بعد موصوف سب کو مسکراتا چھوڑ کر سٹیج سے اُتر گئے۔ اس مرحوم شاعر کی مغفرت کے لئے دعا

کی التماس ہے۔

وقوعہ نمبر دو بعض شعراء کو ترنم سے کلام سنانے کا عارضہ لاحق ہوتا ہے، چنانچہ علاجِ بالمثل کے طور پر موسیقی کے سُروں کو اپنی ''ناپاک خواہشات'' کی بھینٹ چڑھانے سے ذرا بھر نہیں چوکتے۔ اکادمی ادبیات اسلام آباد کی ایک شعری نشست کا حال سنئے جس کی صدارت جناب امجد اسلام امجد کے سپرد تھی۔ اسلام آباد کے ایک ''ترنم فرینڈلی'' شاعر کو جب سٹیج پر بلایا گیا تو موصوف بیاض سمیت جلوہ گر ہوئے۔ سامعین کی توجہ پا کر بیاض کو کھولا اور دو تین سیکنڈ کی ہومیو پیتھک ورق گردانی کی۔ پھر دو چار صفحات آگے پلٹے اور نیوٹن کے تیسرے قانونِ حرکت کے تحت دو چار صفحات اس سے پیچھے پلٹے۔ سب لوگ ورق گردانی کی اس ورزش کو برداشت کرتے رہے۔ آخر کار بیاض کا وہ صفحہ کھولا جس میں پہلے سے ہی ایک لمبا سا سرخ دھاگہ موجود تھا، شاید یہی صفحہ ہی ان کی قرات کی منزل مقصود تھا۔ اب باری ان کے بولنے کی تھی۔ فرمانے لگے ''بہت محبت سے یہ کلام لکھ کے لایا ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے، آپ رائے دیں کہ میں ترنم سے یہ اشعار پیش کروں یا تحت اللفظ میں ہی سنا دوں؟''

اس پر پہلی لائن میں بیٹھے جناب وفا چشتی (جو خود ایک عمدہ مترنم شاعر ہیں) نے، دروغ بر گردن راوی پیشہ وارانہ چشمک کے تحت، فوراً ہی باآواز بلند کہہ دیا ''حضور تحت اللفظ میں ہی پیش کیجئے۔''

سب لوگ ہنس پڑے، اس پر صاحب صدر امجد اسلام امجد نے ہنستے ہوئے کہا کہ ایک ووٹ ہی کافی ہے۔ ایک فلک شگاف قہقہہ پورے ہال میں پھیل گیا۔ شاعر نے اس صورت حال کو کمال دانائی کے ساتھ بھانپ کر، پھر بھی ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا۔

وقوعہ نمبر تین اسلام آباد کی ایک معروف ادبی تنظیم کے مشاعرے میں مہمان خصوصی کو دعوت کلام دی گئی تو انھوں نے سٹیج پر آ کر یہ بیان داغا ''احباب گرامی، اتفاق کی بات ہے کہ میں کچھ لکھ کر نہیں لا سکا، میرا حافظہ بھی کمزور ہے اور یہاں کچھ نہ کچھ پیش کرنا بھی لازم ہے۔ خیر جو مجھے یاد آتا جائے گا، وہی آپ کی خدمت میں پیش کرتا جاوں گا۔''

مشاعروں میں جانے والے عادی شعراء عموماً ایسے اظہار پر سکھ کا ہی سانس لیتے ہیں۔ سو مہمان خصوصی کی بات کو خصوصی طور پر ویلکم کیا گیا۔ لیکن کمزور حافظے کے دعویدار شاعر نے جب اپنا کلام سنانا شروع کیا تو یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ انسانی حافظہ پلک جھپکتے میں، موقعِ واردات پر، خطرناک حد تک بہتر بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سبھی شرکائے محفل کو تقریباً ایک گھنٹہ اس شاعر کا کلام سننا پڑا۔ اس دوران موصوف نے بے تکان کئی غزلیں سنا ڈالیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کمزور یادداشت رکھنے کے باوجود اس صاحب نے درجنوں غزلوں کے سو سے زیادہ اشعار ایسے سنائے کہ یہ یقین کرنا پڑا کہ ابھی اس دنیا میں اپنے کلام کو حفظ کرنے والے اہل قلم زندہ و سلامت ہیں۔ دماغوں کو ایک گھنٹے تک حالتِ ہیمبرج میں رکھنے اور سماعتوں کو حبسِ بے جا میں رگیدنے کا یہ کھیل آج تک درجنوں احباب کو یاد ہے۔

وقوعہ نمبر چار ایک مشاعرے کے دوران مشاعرا چھوڑ کر رائیٹر ہاوس کے باہر ہم کچھ احباب کھڑے تھے۔ حامد محبوب صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یار میں تو

مسٹر "ز" کی آئے دنوں کی پوسٹ مارٹم سے زچ ہو چکا ہوں۔ اب اس عذاب سے چھٹکارے کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ میں اسے ہلاک کر دوں۔"

اس پر میں نے برجستہ کہا "حامد بھائی! اس کی پوسٹ مارٹم سے مستقل طور پر جان چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ مسٹر "ز" کو ہلاک کرنے کی بجائے ہلاک کر دو۔"

وقوعہ نمبر پانچ آٹھ دس برس قبل کی بات ہے جب حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں کسی نے اپنی غزل برائے تنقید پیش کی۔ صاحب صدارت جناب ڈاکٹر احسان اکبر نے فرمایا کہ سے التماس ہے کہ اس غزل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیں اور یہ بھی دیکھیں کہ اس غزل کا مرکزی خیال کیا ہے؟ (آخری الفاظ کی ادائیگی کے وقت صاحب صدارت کا لہجہ طنزیہ تھا)۔

ایک صاحب نے اس پر برجستہ کہا کہ جناب صدر! غزل کا مرکزی خیال تو نہیں ہوا کرتا کیونکہ یہ صنف تو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس پر ڈاکٹر احسان اکبر نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ بجا کہتے ہیں کہ غزل کا کوئی مرکزی خیال نہیں ہوتا لیکن ہم حلقے کے اجلاس میں اسے نکالتے رہتے ہیں۔"

اِس پر ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

فی زمانہ بھی مقرر ہونا بڑی خوبی کی بات ہے۔ اپنا مافی الضمیر کسی کے سامنے بیان کرنا خاصا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اکثر لوگ ساری عمر دل کی بات دل ہی میں چھپائے رکھتے ہیں۔ مگر مقرر حضرات اس معاملے میں "بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں" کا نعرہ مستانہ بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنا مافی الضمیر تو ایک طرف سارے زمانے کا درد ان کے جگر میں ہوتا ہے۔ جو انہیں شعلہ جوالہ بنائے رکھتا ہے۔ پھر جب بھی موقع ملتا ہے۔ یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور جب پھٹتا ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مقرر حضرات مافوق الفطرت شے لگنے لگتے ہیں خود تو زمین پر رہتے ہیں لیکن ان کے قلابے آسمان پر ملتے ہیں۔ اپنی اس جلالی کیفیت کے دوران وہ دخل در معقولات کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔

یوں تو مقرر حضرات کی بہت سی اقسام ہیں لیکن گنی چنی اقسام ہی سے مقرر کی صحیح صورت حال واضح ہوتی ہے۔ کچھ مقرر اعلیٰ پایہ کے ہوتے ہیں۔ تو کچھ درمیانے درجے کے جبکہ قوم کے خادم قسم کے مقرروں کا خانہ بھی خالی نہیں رہتا۔

فی زمانہ مقررین کی جس قسم کی زیادہ مانگ ہے وہ سیاسی مقررین ہیں۔ ہر موضوع پر بے تکان بولنے والے یہ مقررین ہر مسئلے کو سیاسی انداز بصیرت سے دیکھتے ہوئے اپنی خطابت کا جادو دکھانے کا اظہار تیل کی دھار دیکھ کر کرتے ہیں۔ ایسے مقررین زیادہ سے زیادہ سامعین کی خواہش رکھتے ہیں اس کے لئے جوڑ توڑ سے بھی کام لیتے ہیں۔ تھوڑے مجمع کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ بلند پرواز اور بلند بانگ دعوے کرنے والے ایسے مقررین اپنے ساتھ معاون مقررین کی بھی ایک معقول تعداد ساتھ رکھتے ہیں۔

یوں تو فرہبی مقررین کی بھی خاصی مانگ ہے لیکن اکثر سامعین کو ان کے چکر سے رفو چکر ہوتے دیکھا گیا ہے۔ یوں تو سبھی مقررین مجمع باز ہوتے ہیں لیکن خاص طور پر مقررین کی ایک شاطر قسم کو مجمع باز مقررین کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایسے خاص مقرر بازاروں، چوراہوں اور گلیوں میں اپنے مقرر ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے ہیں۔ اپنے فن خطابت و ظرافت کے زور پر اپنی دکانیں چمکاتے رہتے ہیں۔ ایسے مقررین کی نظریں سامعین کے خیالات پڑھنے کی بجائے جیبیں ٹٹولنے اور خالی کرانے پر لگی رہتی ہیں۔

شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ

ذہین احمق آبادی

اُردو ہے جس کا نام۔۔۔

ہماری قومی زبان اُردو ہے اور اس حد تک قومی ہے کہ قوم کا ہر فرد اسے اپنی مرضی سے کسی بھی سمت لیے چلا جاتا ہے اہلِ زبان کے علاوہ زیادہ تر پاک سرزمین کے گلی کوچوں میں ایسے ایسے تاریخی جملے سننے کو ملتے ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جائے۔ گزرے دنوں ہماری ایک عزیزہ کہہ رہی تھیں کہ حکمرانوں سے کسی معاملے میں اپیل کرنا تو ایسے ہے جیسے سانپ کے آگے بین بجانا۔ اس بیان سے کم از کم اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ طبقہ سپیروں کو زیادہ قریب کیوں رکھتا ہے۔

تذکیر و تانیث کا بھی حال ابتر ہے۔ اس کی مثال ہمارے علاقے کی ایک اماں جی کے گھر ملتی ہے جو اپنے اکلوتے سپوت کیلیئے پٹھان بہولے کر آئی ہیں۔ مغرب کے وقت جب بہو بیگم پوچھتی ہیں ''کیا زبیدہ کی ابا دکان سے آ گئی ہے؟'' تو ساس صاحبہ اکثر اپنا سر پیٹ لیا کرتی ہیں۔

ویسے تذکیر و تانیث کا معاملہ دیکھا جائے تو زندگی بھر ہمیں بھی یہ سمجھ نہیں آیا کہ دہی کھٹا ہے یا دہی کھٹی ہے۔۔۔؟

اُردو کا یہ حال شاید تعلیمی اداروں کی خراب کارکردگی کی وجہ سے ہے، کچھ عرصہ قبل ایک معروف چینل کا رپورٹر چیخ چیخ کر ''اساتذہ'' کی بے توجہی کا رونا رو رہا تھا۔ اسکے علاوہ ''طلبہ'' کی پڑھائی سے عدم دلچسپی بھی زیرِ بحث تھی۔ حالانکہ ''اساتذہ'' کا کہنا تھا کہ وہ تمام ''طلبا'' کو اپنی ''زیرِ نگرانی میں'' پڑھاتے ہیں۔

ایک انگریزی پروگرام دیکھتے ہوئے والدہ نے استفسار کیا کہ ان لوگوں کا کچھ الفاظ بولنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ ہم نے انہیں تسلی دی کہ کوئی بات نہیں ان کی اپنی زبان ہے۔ ہم بھی تو آہستہ آہستہ ''جذباتوں''، ''لمحاتوں'' اور ''رمضانوں'' پر آ گئے ہیں۔

ایک دوست سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ لو جی اُردو صحیح بولنا تو گویا اک آگ کا دریا ہے اور ''کوذ'' کے جانا ہے۔۔۔!

یہ زبانی کلامی لطیفے تھے۔ تحریری شگوفے ان سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل بازار میں ایک بورڈ نگاہ سے گزرا کہ ''یہاں کنوارے مرغے کے سپیئر پارٹس دستیاب ہیں۔''

اور یہ آفر محدود مدت کیلیئے ہے ''شرکیہ''۔۔۔ صبح سویرے منہ اندھیرے حالات حاضرہ سے آگاہی کیلیئے نیوز چینل لگایا تو

معلوم ہوا کہ اس چینل کی سیٹنگز بدل دی گئی ہیں اور اس تک رسائی کیلیئے اپنے "مطلقہ" کیبل آپریٹر سے رابطہ کرنا پڑے گا۔۔!!

اب تو اکثر اُردو کی "امپروومنٹ" کیلیئے مختلف اداروں کی زیرِ نگرانی پروگرامز اور سیشنز بھی منعقد کروائے جاتے ہیں جن کا نتیجہ زیادہ تر اُردو اور انگلش کے ملغوبے کے طور پر سامنے آتا ہے اور یہ ملغوبہ اکثر اوقات اِتنا پھیکا ہوتا ہے کہ باذوق افراد کے حلق سے نیچے نہیں جاتا اور نئی نسل کے منہ سے باہر نہیں آتا نتیجتاً معاشرے کے حلق اور لب کے درمیان اٹک کر رہ جاتا ہے۔ یہ ملاحظہ فرمایئے:

مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

اب آپ غالباً مجھے نظر چیک کروانے کا مشورہ دیں گے۔۔ مگر یہ میری آنکھوں کا قصور نہیں ہے۔ اس تذکیر و تانیث کی غلطی کو میری آنکھوں کا قصور نہ جانیے بلکہ۔۔ یہ تو دورِ حاضر کے فیشن کی کارستانی ہے۔

وہ وقت گیا جب ماں باپ کو گھر میں سب بچوں کے الگ الگ کپڑے اور جوتے لانے پڑتے تھے۔ اب بھائی اپنی بہنوں کے کھسّے پہنیں یا بہنیں بھائیوں کی پتلون زیبِ تن کر لیں۔ سب کچھ فیشن کا حصّہ ہے اور اس فیشن کے نتیجے میں جو نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے ۔

مرد ہونی چاہیے، خاتون ہونا چاہئے
اب گرامر کا یہی قانون ہونا چاہیے

حالات یہاں تک آن پہنچے ہیں کہ اگر پشت سے کسی "زلف دراز" خاتون کو دیکھ کر آہیں بھرتے انکی لمبی زلفوں کا راز پوچھنے جائیں تو وہ صنفِ مخالف نکل آتے ہیں اور جنہیں نا-محرم گردانتے ہوئے ان سے پردہ کرنے کی کوشش کی جائے وہ ہم-جنس نکل آتی ہیں۔۔!!

کبھی پارلر جانا دوشیزاؤں کا مشغلہ ہوتا تھا لیکن ابا ایک سے بڑھ کر ایک مردانہ سیلون بھائیوں کو "بہنوں" کی شکل دینے میں مصروف ہے اور اس فرق کو واضح کرنے کیلیئے مستورات میں "رف اینڈ ٹف" لگنے کا بڑھتا ہوا رجحان پردے کو کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا اور مرد حضرات کی نزاکت عروج کو پہنچ چکی۔ صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ بقول حسن عسکری صاحب ؎

حیا گرتی ہوئی دیوار تھی کل شب جہاں میں تھا
نظر اٹھنا بہت دشوار تھی کل شب جہاں میں تھا
جنہیں ساڑھی میں آنا تھا وہ پتلونوں میں آئی تھیں
تمیزِ مرد و زن دشوار تھی کل شب جہاں میں تھا

اب اگر کوئی فیشن کے دلدادہ اِن شوقین مزاج خواتین و حضرات کو یہ یاد دلانا چاہے کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کا دین ان کے لیے لباس کے معاملے میں کچھ حدود متعین کرتا ہے جن میں سرِ فہرست ستر پوشی اور پھر صنفِ مخالف کے لباس سے مشابہت کی ممانعت ہے یہ ان سے اس فیشن کی وجہ پوچھ لیں یا یہی دریافت کر لیں کہ جناب آپ کو ایسا کرتے ہوئے عجیب نہیں لگتا۔۔؟ تو ایک مشترکہ جواب ملے گا کہ یہ "نارمل" ہے، میں آپ سے نارمل کی تعریف پوچھنا چاہوں گی!

نارمل ہر وہ چیز ہے جس کی انسان کو عادت ہو جائے۔۔ اس کیلیے وہ ایک حسبِ معمول چیز ہو۔ کیا اللہ نے آپ کو نارمل رہنے کا حکم دیا ہے؟ آپ میں سے جو لوگ "نارمل" ہونے کو "صحیح" ہونا سمجھتے ہیں وہ مجھے یہ بتائیں کہ نارمل کی عام تعریف کے مطابق تو کبھی بت پرستی بھی "نارمل" تھی۔۔ شرک بھی "نارمل" تھا! بنی اسرائیل کا گناہ ان کیلیئے "نارمل" تھا۔ قومِ لوط کا گناہ ان کیلیئے "نارمل" تھا۔ کیا انہیں سزا نہیں دی گئی؟ کیا اللہ تعالیٰ نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ کسی گناہ کو، کسی غلط رویے کو بحیثیتِ قوم اختیار کر کے اسے پر "نارمل" کی مہر لگا دو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔۔ خدارا سوچیئے۔۔۔ میدانِ حشر میں اگر اللہ تعالیٰ نے آپ سے سوال کر لیا کہ تمہیں میری بنائی ہوئی جنس پر کیا اعتراض تھا؟ تمہیں میری مقرر کردہ حدود میں کیا کمی نظر آتی تھی تو آپ کیا کہیں گے؟ کیا آپ یہ کہ سکیں گے کہ یہ "نارمل" تھا! کیا آپ کو شرم نہیں آئے گی! کیا آپ کا یہ سادہ سا جملہ اس وقت گلے کا کانٹا نہیں بن جائے گا! خدارا ہوش کریں۔۔۔ یاد رکھیئے، ضروری نہیں کہ جو نارمل ہو وہ "صحیح" بھی ہو۔

ضیاء اللہ محسنؔ

انگوٹھا چوس شاعر

علامہ اقبال کی ''خودی'' سے تو ہم بہت بعد میں واقف ہوئے ،لیکن بقول اہلِ خانہ خودداری کے ''جراثیم'' بچپن سے ہی ہمارے اندر وافر مقدار میں پائے جاتے تھے۔ چھوٹے موٹے کام تو کسی کھاتے میں نہیں، اکثر اوقات ہم بڑے مسائل بھی یوں چٹکی بجانے میں حل کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً آپ شیر خواری کے زمانے کو ہی لیں۔ جب بھوک لگتی ،تو دائیں ہاتھ کا اُنگوٹھا ہم اپنی مدد آپ کے تحت منہ میں اُڑس لیتے ۔پھر پیٹ بھر کر اسے چوس لیا کرتے ۔تب کہیں جا کے بھوک بندش ہوتی۔ زمانہِ فیڈری میں کبھی رونے کی حاجت ہوتی تو اس معاملے میں بھی اپنی مدد آپ کے تحت ہم پھس پھسا منہ کر کے رونے دھونے کا شغل فرما لیتے۔ ہماری چیخ و پکار میں شاعرانہ ردھم نمایاں ہوتا۔ وہ الگ بات کہ رونے کے بعد چپ بھی ہمیں خود ہی ہونا پڑتا تھا۔

لاڈلے تو ہم شروع دن سے ہی تھے۔ قدم قدم چلنا شروع کیا تو ہماری خودارانہ صلاحتیں مزید نکھر کر سامنے آتی گئیں۔ لوگ ہماری اس عادتِ عالیہ کے خوب گرویدہ تھے۔ جی ہاں، ہماری یہ خوبی اب آپ کو بھی ماننا ہی پڑے گی۔ جو نہیں مانے گا اس کے منہ میں ۔۔۔اوہ معذرت !وہ تو آپ بچپن میں کھاتے ہی رہے ہوں گے۔ لیجیے!اب آپ مسکرا بھی رہے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں،ضرور آپ اس ''خاک سار'' کی بات کا مطلب غلط سمجھے ہیں۔ وہ کیا کہا شاعر نے کہ

زندگی خاک نہ تھی، خاک اُڑاتے گزری

اُڑانے اور کھانے کے لیے ضروری نہیں کہ صرف خاک ہی ہو۔بل کہ منہ میں خا۔۔۔خالص گھی شکر بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔ مگر کیا کریں جی، ان دونوں چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں جب کہ خاک ہمیشہ سے ''اَن مول'' رہی ہے۔

بات گھوم کے کہاں چلی گئی۔ ہمارے بچپن کا ذکر ہو رہا تھا،تو سنیے جناب!مابدولت نے ذرا ہوش سنبھالنا شروع کیا تو ایک ہیبت ناک قسم کی جیل سے واسطہ پڑ گیا۔لوگ شاید اسے ''اسکول'' کے نام سے یاد کر رہے تھے۔اس زمانے میں بھی ہم کمال کے خوددار تو تھے،لیکن ''شوخ'' بہر حال کبھی نہ رہے تھے۔ پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا۔ہم ساتویں جماعت میں تھے تو استاد صاحب نے

انہوں نے لہک کر ایک انوکھا ''شعر'' پڑھا۔

یہ سڑک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جاتی ہے جلال پور جٹاں کو بے دھڑک

اُستادِ محترم کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں اس سے مختصر مگر جامع ''شعر'' اور کوئی نہیں ہو سکتا، ادھر ادبی ہاضمہ درست نہ ہونے کی وجہ سے ہم پروفیسر صاحب کے مختصر شعر کا دعویٰ ہضم نہ کر سکے، جواباً فوری طور پر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ردِ عمل کچھ یوں ظاہر کیا کہ سر۔

لینے گئے ہوائی جہاز، لے کر آئے سوئی

اُوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہاہاہا۔۔۔ ہمارے اس نیم شاعرانہ جواب پر ہم جماعتوں نے قہقہوں کی پھلجڑیاں بکھیر دیں۔ جبکہ استاد صاحب ہونقوں کی طرح ہمارا منہ تکتے رہ گئے۔ پانچویں جماعت میں ہمارے دماغ سے زندگی کی پہلی نظم سرزد ہوئی تو رفتہ رفتہ ہم اسی کام میں ملوث ہوتے چلے گئے۔ حضرت اقبال کے بعد ساغر صدیقی ہمارے پسندیدہ شاعر ہوا کرتے تھے، چنانچہ اسی نسبت سے ایک لنگوٹیے نے ہماری شاعری کی صحت کے عین مطابق ہمیں ''لاغر صدیقی'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

ویسے علامہ اقبال سے اگر ہماری کچھ قدریں مشترک ہیں تو اول ان میں یہ کہ حضرتِ اقبال نہ صرف انسان تھے، بلکہ کمال کے انسان تھے، جبکہ یہ صفت بدرجہ اتم ہمارے اندر بھی موجود ہے، دوم یہ کہ علامہ اقبال شاعر بھی تھے جبکہ شاعر بننے کا جنونی دریا ہمارے من موجی میں بھی ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ البتہ علامہ صاحب تو ٹھہرے شاعرِ مشرق اور ہم؟ ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے، ماضی قریب میں پنجاب کی تقسیم کی بات چلتی رہی، ہماری جائے پیدائش (ساہیوال) کو حاصل کرنے کے لئے شمال اور جنوب دونوں حصوں کے سیاستدانوں میں سیاسی کھینچا تانی دیدنی تھی، (شاید اس کی وجہ ہم ہی ہوں لیکن یہ مقدر کی بات ہے، ان میں سے جو کوئی بھی ہمیں یا ہمارا شہر ''جیتنے'' میں کامیاب رہا، اسی نسبت سے ہم اپنے نام کے ساتھ شاعرِ شمال یا شاعرِ جنوب کا سابقہ لگانے کو تیار ہوں گے، فی الحال ہم شاعرِ معلق (تین میں نہ تیرہ میں) سمجھے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب خود کو اقبال کا جانشین ثابت کرنے کے لئے ہم ہر قسم کی اقبالیات کو دیمک کی طرح چاٹ لیا کرتے تھے، بعد ازاں پیروڈی کے خبط نے دیگر شعراء کے کلام کے ساتھ ''کلیاتِ اقبال'' کو بھی ہمارے قلم کی جنبش تلے رکھ دیا۔۔ مطلب کہ ہمیں پیروڈی سے خدا واسطے کا پیار تھا: قارئین! حضرتِ اقبال کا ایک شعر تو ملاحظہ فرمائیے۔

ملت کے لئے موت مشینوں کی حکومت

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بہت خوب! مگر اس خوبصورت شعر کے رنگ میں بھنگ جو ہم نے ڈالی، ذرا وہ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

احساسِ مروت کو نگل بیٹھیں ہیں حالات

ملت کے لئے موت کمینوں کی حکومت

بعینہٖ ایک اور جگہ اقبالؒ مدح سرا ہیں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

بجا ہے، درست ہے، بلکہ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا، مگر کیا کریں جب ہمارے دماغ میں کھجلی ہوئی تو وہاں سے کیا برآمد ہوا، پڑھئے۔

نفرت مجھے ان ''حیوانوں'' سے ہے

کہ سڑکوں پہ جو ڈالتے ہیں یہ گند

مذکورہ اشعار کی پیروڈی لئے ہم خراماں خراماں اپنے پروفیسر صاحب کے حضور پیش ہوئے تو موصوف نے ہمارے ''کارہائے نمایاں'' پہ ایک سرسری نگاہ ڈالی اور کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھ کر گویا ہوئے ''برخوردار! بہتر ہے کہ تم پکوڑے تل لیا کرو!''

''کک۔۔۔ کیا مطلب سر۔۔۔؟ ہم کچھ سمجھے نہیں!!''

ہمارے منہ سے ایک دبی سی معصومانہ آواز برآمد ہوئی تو انہوں نے دوبارہ اپنے لب کھولے ''بیٹا جی! یہ جو کچھ تم تل رہے ہو اسے پیروڈی نہیں۔۔۔ سیانے لوگ اسے ''لچ'' کا نام دیا کرتے ہیں۔ سنو! عظیم شعراء کے تخیل میں ٹانگ نہیں اڑاتے۔۔۔ سمجھے۔''

پروفیسر صاحب کی بارعب آواز میں ہماری منمناہٹ دب کر

رہ گئی۔

''لیکن سر! اگر پیروڈی میں کام کی کوئی بات ہو تو پھر اعتراض نہیں ہونا چاہئے ناں؟''

'' کام کی بات؟ کیسی کام کی بات۔۔۔حد درجے کی فضولیات ہیں تمھاری پیروڈی۔'' سرجی نے بناوٹی غصہ دکھاتے ہوئے ہمارے تخیل پہ لات دے ماری تو ہم بھونچکاں رہ گئے۔

''سر دیکھئے ذرا! اقبالؒ تو کسی زمانے میں فرمایا کرتے تھے کہ ۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرونِ دریا کچھ نہیں

جبکہ آج کی حقیقت تو یہ ہے کہ ۔

فرد قائم ربطِ ڈالر سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے سرکار کی، اندرونِ دریا کچھ نہیں

پروفیسر صاحب ایک پھیکی ہنسی ہنس کے بولے'' ہاں! برخوردار! جانتا ہوں کہ دریاؤں میں کچھ نہیں ہے بلکہ اب تو بحرِ علم و عمل بھی سوکھ چکے ہیں، فی زمانہ یہی کچھ چل رہا ہے، بنیادی وجہ اس کی ہمارے اپنے کرتوت ہی ہیں، جن کی بدولت ہمیں ہر بار ''صوادے'' حکمران ہی نصیب ہوتے ہیں، ہم لوگ اللہ ایک مانتے ہیں، اللہ کی ایک نہیں مانتے، حالانکہ اقبالؒ تو قومِ مسلم کو رب کی پیروی میں یہاں تک فرما گئے کہ ۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے
نہ احکامِ حق سے تُو کر بے وفائی

پروفیسر صاحب کی ان سنجیدہ، تلخ مگر حقیقی باتوں پہ ہم دھیرے سے سر ہلا کر رہ گئے پھر ذرا توقف کے ساتھ گلہ کھنکھارتے ہوئے گویا ہوئے ''سر جی! ویسے موجودہ ملکی حالات میں جب ہر کوئی دونوں ہاتھوں سے ملک کی خدمت کئے جا رہا ہے، اسے دیکھ کر تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں، بزبان صاحبانِ اقتدار، کہ ۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے
نہ امریکہ سے کر کبھی بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
اوبامہ سے کرنے چلا تُو لڑائی
ہمارے تو دلدار ٹھہرے ہیں یہ سب
وہ بش ہو کلنٹن یا ہو واجپائی
سُنا ہے صفائی تو ہے نصف ایماں
تُو قومی خزانے کی کر لے صفائی
خریدے گا مفلس جو اپنے لہو سے
اسی چیز میں ہم کو لذت ہے آئی
جو خون اور پسینے سے ہوتی ہے حاصل
وہ ٹیکسوں میں لو سال بھر کی کمائی
شہادت ہو مقصود و مطلوب جس کو
وہ اپنی حکومت سے کر لے لڑائی
ہمارا تو منشور واضح ہے محسنؔ
لگا کر بجھائی، بجھا کر لگائی

اپنے تئیں ہم نے بڑی ''برق ریزی'' کے ساتھ اربابِ اقتدار کا اعمال نامہ بیان کر ڈالا تھا مگر جواباً پروفیسر صاحب نے ایک قہقہہ بار آوازہ کسا ''پُتر! تیرے اندر ایک سیاسی شاعر پنپ رہا ہے، اللہ تجھے کسی غزل گو شاعر کی شاگردی عطا فرمائے۔

ایک لمحے کے لئے ہم حیران ہی رہ گئے کہ پروفیسر صاحب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ دعا تھی یا بددعا۔۔۔! البتہ اتنا ہمیں بخوبی علم ہے کہ استادی اور شاگردی زندگی میں لازم وملزوم ہے، ہر شعبے میں چلتی ہے، مگر ہم اپنی شاعری کے معاملے میں کسی کی شاگردی کے قائل نہ تھے۔ اس کے باوجود محلے کے ایک دیسی قسم کے شاعر نے ہمارے شاعرانہ جراثیم کو بھانپ کر مفت میں ہمیں شاگرد بنانے کی پیشکش کر ڈالی۔ (ان کی ادب شناسی پہ داد دیجئے) موصوف، شاعر ہونے کے ساتھ موٹر سائیکل مکینک بھی تھے۔

بقول ان کے تمام کے تمام چار بہن بھائیوں نے ایم اے کر رکھا تھا، حیرت کی انتہا تو تب ہوئی جب شاعر صاحب کے بہن بھائیوں کے اتحاد و اتفاق کے بارے معلوم ہوا، راز یہ کھلا کہ سب

نے مل جل کر "ایم اے مکچر" یعنی مل جل کر کل سولہ سال اسکول میں گزارے تھے، یوں سولہ جماعتیں بھی پاس ہو گئیں، خود موصوف نے ہاف میٹرک بڑے اعلیٰ اور تازہ "انڈوں" کی بدولت فیل کیا ہوا تھا۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر ان کے پُر زور اصرار پر ایک دن ہم اصلاح لینے ان کی ورکشاپ جا پہنچے، نہ جانے جی میں کیا آئی، شاعر صاحب نے اچانک ترنم میں زور زور سے چلانا شروع کر دیا، ہم ذرا خوفزدہ ہوئے کہ شاید کسی مشین وغیرہ میں ہاتھ آ گیا ہو، بھاگتے ہوئے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ موصوف بچپن میں باتھ روم سنگر بھی رہ چکے تھے، اور اسی بیماری کے اثرات تا حال موجود ہیں۔ چنانچہ اسی وقت ہم اس مکینیکل قسم کے شاعر کی شاگردی سے تائب ہو کر بھاگ نکلے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔۔۔

اقبالیات کے بارے ہم بچپن سے سنتے آئے کہ حضرت علامہ نے امتِ مسلمہ کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے شاعری کا سہارا لیا تھا۔ اس کام میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہرے۔ مگر حیرت انگیز طور پر ہماری شاعرانہ "صلاحیتوں" نے بھی لوگوں کے قلب وذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ ثبوت کے طور پر آپ کو بتاتے جائیں کہ ایک مرتبہ کالج میں بزم ادب کے دوران ہم نے سکول کے زمانے کا لکھا ہوا اپنا ایک عدد قطع رعب جھاڑنے کی غرض سے پیش کر ڈالا۔

فیضؔ نے فیض نہ پایا ہم سے
نہ فرازؔ ہی سرفراز ہوئے
چچا غالبؔ بنے مغلوب ہمارے آگے
نام سنتے ہی ہمارا سبھی شاعر بھاگے

واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کمال کر دیا صاحب۔ بہت اعلیٰ۔۔۔ خوب۔۔۔" ہر طرف سے دادو تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے، کچھ ہی دیر میں حاضرین سر دُھنتے اور خواب بُنتے ہوئے ایک دوسرے کو "ٹکریں" مارنے لگے، خود کو ہم کچھ دیر کے لئے اقبال کا شاہین تصور کرنے لگے، مگر غور سے دیکھنے پہ عقدہ کھلا کہ سامنے بیٹھی "امتِ مسلمہ" ہمارے سخن بے زار کی بدولت خواب خرگوش کے خراٹوں میں مست الست اُونگھنے اور جھولنے میں مصروف ہے، خیر متاثرین شاعری کا ایک دوسرے کو ٹکریں مارنا سمجھ آ ہی گیا۔ لمبی تان کے سونا تو خیر ویسے بھی ہماری قوم کا پسندیدہ مشغلہ ہے، شاید اسی بات کو مدِ نظر رکھ کر ایک دل جلے نے اپنے رکشہ کے پیچھے بڑی معقول بات لکھ رکھی تھی کہ "ہارن آہستہ بجائیں، قوم سو رہی ہے" وہ دن اور آج کا دن۔۔۔ تب سے کوئی بھی دوست ہمیں تنگ کرے تو ہم فوراً قافیہ وردیف کا ہتھیار لئے اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں یا کبھی کبھار امن وآشتی کے ماحول میں عادت سے مجبور ہو کر منتوں پہ بھی اتر آتے ہیں کہ یارو! خدا کے واسطے سن لو۔

بہت ہی دیر سے روکے ہوئے ہوں
کہ مجھ کو شعر اک آیا ہوا ہے

یقین کیجئے تب ایسے دوستوں کی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، ویسے اب تو شاعری کا مرض ہمارے کچھ اور دوستوں کو بھی لاحق ہو چکا، گویا خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، میدان ہذا میں ہمارے کارناموں سے متاثر بلکہ متاثرین کی کوئی کمی نہیں ہے، ایک صاحب تو آج کل باقاعدہ ہمارے مرید ہوا کرتے ہیں۔ موصوف کو ایک عدد تخلص کی ضرورت تھی، ہمارے "انگوٹھا چوس شاعر" کی اصطلاح سے وہ بڑی فرحت محسوس کرتے ہیں مگر اس پر ہمارا قبضہ ہو چکا، ہاں! البتہ انگوٹھا چوس کے ہم قافیہ الفاظ مثلاً کنجوس، منحوس اور مکھی چوس وغیرہ میں سے اگر ان کو کوئی تخلص پسند آئے تو ہم ان کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ ایسے دوست جنہیں شعروسخن کا "عارضہ" مستقل طور پہ تنگ کیے جا رہا ہے، آخر میں ہم اپنے چند اشعار بطور ہمدردی ان کے نام کیے دیتے ہیں۔

جو انہونی تھی، وہ تو ہو گئی ہے
مگر "ہونی" کہیں پہ کھو گئی ہے
ذرا قسمت میری کا حال دیکھو!
جگا کر یہ مجھے، خود سو گئی ہے
طبیب شعر کو بلواؤ محسنؔ
مجھے کچھ شاعری سی ہو گئی ہے

ساجدہ غلام محمد، مانچسٹر

گرمی ری گرمی!

اگر صورت حال یہ ہو کہ آپ گھر سے نہا دھو، تیار شیار ہو کر، رس گلے کی مانند نکھرے نکھرے سے نکلیں اور آدھے گھنٹے بعد پسینے میں شرابور، گلاب جامن بن کر واپس لوٹیں تو سمجھ جائیں کہ موسم گرما آ پہنچا!!!!

ہماری بہن کا کہنا ہے کہ گرمیاں اس لیے اچھی ہیں کیونکہ بچے کو کپڑے بدلوانے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ سردیوں میں تو پہلے گرم پانی سے بالٹی بھریں، پھر جرابوں، دستانوں، پینٹ، گرم پاجامے، سویٹر، شرٹ، ایک اور سویٹر اور پھر بنیان اتار کر بچے کو برآمد کریں تو غالب امکان یہی ہے کہ گرم پانی تب تک ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ گرمیوں میں مزے ہیں، بچے کا منہ دھلانے لے کر جائیں، جھٹ قمیص پاجامہ اُتار، نل کے نیچے کھڑا کر کے پانی چلا دیں!

ارے، اسی سے یاد آیا، گرمیوں میں کپڑے دھو کر تار پر ٹانگنے کی بجائے انہیں اپنے اوپر ٹانگ لیں، مطلب، پہن لیں اور 'ہولے ہولے سے ہوا لگتی ہے' گنگنائیں۔ بس یہ دھیان رہے کہ گیلے کپڑوں کے ساتھ کہیں بیٹھنے سے گریز کریں ورنہ نشست چھوڑنے پر آپ کے بیٹھنے والی جگہ پر جو ایک بڑا سا گیلا دائرہ بنا ہو گا، وہ دیکھنے والوں کی نظر میں آپ کو مشکوک بنا دے گا!

درسی کتب کے مطابق موسم گرما کا دورانیہ مئی سے اگست تک ہے۔ چونکہ موسم علم سے بہرہ مند نہیں، اس لیے وہ مارچ، اور کراچی میں تو فروری میں ہی آ ٹپکتا ہے۔ جب ملک کے باقی شہروں میں لوگ گرما گرم سوپ کے مزے لیتے ہیں، اس وقت کراچی والے پسینہ پونچھتے ہوئے گولہ گنڈا چوستے ہیں اور بحیرہ عرب میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ گرمیوں کو آنے کی جتنی جلدی ہوتی ہے، اتنا ہی جانے کا افسوس ہوتا ہے اس لیے اپنا قیام طویل سے طویل تر کرنے کی کوشش میں اکتوبر تک تو ٹک ہی جاتی ہیں۔

موسم گرما میں دو چیزوں کی کثرت ہوتی ہے؛ گرمی اور ہوائی مخلوق، یعنی مچھر اور مکھیاں۔ اگر اس موسم میں کوئی کہہ دے کہ "بس بھائی! مکھیاں مار رہا ہوں۔" تو قوی امکان ہے کہ وہ واقعی مکھیاں مار رہا ہو گا۔ کچھ مکھیاں ہم مارتے ہیں، کچھ تازہ پھلوں کے جوس بنا کر بیچنے والے انہیں پھلوں سمیت جوس والی مشین میں ڈال کر مار دیتے ہیں، اور گاہک یہ 'غذائیت سے بھرپور تازہ جوس' پی کر گرمی کا مقابلہ کرنے کے لیے دوبارہ کمر کس لیتے ہیں۔ مکھیوں کی ناگہانی

اموات کا بدلہ مچھر ڈینگی پھیلا کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ ہوائی مخلوق فیملی پلاننگ کو نہیں مانتی، اس لیے آپ جتنا مرضی ان کی آبادی گھٹانے کی کوشش کر لیں، گرمی کے موسم میں خوب پُر پُرزے نکال لیتی ہے۔

اِس موسم میں اُن علاقوں میں رہنے والوں کے مزے ہو جاتے ہیں جہاں نہریں بہتی ہیں۔ ان نہروں میں گرمیوں میں عوام خوب چھلانگیں لگاتی ہے اور سردیوں میں کم پانی یا پانی نہ ہونے کے باعث ان کا جس طرح استعمال کرتی ہے، اس سے وہ کھیت ضرور لہلہا اٹھتے ہیں جہاں ان نہروں کا پانی پہنچتا ہے! قدرتی کھاد فصلوں کے لیے بہترین جو ٹھہری!

گرمیوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ تیز دھوپ کے ذریعے محبوبہ کے چہرے کا سارا میک اپ پسینے کے ذریعے اتار کر عاشق کو اس کی اصلیت دکھا دیتی ہے کہ ''سوچ لو!'' اور عاشق عموماً سوچنے سے بھی پہلے محبوبہ کا اصلی چہرہ دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ کتنے ہی گھر اس طرح بس کر اجڑنے سے بچ گئے۔ اگر کوئی سچا عاشق ہو اور محبوبہ کا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد بھی عاشق کے رتبے پر فائز رہے تب بھی موسم گرما اس کے لیے فائدہ مند ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہی مغرور محبوبہ ناراض ہوئی، جھٹ کونے والی دکان سے آئس کریم لا دی اور محبوبہ خوش! یہ پرفیوم، یہ چاکلیٹس! یہ تو موسم سرما کے چونچلے ہیں بھئی! گرمیوں میں تو چاکلیٹ محبوبہ کے منہ میں پگھلنے سے پہلے اپنے ڈبے میں ہی پگھل جاتی ہے!

اگر اس موسم میں آپ کو اساتذہ اور بچے خوش جبکہ والدین حواس باختہ نظر آئیں تو سمجھ لیں کہ موسم گرما کی تین ماہ کی تعطیلات شروع ہو چکی ہیں. یہی بچے اور اساتذہ جب منہ بسورتے اور والدین خوشی سے چھلانگیں لگاتے دکھائی دیں تو لیجیے! چھٹیاں اختتام پزیر ہوئیں!

یوں تو پورا سال واپڈا والے بجلی کی بلاتعطل لوڈ شیڈنگ کی فراہمی کو یقینی بناتے ہیں لیکن گرمیوں کے موسم میں اس فرض شناسی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''ہتھ پنکھوں'' کی روایت برقرار رکھنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

مولانا جوہرؔ کا سسرال

مولانا محمد علی جوہرؔ رام پور کے رہنے والے تھے۔ ایک بار سیتا پور گئے تو کھانے کے بعد منتظمین نے پوچھا کہ آپ میٹھا تو نہیں کھائیں گے؟ (کیونکہ اُن دِنوں مولانا ذیابطیس کے مریض تھے) مولانا بولے ''بھئی، کیوں نہیں، میرے سسرال کا کھانا ہے، کیسے انکار کر دوں؟''

یہ سُن کر سب لوگ حیران ہو گئے اور پوچھا کہ سیتا پور میں آپ کا سسرال کیسے ہوا؟

مولانا بولے ''سیدھی سی بات ہے کہ میں رام پور کا رہنے والا ہوں، ظاہر ہے اس طرح سیتا پور میرا سسرال ہوا!''

گرمیوں میں تو صبح پانچ بجے ہی امی ''اُٹھ بھی جا نامراد! سورج سر پر چڑھ آیا ہے'' کہتے ہوئے جگا دیتی ہیں۔ بچپن میں سنا تھا کہ گرمی کی وجہ سے چیزیں پھیلتی اور سردی کی وجہ سے سکڑتی ہیں۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ دن کسی الاسٹک کی طرح ہے، گرمی میں ربڑ کی طرح لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔ بڑے ہوئے تو سمجھ آئی کہ وقت کا قصور نہیں، اس کی تو 'وہی ہے چال بے ڈھنگی جو کل بھی تھی سو اب بھی ہے'، البتہ سورج کو جلدی ہوتی ہے نکلنے کی۔ جہاں تک پھیلنے اور سکڑنے کا تعلق ہے، ایک ماں کی نظر سے دیکھیں تو سراسر غلط ہے۔ سردیوں میں بچے کپڑوں پر کپڑے، سوئیٹروں پر سوئیٹر پہن کر موٹے سے، گول گپے سے لگتے ہیں اور گرمیوں میں جب انہی بچوں کو ایک شرٹ اور نیکر پہناتے ہیں تو مائیں صدمے سے انگلی دانت تلے دبا لیتی ہیں کہ، ''ہائے! اِتنا ماڑا!!!!'' شک کی سوئی گرمی کی بجائے نند یا سسرالی رشتوں پر آ کر رک جاتی ہے کہ ضرور فلاں کی نظر لگ گئی ہے۔

گرمی کو بس ایک ہی چیز قابلِ قبول اور قابلِ برداشت بناتی ہے، اور وہ ہے آم کی سوغات! جس طرح کسی مہمان کے ساتھ ان کی نٹ کھٹ اولاد کو بھی ہنس کر جھیلنا پڑتا ہے، اسی طرح آموں کی خاطر گرمی کا موسم بھی برداشت ہو ہی جاتا ہے۔ ہم بھی آم چوستے ہوئے گرمی برداشت کر رہے ہیں، آپ بھی کیجیے ناں!

سیّد عارف مصطفیٰ

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات

اِس اتوار ۲ جولائی کی شام میں لگ بھگ دس بارہ برس کے بعد بیمار ہوا ہوں۔۔۔کچھ نزلے کا وفور ہے جو ابھی تک کسی پہ گرا نہیں ہے اور کسی حد تک پیٹ کی گڑ بڑ کا بھی معاملہ ہے، گویا "ہرطرف" سے مسلسل مصروف ہوں کبھی کبھی اخلاقاً اٹھتے ٹھسکے کو نہایت محتاط انداز میں کھانسی میں بدل کے ماحول کو کافی ترس انگیز بنا دیتا ہوں۔۔۔محتاط اس لیئے کہ یہ رسک ضرور رہتا ہے کہ اسہال کے جھٹکے سے کہیں بیٹھے بٹھائے ایک شعر پوری غزل نہ بجائے۔۔۔میں دو ڈھائی دن اہلِ خانہ کو ٹالتا رہا کہ بقول بیگم، اِس شعبے میں کوئی میرا مقابل نہیں دور تک بلکہ بڑی دور تک، لیکن پھر آج شام بڑا بیٹا سواری پہ کھینچ اور لاد کے ایک کلینک یوں لے گیا جیسے منڈی سے قربانی کی بچھیا، ڈاکٹر صاحب پرانے واقف ہیں کیونکہ برسوں پہلے بچوں کو وہیں لے جاتا رہا ہوں لیکن اب چونکہ وہ بڑے ہوگئے ہیں چنانچہ اب حسبِ دلخواہ ڈاکٹر کو کئی کئی دنوں تک فیض پہنچاتے ہیں- میں اس لیئے بھی چلا گیا کیونکہ خدانخواستہ کہیں ہم جیسے کچھ لوگ ڈاکٹروں سے ایسا گریز کر کے انجینئروں کی طرح اُن کے مستقبل کو مخدوش کرنے کا سبب نہ بن جائیں اور اُن کے بھی رشتے نہ آنے پہ ہم اُن کی دلآزاری کا باعث نہ بن جائیں۔

کلینک پہنچے تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اس دوران بہت دیندار ہوگئے ہیں لیکن پھر بھی اپنی ِ فیس سے وہ یہ راز ہرگز کھلنے نہیں دیتے تاہم اس تقدس تعارف کے لیئے انہوں نے بہت بڑی براق سرسیدی داڑھی رکھ لی ہے۔۔۔سر کو البتہ کلر لگاتے ہیں، یوں سارے امکان جمالیات کو تہس نہس ہونے سے بچاتے ہیں۔ مجھے دیکھا تو باچھیں کھل گئیں "آخاہ اتنے برس کہاں رہے بھائی؟"

میں نے کہا "تاکہ آپکو داڑھی رکھنے کا موقع مل سکے ورنہ شاید ہم جیسی صحبت والوں کا اثر یہ نیک کام نہ ہونے دیتا۔"

کہنے لگے "آپ کے بچے بھی نہیں آتے!"

میں کہا کہ بڑے ہوگئے ہیں سمجھدار ہوگئے ہیں اس پہ اُن کو فوراً ہی بلی کی طرح کی منی سی چھینک آگئی لیکن وہ کافی دیر اپنی ناک بھنبھوڑتے رہے، میں نے البتہ چیک اپ کے دوران اُن کی ریشِ دراز پہ نظر جما کے یہ وضاحت ضرور چاہی کہ "آج کل بھی آپ صرف نسخے ہی لکھتے ہیں یا تعویز بھی؟"

> ہم سمجھتے تھے کہ پولیس وی آئی پی کو اس لئے گھیرے میں رکھتی ہے تا کہ عوام کو ان سے محفوظ رکھ سکے، اب پتہ چلا کہ وہ دراصل عوام سے ان کو بچا رہی ہے۔
> خندہ زن از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

اس پہ انہوں نے ہڑبڑا کر گھڑی دیکھنا اور اسے کان کے قریب لالا کے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔

ذرا ہی دیر میں اُن کے طبی سوال جواب کا سیشن شروع ہوگیا۔

مجھ سے پوچھا ''کیا ہوتا ہے؟''

میں نے عرض کی ''دونوں طرف سے کچھ کچھ ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو مسلسل ہوتا ہی رہتا ہے اور اس وقت یوں چکر آ رہے جیسے میں کسی کے چکر میں ہوں یا جے آئی ٹی کے سامنے بیٹھا ہوں، گلا ملکی معیشت کی مانند آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں گفتار کا غازی ہوں! ایسے میں گلے کا سخت دکھنا کسی المیئے سے کم نہیں۔۔۔لگتا ہے کہ میرے مبینہ مزاح گو گلے کو دبانے کے لیئے حریفوں کا داؤ نہ چلا تو ان کی بد دعا چل گئی۔''

پھر ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا کہ کیا بخار بھی ہوتا ہے، منہ لٹکا کے عرض کیا کہ بس یہی تو گلہ ہے کہ ہمارا بخار کبھی اُس اونچے درجے میں نہیں پہنچا کہ سینا تان کے بتا سکیں یا بہت سرسامی کیفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جی بھر کے اُول فول بکنے کی رعایت مل سکے اور پرانی بھڑاسیں ہی نکال پائیں، اس ایک سو ایک بخار کو آج کل بھلا پوچھتا کون ہے، پھر رہتا بھی وقفوں میں ہے۔

''وقفوں میں۔۔۔؟'' ڈاکٹر صاحب چونکے اور دو دفعہ بڑبڑائے ''وقفہ، یعنی کہ وقفہ؟''

''جی جی کیا اس میں بھی وقفہ ضروری ہے۔'' معاً خدشہ ہوا کہ کہیں بات سبز ستارہ کی گولیوں تک تو نہیں پہنچنے والی۔ وضاحت کی کہ وقفے کی دواؤں کا وقت کبھی کا گزر گیا اور عاجزی سے التماس کیا کہ بس باری کے بخار کی دوا ہی دے دیں، کافی ہے۔

یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب نے دفعتاً اپنی سیٹ چھوڑ دی، مجھے لگا کسی کھٹمل کی کارستانی ہے اور اُن کا کوئی نازک مقام سخت خطرے میں ہے، کہنے لگے'' آیئے آپ اِدھر میری کرسی پہ بیٹھ جایئے اور جب خود ہی خود دوا لکھنی ہے تو تجویز کر لیجیے، سامنے لگے پوسٹروں میں سے جو بھی دوا اپنے لئے مناسب سمجھیں، بس نیچے والا پوسٹر رہنے دیں وہ ''ایام'' کی خرابی سے متعلق ہے۔''

میرا منہ ہمیشہ سے بہت زیادہ نہیں کھلتا لیکن اس بار منہ کھول کے ہنسنے لگا اور اس وقت میرا منہ خود بخود اتنا زیادہ کھلا کہ اصلی بتیسی بھی اتنی باہر آ گئی کہ مصنوعی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ پھر سے اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے تو انہیں میں نے انہیں مزید یہ بتانا ضروری سمجھا کہ دراصل مجھے پرسوں ڈریم ورلڈ کی جمالیاتی فضا میں بھی سوئمنگ پول نہانے یاغنی چھبڑ چھبڑ کرنے کا قطعی موقع نہ ملا اور عید ملن کے نام پہ محض ادبی سی و نیم بزرگانہ سی محفل منعقد ہوئی تو بس جلا کے انتقاماً بہت زیادہ کھا گیا، ویسے بھی اگر کہیں متعدد ڈشیں سامنے ہوں تو میرے اندر کا منصف جاگ اٹھتا ہے اور سب سے انصاف کرنے کو میں اپنے اوپر لازم کر لیتا ہوں، پھر بیگم جیسا جید محتسب بھی دور دور تک موجود نہ ہو تو پھر اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔''

کہنے لگے ''یہ غلط محاورہ بول دیا آپ نے۔۔۔!''

میں نے پوچھا ''صحیح کیا ہے؟''

فرمایا ''دے مارتے ساڑھے چار۔''

چیک اپ تمام ہوا تو صورتحال بہت مایوس کن نکلی۔ ساری ضرر رسانی صرف اسہال اور چیسٹ انفیکشن کے سر منڈھ دی گئی، لگتا تھا کہ خود ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کھودا پہاڑ نکلا چوہا جیسی صورتحال پہ بالکل مزا نہیں آیا کیونکہ اب تو بات محض دو چار دن کی دوا تک ہی محدود رہ جاتی تھی جبکہ انہیں باتوں باتوں میں پتا چل گیا تھا کہ ابھی دو روز پہلے ہی ہمیں تنخواہ ملی ہے، پھر بھی اپنی اور اُن کی ڈھارس بندھانے کے لیئے ہم نے کہا بھی کہ ہم اس قلیل تشخیص کی تاب کیسے لا سکیں گے اور احباب اور گھر والی کو کیا منہ دکھائیں گے؟

ڈاکٹر صاحب پہلی بار متبسم ہوئے اور کھلکھلا کے بولے'' بھائی آپ بس یہی منہ دکھائیں آخر آپ کے ممکنہ پسماندگان اور احباب نے چھپن برس تو آپ کو اسی منہ کے ساتھ بھگت ہی لیا ہے نا!''

نورم خان

بیلن ڈینگی اور ڈینگیں

بیچارے روزناموں پر خواہ مخواہ سنسنی خیزیت کا الزام ہے۔ انصاف سے دیکھا جائے تو ہمارے ہفت روزہ اور ماہنامے بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم نے دل بہلانے کو ہفت روزہ ''عالمی اخبار'' کا تازہ شمارہ کھول لیا۔ ہماری عادت ہے کہ سب سے پہلے ان رنگین تصویروں سے آغاز کرتے ہیں جو ہم جیسوں کے لئے ہی شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بار اتفاقاً ایک ایسا صفحہ کھل گیا جہاں چند ایسے عالمی گھریلو راز افشا کئے گئے تھے جو ہیں تو حقیقت لیکن بقولِ پروین شاکر ''بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی''۔جس تحقیق پر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں،اس کی اشاعت بھی کسی دل جلے کی مرہونِ منت لگتی تھی۔ذرا آپ بھی دیکھیں کہ جگ بیتی کے روپ میں آپ بیتی چھپوانے والے یہ صاحب،شوہر برادری میں بالعموم اور منگیتروں میں بالخصوص،جس صحافتی دہشت گردی کا باعث بنے تھے،ان کی نیت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ وہ سیلاب اور ڈینگی مچھروں کے اس بحرانی دور میں بھی اس طبقے کو ایک اور ٹینشن میں مبتلا کر کے اپنی دال روٹی چلائیں۔ مثلاً وہ تشدد پسند عورتوں کا عالمی موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

☆ جاپانی اور چینی خواتین،مارشل آرٹس اور کراٹے جیسے فنون کو استعمال کر کے اپنے مردوں کو پیٹنا پسند کرتی ہیں۔

☆ روسی خواتین اپنے مردوں کی پشت پر ڈنڈے مارتی ہیں۔

☆ امریکی خواتین سیلف ڈیفنس کو مدنظر رکھ کر اپنے مردوں پر چڑھائی کرتی ہیں۔

☆ برطانوی خواتین جس جگہ چاہیں،شوہر کی ٹھکائی شروع کر دیتی ہیں۔

☆ انڈین خواتین اپنے خاوندوں کو شور وغل مچا مچا کر پھینٹی لگاتی ہیں۔

☆ عرب خواتین بچوں کو ساتھ ملا کر مارنا پسند کرتی ہیں۔

☆ اٹالین خواتین اپنے مردوں پر آہنی ہاتھ سے حکومت کرتی ہیں اور بہت حد تک مار پیٹ بھی کرتی ہیں۔

☆ ناروے کی خواتین سخت مزاج واقع ہوئی ہیں وہ اپنے

شوہر کو مار پیٹ کے دوران بے ہوش بھی کر دیتی ہیں

☆ بنگالی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں پر حاوی رہتی ہیں۔

☆ جبکہ پاکستانی خواتین اپنے شوہرِ نامدار کو جوتے، چمٹے، بیلن اور جھاڑو سے مارتی ہیں......''

اس تحقیق میں خواتین کا سیلف ڈیفنس میں امریکیوں کی ٹھکائی کرنا اور برطانوی خواتین کا گوروں کو ہر جگہ پیٹنا کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ سیلف ڈیفنس میں ہر کمزور ملک پر چڑھائی کرنے اور گوروں کا پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ اس لئے ملک سے باہر کی گوریاں اپنے میاؤں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہیں اس پر ہمیں چنداں اعتراض نہیں کہ ہمارے اکثر اصحاب، جو تعلیم و روزگار کے لئے باہر سدھارتے ہیں، انکی اکثریت کسی نہ کسی گوری کے چکر میں ایک آدھ بار ضرور آتی ہے اس لئے ان کے ساتھ جو بھی ہو، کم ہے۔

مگر معاملہ تب بہت گھمبیر ہو گیا جب ہم پاکستانی خواتین کے طریقۂ واردات پر غور کرنے لگے۔ غور کرتے کرتے ہم بہت دور ماضی میں چلے گئے اور اخبار ہمارے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر ہم نے ایک جھری جھری سی لی اور تب ہمیں اپنے بھانجے قتیل سے بے انتہا ہمدردی محسوس ہونے لگی جس کا رشتہ ایک اچھے بھلے گھرانے میں طے پا چکا ہے۔

لگتا ہے ہم سے پہلے اس نے یہ مضمون پڑھ لیا تھا۔ جبھی کل بلاوجہ کچن میں ایک ایک چیز، خاص طور پر بیلن کا معائنہ کرتا پایا گیا۔ ہم نے یونہی پوچھ لیا'' ارے بھئی...... یہ کیا کر رہے ہو؟'' ہماری آواز سن کر مانو اس کا خون خشک ہو گیا۔ بیلن اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک دھماکے سے فرش پر گرا اور وہ دہشت زدہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔ اس وقت ہم نے اس واقعے پر خاص دھیان نہیں دیا تھا اور بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ مگر اب اس تحقیق کے سامنے آنے سے ساری بات صاف ہو گئی۔ حالانکہ اسے سرے سے تحقیق سمجھنا ہی غلط ہے کہ اس کے مندرجات سے شاید ہی کسی شریف شوہر کو انکار ہو مگر اس کی اشاعت سے شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے والے ہم جیسے شوہروں کو زبردستی اس کے ادراک پر مجبور کرنا یقیناً دہشت گردی ہے۔

آپ تھوڑی زحمت کریں اور فیروز اللغات کا صفحہ ۲۷۱ کھولیں تو وہاں آپ بیلن کے یہ معنیٰ دیکھیں گے:

[بیلن: (مذکر۔اردو) لکڑی کا وہ گول اوزار جس سے روٹی یا پوری بناتے ہیں۔(۲) پتھر کا وہ گول ڈھول نما اوزار جس سے سڑک ہموار کرتے اور چونا وغیرہ پیستے ہیں] اسی سلسلے میں میں ''بیلنے'' کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے [بیلنا: بیلن سے روٹی وغیرہ پھیلانا (۲) روئی سے بنولے علیحدہ کرنا (۳) روئی سے بنولے علیحدہ کرنے کا آلہ۔ بڑا بیلن (۴) گنے کا رس نکالنے کا کولھو]۔ اگر آپ بیلن کی ان تعریفوں پر غور کریں تو حیران رہ جائیں گے۔ ایک تو یہ مذکر ہے اور مذکر یعنی مردوں پر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ خیر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ تاہم اوزار، پتھر، سڑک ہموار کرنا، اردو، رس نکالنا اور کولھو جیسے الفاظ اس کی سنگینی اجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ اگر شترمرغ نہ ہوتا تو ہم مسائل سے منہ چھپانا کس سے سیکھتے؟ اللہ کا شکر ہے کہ مسائل چاہے دہشت گردی کے ہوں یا سیلابی یا پھر ڈینگی مچھروں کی فراوانی کے، ہمیں ان سے نمٹنے کا ایک تیر بہدف نسخہ ہاتھ آ گیا ہے جس پر ہم برسوں سے عمل پیرا ہیں...... یعنی وہی شترمرغ والا نسخہ، لیکن اس سے پہلے فیملی کے ساتھ لندن شفٹ ہونا ہر ایک کے نصیب کی بات نہیں! اللہ کے فضل و کرم سے بارشوں کا سلسلہ رک گیا ہے۔ چند مہینوں میں ڈینگی مچھروں کا پھیلایا خوف و ہراس بھی ختم ہو جائے گا اور ہم ایک بار پھر شترمرغ کی طرح مسائل کی ریت میں منہ چھپائے آرام کر رہے ہونگے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ جب اگلے سال جاگ آئے گی تو ایک بار پھر متاثرین سیلاب کے لئے عالمی امداد اور ڈینگی مچھروں سے نمٹنے کے لئے جنرل کیانی سے توپ مہیا کرنے کی فرمائش کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ کرپشن و دہشت گردی کی وجہ سے دونوں معاملات میں ہمیں منہ کی کھانا پڑے گی اور ہم ایک بار پھر منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔

لیڈیز پارک

نعیم طارق کیرین

فطری شرم وحیا اور ایک مسلمان گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہم لیڈیز پارک کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا لیڈیز پارک گزشتہ چار سال سے ایک گیٹ سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں ہر لیڈیز پارک کے گیٹ پر بحروف جلی یہی تو لکھا ہوتا ہے کہ "**مردوں کا داخلہ سخت منع ہے**" اور تو اور میڈیا والے بھی کنی کترا کر نکل جاتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر کوئی فوٹو کھینچ لی تو بعد میں کون اپنے موبائل فون کی فرنزک رپورٹ کرواتا پھرے گا۔

آپ خواہ ہمیں کتنا ہی دقیانوسی، بنیاد پرست یا روایت پسند کہہ لیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی لیڈیز کے گھر سے باہر قدم رکھنے اور پارک جیسی فضول جگہ پر جانے کے حق میں ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اور شہروں کی دیکھا دیکھی اس کا سنگ بنیاد تو رکھ دیا ہے لیکن تادم تحریر اس کی تعمیر کا کوئی ارادہ نہیں لہذا عام لوگ اس معاملے میں مجبور نہ کریں۔

ہمارا لیڈیز پارک اینگلو انڈین طرز تعمیر ایک نادر نمونہ ہے۔ داخلی دروازے کی پیشانی پر سلوری گرے کلر میں انگریزی کے کیپٹل حروف میں اس کا نام بھی کندہ ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ سورج کی پہلی کرن جب اس پر پڑتی ہے تو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے جس سے باقی دن یہ پارک ایرے غیرے کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ شنید ہے کہ حفظ ما تقدم کے طور پر فی الحال اسے کاغذوں میں مکمل کر لیا گیا ہے تاکہ عین وقت

پر بجٹ کی کمی اور حکومتوں کی تبدیلیوں کے مضر اثرات سے بچا جاسکے۔ مین گیٹ کے اردگرد دونوں طرف مزید دو آہنی گیٹ نصب ہیں جن کا وقتی فائدہ تو سمجھ نہیں آرہا لیکن کل کلاں کو بغیر ٹکٹ، دستی پاس اور وی آئی پیز کو پروٹوکول دینے میں بے حد آسانی ہوسکتی ہے۔

اس عید پر گرمی کی چھٹیاں گزارنے لاہور سے بچوں کی ٹولی کے ساتھ ایک فیملی ہمارے ہاں آئی۔ شام ہوتے ہی بچے ضد کرنے لگے کہ ہمیں پارک لے کر جائیں۔ اب ہم انہیں کیسے سمجھاتے کہ ہمارے ہاں گدھا ریڑیاں پارک کرنے والے پارک تو بے شمار ہیں سیر سپاٹے والے نہیں۔ خیر انہیں لے کر شہر موڑ سے پکنک کا آغاز کیا۔ دہی بھلے، گول گپے کھلاتے ہوئے چوک ٹاؤن ہال سے آئس کریم بھی کھلادی۔ ساتھ ہی لیڈیز پارک کا گیٹ دیکھتے ہی بچے مچل گئے اور کہنے لگے ''آپ تو کہتے تھے کوئی پارک نہیں، یہاں تو اتنا خوبصورت گیٹ بنا ہوا ہے۔''

ہم نے کہا ''میاں بس اسی گیٹ کے ساتھ سیلفیاں بنوالیں وہ بھی جلدی جلدی، پارک کے اندر نہ جانا، یہاں ہیری پورٹر ہوتا ہے۔''

بچے سن کر سہم گئے اور ہم خود ڈر گئے کہ کیا پتہ سچ مچ اندر سے کوئی ''گاڈزیلا'' یا ''ڈائنوسارس'' ہی نہ نکل آئے۔ کیونکہ سینہ گزٹ کے طور پر یہ بات زبان زد عام ہے کہ کئی لوگوں کو اس کے آسیب زدہ ماحول سے سایہ کی شکایت ہوچکی ہے۔ لہذا باقی راستے نہ تو بچوں نے کوئی فرمائش کی اور نہ ہی ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور باقی رات بھر ہمیں آدم بو آدم بو کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر غلطی سے آپ اس تحریر کو لائیک مار چکے ہیں (چاہے دل ہی دل میں) تو احتیاطاً ایک مرتبہ آیت الکرسی اور آخری تین قل پڑھ ہی لیں ــــــ آل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو ــــــ۔ اللہ حافظ

نئے دور کا دوڑ باز

کائنات بشیر، جرمنی

سا رے گا ما

ہم بھی کتنے معصوم تھے، انجان تھے۔۔۔!

موسیقی کو صرف چند لوگوں کی جدی پشتی میراث اور شادی بیاہ کے موقع پر دل بہلانے والے لوازمات سمجھتے تھے۔

دل کو اک انجانے سے افسوس کا احساس رہے گا کہ بچپن بغیر کسی خاص سُر اور رنگ و بُو کے گزر گیا صرف لوری سنتے ہوئے اور وہ بھی بنا سُر کی۔۔ (گھر والے ستے میں ہی چھوٹ گئے)

پھر اقبال کی وہ پہلی غزل تھی،

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

جو دل کی سرزمین پر بارش کے پہلے قطرے کی صورت گری۔۔۔!

شاعری کو جلا دینے کے لیے موسیقی کتنی ضروری ہے اس کا دور دور تک واسطہ نہ تھا۔۔غزل کے ساتھ سات سُروں کا سامان ایسے لگتا جیسے کوئی پتلون کے ساتھ بنیان پہن کر گھوم رہا ہو۔۔کوئی فلمی گیت اچھا لگتا تو اس کا سارا کریڈٹ گلوکار لے جاتا یا جس اداکار پہ فلمایا جاتا وہ ہماری نظروں میں معزز ہو جاتا لیکن شاعر اور موسیقار۔۔؟ نہ جانے وہ کہاں تھے۔۔۔! (جو بچارے لکھتے اور بجاتے ہی رہ گئے)

پاکیزہ، وہ پہلی فلم تھی جس کی خوبصورت موسیقی سب کو چھوڑ کر آگے بڑھی۔کیا خوبصورت بول تھے، شاعری اور مدھر موسیقی۔۔ جب بھی کانوں میں پڑتی، رس گھولنے لگتی۔اداکار، گلوکار، شاعر، موسیقار بیک وقت سب گیت سے جڑے نظر آنے لگے۔

یونہی کوئی مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے۔۔

موسم ہے عاشقانہ اے دل کہیں سے۔۔

چلو دلدار چلو چاند کے پار چلو۔۔

نیا انداز، موسیقی کی روح کو چھوتے کلاسک سے سُر۔۔ ورنہ اس سے قبل سُروں کے ماہر استاد بھی ہماری توجہ کھینچ نہ پائے تھے۔ والد صاحب کی پسند بڑی نایاب تھی۔بیگم اختر، روشن آرا، فریدہ خانم، امانت علی، غلام علی کو سنتے جو ہمیں بالکل متاثر نہ کرتے۔پکا راگ الاپنے والے پکے پکے لوگ۔۔موسیقی ایک خاص سوجھ بوجھ رکھنے والوں اور ماہر استادوں کا کام لگنے لگی۔ہم شش و پنج میں پڑ جاتے کہ ساز پر دھیان دیں یا آواز پر۔۔۔اور شاعر بے چارہ تو کہیں پیچھے ہی دبکا رہتا۔

پاکیزہ فلم میں فلم کے سازوں میں اتنا دم تھا کہ ہم نے فلم دیکھ کر ہی دم لیا۔لتا نے اپنی آواز وفن کا پورا نکھار گیتوں میں ڈالا۔

پر تلاش ابھی جاری تھی۔ہم کسی اور کو ڈھونڈ رہے تھے۔

دراصل شاعر کے حسین خیال اور موسیقار کی بہترین تال پر ۔۔ہم انہیں برملا داد دینا چاہتے تھے۔تبھی پتہ چلا،

گیت، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی نے لکھے ہیں۔

موسیقی غلام محمد اور نوشاد نے دی ہے۔

انہیں داد کا نذرانہ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ فلم مشہور ڈائریکٹر کمال امروہی نے بنائی ہے۔ واقعی کمال نے کمال کر دکھایا تھا۔۔جو لازوال فقرہ فلم میں شامل کیا،

''آپ کے پاؤں دیکھے، بڑے حسین ہیں، اِنھیں زمین پر مت اتاریئے گا، میلے ہوجائیں گے۔۔۔''

ہم نے دل کھول کر سب کو سراہا۔۔۔ابھی تک انڈین فلمیں نہ دیکھنے اور اولڈ از گولڈ موسیقی نہ سننے پر اپنی اگلی پچھلی بے اعتنائیوں کو معاف کروایا۔

وہ دن گئے، سو گئے، ہماری لطیف حس کروٹ لے کر بیدار ہوئی اور انگڑائی لے کر سارے گاما پا الاپنے لگی۔

اب تو جو بھی گیت پسند آتا ہماری نظر اس کے شاعر اور موسیقار پر ضرور پڑتی۔۔۔صرف گلوکار اور اداکار کو داد دے کر ہاتھ جھاڑنا اب بالکل پسند نہ رہا تھا۔۔ہم کسی ناانصافی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتے تھے اور شاعر کے حسین بول دل کی زمین اور موسیقی کے سات سُر قوس وقزح بن کر زندگی میں جھلملانے لگے۔

واہ۔۔۔قدرت نے کیا خوبصورت چیز تخلیق کی ہے۔

اب تو فرصت سے گیت سننے کو جی چاہتا۔آنکھیں بند کر کے دھیان گیان لگایا تو پتہ چلا،

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
ان کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے
جیسے گیت خاص وجد کی کیفیت میں لے جانے لگے۔

موسیقی ہمارے موڈ پر رنگ جمانے لگی تھی۔اگر ہم خراب موڈ میں اداس نغمہ سن لیتے تو دل بے وجہ اداس، ملول ہونے لگتا۔اور

بہت پہلے کی بات ہے، کراچی مرحوم میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان شاعر کو دعوتِ کلام دی گئی تو وہ مائک پر آ کر گویا ہوئے
''ایک غزل کے کچھ اشعار پیشِ خدمت ہیں۔''
فوراً ہی پچھلی صفوں سے ایک آواز آئی ''کس کی غزل کے؟''
شاعر نے متانت برقرار رکھتے ہوئے کہا ''اپنی غزل کے۔''
وہاں سے فوراً جواب آیا ''آپ نے پچھلی دفعہ بھی یہی کہا تھا۔''

اچھے موڈ میں پپی سونگ سر چڑھ کر ناچنے لگتا۔۔بس ابھی تک یہی اس کا منفی اثر سامنے آیا تھا، سوالٹے بانس بریلی کو، ہم نے اس کی چال اسی پر پلٹنی چاہی۔اور گلوکار کی آواز کے زیروبم کی بجائے سازوں پر دھیان دینے لگے تو پتہ چلا، سارے گاما پا دھانی سا۔۔ سے واقف ہوئے بغیر کلاسیکل گیت اور اچھی موسیقی کو ادب و آداب سے سننا ممکن نہ ہوگا۔ استادوں کی استادی جاننے کے لیے اردگرد نگاہ کی تو دیکھا خاندان میں صرف ایک کزن کے پاس گٹار تھا۔بس پورے خاندان میں وہی ایک موسیقی سے آشنا ملا۔ وہ بھی ایسا آشنا جو سب سے چھپ کر گٹار بجایا کرتا تھا۔ ورنہ خاندان میں موسیقی اور وہ بھی سازوں والی۔۔دور دور تک جائے اماں نہ تھی۔

سُروں پر دھیان دینے کے بعد اگلے سبق میں جانا کہ ستار کے تار، پیانو کی آواز، بانسری کے سُر، اب کانوں میں پہلے سے زیادہ ٹھیک طور پر بجنے لگے ہیں۔۔گٹار گانے کو شوخ کر دیتا۔۔ ہم اپنے قدموں کو بمشکل تھرکنے سے بچاتے۔۔طبلہ کلاسیکل گیت کے لیے مخصوص لگتا۔ بانسری کی سُریلی آواز گیت کو سجا دیتی۔ شہنائی کا ردھم اپنا ہی رنگ جماتا۔۔اچانک ایک عام سے ساز نے ہماری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی جو اتنا عام تھا کہ ہم نے اسے کبھی درخور اعتنا سمجھا نہ تھا۔شادی بیاہ میں لڑکیاں، عورتیں پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ پھاڑ کر اس سے اپنی تال ملاتی تھیں۔

جی ہاں اب ہم انجانے میں ہی ڈھولک پر دھیان دینے لگے تھے جو ہر گیت میں ہمیں مختلف انداز سے بجتی محسوس ہونے لگی۔ غور و خوض کے بعد پتہ چلا کہ شوخ گانے کو چنچل بنانے میں ڈھولک

گلوں میں رنگ بھرے بادِنو بہار چلے مہدی حسن نے بہت اچھی گائی ہے اور بہت مشہور ہوئی ہے۔ شنیدن ہے کہ ایک نجی شعری محفل میں فیض صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے۔ نئے کلام کے بعد جب فرمائشوں کا سلسلہ جاری ہوا تو ایک صاحب نے ان سے فرمائش کی کہ فیض صاحب، وہ مہدی حسن والی غزل سنائیے۔

کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کی تھاپ کے اتنے اتار چڑھاؤ سامنے آئے کہ ہم اپنے دل کو سنبھالتے رہ گئے ورنہ وہ بھی ڈھولک کے ساتھ بجنا چاہ رہا تھا۔ اداس گیت کے لیے ڈھولک کچھ پس منظر میں چلی جاتی۔۔ شاعر کے لکھے شعروں کے زیر و بم کو اوپر، نیچے کرنے میں ڈھولک کا صدا کار سے بھی زیادہ بڑا کردار نظر آیا۔

ڈھولک ایک لوک ساز ہے جس کے طبلہ کی طرح گلے بندھے سر نہیں ہوتے، اس کا استعمال قوالی اور بھنگڑا وغیرہ میں کیا جاتا ہے۔ اسے بجانے کے لیے نہ تو کسی خاص استاد کی ضرورت ہے نہ میراثی کی۔ پاکستان میں شادی بیاہ کے موقع پر لوک گیت ڈھولک کی تھاپ پر گائے جاتے ہیں۔ مہندی کی رسم میں ڈھولکی کی تھاپ پر بہت سے جسم و جاں ناچتے ہیں۔۔ پاک و ہند میں اسے بہت سنا اور بجایا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کبھی کسی گورے کو ڈھولک بجاتا نہیں دیکھیں گے۔

اب وقت بدل چکا جو الاپ کو استادوں اور ڈھولک کو میراثیوں کی میراث سمجھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کسی میراثی پر خوش ہو کر روپے اور خلعت کے ساتھ اسے ایک ہاتھی بھی بخش دیا۔ مہاراجہ نے تو بڑی فیاضی دکھائی۔ لیکن میراثی بہت گھبرایا کہ اب ہاتھی کو روزانہ چارہ دانہ کہاں سے کھلاؤں گا اور خدمت کے لیے نوکر کہاں سے لاؤں گا۔ کچھ سوچنے کے بعد میراثی نے ایک ڈھولک ہاتھی کے گلے میں باندھ کر اسے کھلا چھوڑ دیا۔ ہاتھی جس طرح روز قلعے کی ڈیوڑھی پہ حاضر ہوتا تھا اب بھی سیدھا وہیں جا پہنچا۔ تب لوگوں نے اک نیا تماشا دیکھا کہ ہاتھی کان ہلاتا ہے اور ڈھولک خود بخود بجنے لگتی ہے تو اس کے ارد گرد بھیڑ لگ گئی۔ غل غپاڑہ سن کر مہاراجہ نے کھڑکی سے سر نکالا اور ہاتھی کو پہچانتے ہی میراثی کو بلا کر پوچھا ''تم نے یہ کیا سوانگ رچا رکھا ہے؟''

میراثی نے عرض کی ''مہاراج! حضور جانتے ہیں کہ ہم غریب اپنا پیٹ تو پال نہیں سکتے، بھلا ہاتھی کا پیٹ کہاں سے بھریں گے؟ اس لیے جو ہنر خود جانتے تھے، وہی اسے بتا دیا ہے۔''

یہ سن کر مہاراجہ ہنس پڑا اور ہاتھی کو فیل خانے بھجوا کر میراثی کو خزانے سے اس کی قیمت دلوادی۔ سو ڈھولک یہاں بھی کام آئی۔

ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب ایک شادی کے موقع پر ایک عورت کو بڑی خوبصورتی سے ڈھولک بجاتے دیکھا۔۔ اس نے کمال کر دیا تھا اور کمال کرنے کے بعد بھی بے اعتنائی سے کسی معمول کی مانند ڈھولک بجا رہی تھی اور اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ ڈھولک بجانے کے ساتھ ساتھ گیت کے بول اٹھاتی عورتوں کا بھی ساتھ دے۔ ادھر ہم سوچ میں گم تھے کہ اگر کوئی سات سُروں کی پہچان رکھنے والا بندہ، کوئی موسیقار، پروڈیوسر اس کی ڈھولک بجتی سن لے تو شائد فوراً کسی ٹی وی پروگرام کی آفر دے ڈالے۔

صد افسوس، موسیقی کے سات سُروں اور سازوں سے پہچان رکھنے والے بہت سے نایاب لوگ منظر عام پر نہیں آ پاتے۔ پردے کے پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان کا فن داد سے محروم!

ویسے کہہ دینے میں کیا حرج ہے سا رے گا ما پا۔۔ پر مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔

خیر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔۔۔ سات سُر جس نے بھی لگائے ہوں، الاپے ہوں۔ شائقین موسیقی کا بھلا ہی ہوا کہ ان تک وہ چیز پہنچ گئی۔ اب تو روایتی سُروں اور سازوں سے نکل کر موسیقی بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ نئے نئے الیکٹرانک سازوں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ اک طوفان سر چڑھ کر ناچنے لگا ہے۔

ویسے اب ہم بھی ڈھولک کی لے سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ اب ہمارا پسندیدہ ساز ہے ساکسفون۔ (saxophon) ہمارا من جو کبھی کوئل کی کوہو کوہو، پپیہے کی صدا اور مور کے ناچنے سے بہل جاتا تھا۔۔ اب ساکسفون کے ساتھ گانے لگتا ہے، ناچنے لگتا ہے اور من کا باورا پنچھی جھومنے لگتا ہے۔

تھوپ خانہ

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

بہنوں سے معذرت کے ساتھ۔۔۔ مگر جو سادگی پسند ہیں۔

آج جانے کیوں ایک بھاری بھرکم (صنف نازک) نہیں یار غلط کہہ گیا ''بی بی گوشتنی'' کو دیکھ کر دماغ میں کھجلی ہونے لگی کہ ''تھوپ خانہ'' لکھنے کی جسارت کر بیٹھا۔ اگرچہ ہم عمر کے اس حصے میں ہیں، جہاں ''زن گزیدگی'' زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ پہلے ہی نصف بہتر نے کس بل نکال دیے ہوتے ہیں اور غم روزگار میں غلطاں دماغ میں ایسی خرافات سمانے کیلیے کوئی جگہ بھی نہیں ملتی مگر پھر بھی بندہ بشر ہیں، مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے، چاہے لاکھ نگاہیں نیچی کیے رکھیں۔

توسجنو! وقوعہ کچھ یوں ہے کہ صبح دال روٹی کے چکر میں نکل پڑے۔ عام سواریوں پر فرائضِ منصبی نبھانے اور رزق حلال کرنے۔ بقول شخصے گیارہ نمبر والی وین پر سوار تھے (یعنی پیدل تھے) کیونکہ اپنی گاڑی تو خیر سے ایک عدد ایکسیڈنٹ کے بعد مستری خانے کے رحم وکرم پر تھی اور اس کے ہتھوڑوں کی تعزیر کی منتظر تھی، اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی، فلائنگ کوچ کو اشارہ کر کے عازم سفر ہوئے۔

اِن دنوں ہماری ڈیوٹی بھی ایسی جگہ پر ہے جو (ناگمان) سے موڑ کاٹ کر شیر درہ پہنچا وہ بھی چائینز چنگچیوں کی ٹرٹراتے ہچکولے کھاتی سواری میں جو صبح کا سب کھایا پیا ہضم کرنے کیلیے مفید مشق ہے۔

ڈیوٹی پر تو خیر وقت پر پہنچے اور ضروری اُمور کی انجام دہی (قیلولہ اور گپ شپ کہ روزِ آفرینش سے یہی سرکاری ملازم کی مشقت ٹھہری) کے بعد دوپہر دو بجے واپسی پر جب ایک سٹاپ پر کھڑے کسی شناسا سواری کے منتظر تھے تو اسی اثناء میں ایک لش پش توپ نما عورت نزدیک آن کھڑی ہوگئی۔ ہماری غیر محرم، غیر ارادی نگاہ جو اُن مرقعِ لحم پر پڑی تو چہرے پر دھوپ کی تمازت سے چٹختا میک اپ دیکھ کر تھوپ خانہ لکھنے کیلیے خاصا مواد مل گیا۔ عجیب بات تو یہ ہوئی کہ ہم مع سفید ریش کی نفسیاتی سہولت کے دو گھنٹے کڑکڑاتی دھوپ سہہ کر بھی کسی سواری میں جگہ نہ بنا سکے اور دوسری طرف وہ بی بی صاحبہ آناً فاناً ایک ائیر کنڈیشنڈ کار میں سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔

ہمارے ایک دوست کی بیوی نے گھر میں بیوٹی پارلر کھول رکھا ہے۔ جب کبھی ہماری والی شامتِ اعمال اُن کے ہاں جاتی ہے تو ایسے ایسے نایاب قصے لے کر لوٹتی ہے کہ مجھے لوٹ پھوٹ کے بحران میں مبتلاء کر دیتی ہے۔ پچھلے دنوں کہہ رہی تھی کہ ایک کالی کلوٹی چہرہ شریف پر "میک اپ کا پلستر" تھوپنے آگئی تو میری سہیلی نے اُن کے خام مال جیسے چہرے پر وہ وہ لوشن آزمائے کہ رنگت یا تو سیاہ کوئلہ تھی اور یا ایک دم سے گوری چٹی ہوگئی، تبھی مجھ پر عقدہ کھلا کہ یہ شوہر ہم جیسیوں کو خاطر میں نہ لا کر اِن جیسی تھوپ

غدر کے بعد مرزا غالب بھی قید ہوگئے۔ ان کو جب وہاں کے کمانڈنگ آفیسر کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا گیا تو کرنل نے مرزا کی وضع قطع دیکھ کر پوچھا "ویل ٹم مسلمان ہے۔"
مرزا نے کہا "جناب، آدھا مسلمان ہوں۔"
کرنل بولا "کیا مطلب؟"
مرزا نے کہا "جناب شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔"

چیزوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں اور اِن کے شوہر کیوں اِن کی مدارات بجالاتے ہیں جبکہ موصوفہ کہیں سرکاری استانی بھی ہو۔

غضب خدا کا تو یہ ہے کہ ایسی خواتین چہرے پر "تھوپ خانہ" صرف گھر سے باہر نکل جانے کی غرض سے کرواتی ہیں ورنہ تو گھر میں ایسی ہیت بنائے رکھتی ہیں کہ چڑیلیں بھی دیکھیں تو "باؤ، باؤ" چلاتی پھریں۔

ایک اور کہانی سناتی ہوئی بیگم بولی کہ ایک نازنین مونچھیں منڈوانے یعنی تھریڈنگ کروانے آدھمکی تو خیال آیا کہ یہ بچاری بھی کس مرض میں مبتلاء ہے۔ تار جیسے بال اکھاڑنا۔۔۔ اففف۔۔۔ کتنی تکلیف دہ بات ہوگی مگر اُن خاتون کی بلا جانے، اس قدر آرام سے تشریف فرما تھیں گویا راحت افزاء مساج کیا جا رہا ہو اُن کا۔ تب اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری اِس عذاب سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔

ویسے ہماری والی بھی جب کہیں سے ہتھیائے گئے معمولی نوعیت کے گھریلو ٹوٹکے اپنے آپ پر آزما کر اس موزی قسم کے میک اپ کی مرتکب ہوتی ہے تو ہمیں دیکھ کر بہت عجیب سا لگتا ہے۔ ہم اکثر منہ پھیر کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ بھلی مانس، جا منہ ہاتھ دھو کر آ نہیں تو مجھے ابکائیاں آنے لگی ہیں۔۔۔ اور ساتھ میں لقمہ دے کر کہتا ہوں کہ فطری حسن ہی اصل چیز ہے، مجھے تم اِسی طرح سے قبول ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی شادی بیاہ پر بھی وہ اپنے آپ پر محض نئے لباس کے سوا کچھ بھی نہیں تھوپتی، اس لیے جیب پر قدرے بھاری بھی نہیں پڑتی۔

دیکھا یہ گیا ہے کہ خصوصاً شادی بیاہ میں ہماری گاؤں کی خواتین چہرے پر اس قدر میک اپ تھوپ دیتی ہیں کہ چلتی پھرتی

چڑیلیں لگتیں ہیں، یا ہوسکتا ہے کہ صرف مجھے ہی ایسا لگتا ہو کیونکہ گرمی میں دھوپ کی حدت سے سب کچھ ڈھ جاتا ہے اور گھنٹہ بھر کا حسن یعنی تھوپ خانہ عجیب منظر پیش کرتا ہے جبکہ سردی میں گھریلو میک اپ چیخ چیخ کر بالکل ایک پیاسی چٹخی ہوئی زمین کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم اس مصنوعی حسن کی اس قدر مخالفت کیوں کر رہے ہیں تو جناب حکمِ خداوندی ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کے لیے بناؤ سنگھار کریں نہ کہ باہر نکل کر غیر مردوں خصوصاً نوجوانوں کے آتشِ شوق کو بھڑکائیں اور یہ عمل رات کو بہتر ہے تاکہ شوہر حضرات کے دل میں اپنی عورتوں کے لیے محبت بڑھے لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی اُلٹ ہے۔

قارئین کرام، اِس بات کا تو مشاہدہ آپ لوگ لگ بھگ روزانہ کرتے ہوں گے کہ راستے پر چلتی پھرتی ”تھوپنیا“ ولی اللہ قسم کے افراد کا ایمان بھی ڈانواڈول کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں مگر عورتوں کی فطرتِ ثانیہ کا کیا کیجیے کہ اپنے من بھر لیدر بیگ میں بھی سوائے سامانِ آرائش اور چند مڑی تڑی ریزگاری کے، کچھ اور رکھنا گناہِ کبیرہ سمجھتی ہیں۔ چور جب ان کے پرس سے منہ کالا کرتے ہیں تو بعد ازاں اپنی بوٹیاں ہی نوچ کر رہ جاتے ہوں گے۔

ایک تو ہم ابھی تک عورت کے اِس نفسیاتی مرض کا سراغ نہ پا سکے ہیں کہ جب بھی موقع ملتا ہے، چاہے بس میں ہوں یا ٹیکسی میں، وینٹی بکس کا مرر کھول کر کم از کم لپ سٹک ضرور تازہ کرتیں رہتیں ہیں اور بعض ماڈرن تھوپ خانیاں تو ایسی عقلمند ہیں کہ کار ڈرائیونگ کے دوران بیک ویو مرر تک کو استعمال کرتے ہوئے میں ایمرجنسی میں پاؤڈر لگا لیتی ہیں۔ دریں اثناء چاہے مخالف سمت میں کوئی گاڑی ہی کیوں نہ ٹکرا جائے۔

عموماً بڑے اور ماڈرن شہروں میں تو تقریباً ہر گلی میں کوئی نہ کوئی بیوٹی پارلر کھلا ہوا ہے جہاں مرد عورتوں کے چہروں سے ایسے کھیلتے ہیں جیسے یہ اُن کی اپنی والی ہوں جبکہ ٹٹو خصم سامنے والے صوفے پر بیٹھے دوسری عورتوں سے حظ اٹھانے کی مصروفیت میں بُری طرح مبتلاء رہتے ہیں۔

دورِ جدید میں تو مساج سینٹرز بھی کھل چکے ہیں، جہاں سب کو پتہ ہے کیا ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ مساج سنٹرز ایک اسلامی معاشرے پر بدنما داغ ہیں مگر جب غیرت کا جنازہ ہی نکل چکا ہو تو پھر کیا کم اور کیا زیادہ۔ سننے میں آیا ہے کہ اب یہ مسخرے نوجوان بھی اپنے ساتھ لڑکیوں سے کم نہیں کرتے اور چہروں ہاتھوں حتیٰ کہ اعضائے رئیسہ تک پر ٹیٹوز کے نام پر عجیب نوع کے نقش و نگار بناتے پھرتے ہیں۔ یعنی تھوپ خانہ انڈسٹری کے بھاگ کھل گئے ہیں۔ اقدار کا جنازہ تو ویسے بھی نکل چکا ہے۔

اب شادی حال دیہاتوں تک پھیل چکے ہیں اور تقریبات کے نام پر نو دولتیے اپنی بیگمات بہنوں بیٹیوں کو غیروں اور رشتہ داروں کے درمیان آٹھ نو ہزار کا میک اپ کرا کے ملی جلی ہنگامہ آرائیاں برپا کرتے ہیں اور اس قسم کے رقص و سرود کون جانے کہ کس کی غیرت کس کی جھولی میں گرتی رہتی ہے، اگلوں کو مطلق پروا نہیں۔ اب تلخ نوائی سے بچنے کے لیے صرف اس قدر کہنا پسند کروں گا کہ اگر آپ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں تو کم از کم اپنی غیرتوں پر تھوپ خانے لاد کر دوسروں کے رحم و کرم پر مت چھوڑیں یا پھر واویلا بعد از مرگ نہ کیجئے گا کہ فحاشی پھیل رہی ہے۔

اگر معاشرہ میڈیا سے متاثر ہو کر ایسا کرتا پھرتا ہے تو یہ بات اپنی گرہ میں باندھ رکھئے کہ کہ میڈیا ایک طاغوتی دھوکے کا نام ہے، وہاں جو گلیمر دکھایا جاتا ہے، عمومی زندگی میں ایسا کرنا آبیل مجھے مار والی بات کے مترادف ہے۔

آخر میں جانے کیوں میرا دل شدت سے چاہتا ہے کہ توپوں کا رُخ تھوپ خانوں سے موڑ کر اُن حضرات کی طرف کر کے اُنہیں اکیس توپوں کی سلامی پیش کردوں جو اپنے اہل و عیال کو ہزار پردوں میں چھپائے اپنی مذہبی خاندانی معاشرتی احیاء کو سنبھالے ہوئے ہیں اور کھسرا نما خاندان کے بڑوں کو بحیرۂ مردار لے جا کر نمکین پانی میں اِتنے غوطے دوں کہ اپنی آنے والی نسلوں کو نصیحت کرتے پھریں کہ بیٹا، اپنی عورتوں کو نکیل ڈال کر رکھو ورنہ بحیرۂ مردار میں مردار کر دیئے جاؤ گے۔

نیاز محمود

ہاتھ

جس طرح جانور کے گلے میں رسی ڈال کر اپنے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے اسی طرح انسان کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ چلنے پہ آمادہ کیا جاسکتا ہے۔۔۔ ہاتھ پکڑنا معنوی لحاظ اچھا بھی ہے اور برا بھی۔۔۔ اگر ہاتھ صنف نازک کا ہو تو اسے شوق سے پکڑتے ہیں لیکن اس کا تاثر اچھا نہیں ہوتا۔

ہمارے ایک دوست ہاتھ پکڑنے میں خوب ماہر ہیں اور کمال کی بات تو یہ کہ اس کی پکڑ ایسی ہوتی ہے جسے ثابت کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ آپ جتنے چاہو گواہ لے آؤ، اُلٹا آپ ہی پھنسو گے۔

ہاتھ پکڑنا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے، بعض اوقات کسی کو کسی کام سے روکنے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور ایسا بھی ہے کہ کسی کی پیروی کرنے کے لیے بھی اسی کا سہارا لینا جاتا ہے۔

کسی کسی کے ہاتھ گندے بھی ہوتے ہیں اور اکثر لوگ ایسے ہاتھ پکڑنے سے کتراتے ہیں لیکن بعض لوگ خواہ کچھ بھی کریں اپنے ہاتھ صاف ہی رکھتے ہیں اور یہی ان کی صفائی پسندی کی بہترین دلیل بھی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر کام اتنی صفائی سے کرتے ہیں کہ ہاتھ صاف کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

ہاتھوں پہ میل بھی آتا ہے جسے پیسوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کو کام کاج سے چڑ ہوتی ہے، ایسے لوگ اناج کے دشمن ہوتے ہیں اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہتے ہیں۔

ہاتھ لمبے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی۔۔۔ قانون کے ہاتھ بہت لمبے خیال کیے جاتے ہیں لیکن اس سے بھی لمبے ہاتھ بعض اوقات دیکھنے میں آتے ہیں۔۔۔ قانون کے ہاتھ صرف لمبے ہی ہوتے ہیں چھوٹے، پتلے اور ہلکے ہاتھ کا تصور قانون میں موجود نہیں۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کے لمبے ہاتھ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں کو نمٹانے میں اِتنے بزی ہوتے ہیں کہ بڑے

بڑے کاموں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں رہتا۔۔۔ قانون کے ہاتھ ہمیشہ کیڑے مکوڑے اور حشرات مارنے کا کام احسن طریقے سے کرتے ہیں بڑی بڑی مچھلیوں اور اژدھوں کو مارنا ان کے شایانِ شان خیال نہیں کیا جاتا۔

ہاتھ بڑھائے بھی جاتے ہیں جس سے دوستیاں جنم لیتی ہیں۔شروعات کی خاطر اکثر ایسا کیا جاتا ہے۔۔۔اسی طرح ہاتھ کھینچے بھی جاتے ہیں۔کسی کام کو روکنا مقصود ہو تو ہاتھ پیچھے کر لیتے ہیں۔معاملے سے علیحدگی بھی ہاتھ کھینچ کی جاتی ہے۔کبھی کبھار دوسروں کے ہاتھ بھی کھینچے جاتے ہیں۔

ہاتھ سے کئی طرح کے کام لیے جا سکتے ہیں۔کسی کام کی اچھائی یا برائی اسی کی مرہونِ منت ہے،یعنی ہاتھ ڈال کی خراب بھی کیا جاسکتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار بھی کرایا جا سکتا ہے۔ہاتھ بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں ہوتا بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔

کسی کسی کے ہاتھ دودھ کے دُھلے ہوتے ہیں،ایسے لوگوں کے پاس یا تو پانی نہیں ہوتا یا دودھ کی فراوانی ہوتی ہے۔

ہاتھ کی اندرونی سطح پر کچھ لکیریں ہوتی ہیں۔۔جن کی ساخت ہر ایک کے لیے مختلف ہوتی ہے۔انھی لکیروں کے اندر کسی فرد کی پوری زندگی کا نقشہ ہوتا ہے۔ان میں چھپے کوڈ ز ان کے افعال کے ضامن ہوتے ہیں۔جس طرح کسی مشین کے ساتھ اس کا مینوال ہوتا ہے اور اس مینوال میں بتائے اصولوں اور طریقہ کار کے مطابق وہ مشین چلتی ہے یوں سمجھ لیں ہاتھ کی یہ لکیریں بھی انسان کا مینوال ہے اور اسی کے مطابق یہ چلتا ہے۔

ہر ہاتھ کی پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جو ساخت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں لیکن درد سب کا ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔انھی انگلیوں کے ذریعے اکثر اپنے مطلب کا گھی نکالتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کو ٹیڑھا بھی کیا جاتا ہے۔

ہاتھوں کی زنجیر بھی بنائی جاتی ہے جو اگر غرض اور لالچ کے جراثیم سے محفوظ ہو تو ان کو توڑنا ناممکن ہو جاتا ہے اور ان کی مدد سے بڑے سے بڑے کام ممکن ہو جاتے ہیں لیکن افسوس کہ یہ زنجیر بسا اوقات غرض، لالچ اور بدگمانی جیسے مہلک بیماریوں کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اپنی طاقت کھو دیتی ہے۔ویسے بھی طاقت کو ہمیشہ زوال کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے،جب آندھی آتی ہے تو بڑے سے بڑے درخت جڑ سے اکڑ جاتے ہیں جب کہ چھوٹے رہ جاتے ہیں۔طاقت ور فصل آندھی کا زور برداشت نہیں کر پاتی اور اپنے بار کی تاب نہ لا کر زمین پر لیٹ کر تباہ ہو جاتی ہے،یوں طاقت اور غرور کا سر نیچے ہو جاتا ہے۔یہ سب نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لیے لیکن ہمیں تو احساس ہی نہیں۔اگر کوئی نصیحت کرے بھی تو عمل کی بجائے اس کا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانے کا گلہ کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عابد علی

تکیہ

تکیہ ہمارے دل و دماغ کی تمام تر پریشانیوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔

دیکھنے اور سننے میں تو انتہائی ضروری شے لیکن اس پر تکیہ کئے بغیر آپ سکون کی نیند نہیں سو سکتے۔ جی ہاں تکیہ جسے سندھی زبان میں وہانو، انگریزی میں پلو، فارسی میں بالشت، ملیالم میں تالیغا، بنگلہ میں بالیش، تگالو میں ٹوٹو، عربی میں موخدہ کہا جاتا ہے۔ جب ہم تمام دن بھر کی مصروفیات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے اور جب اپنے ہدف کو مکمل کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ذہن پر ہزار ہا تفکرات اور پریشانیاں سوار ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب ہم اپنے بستر پر جاتے ہیں تو نیند کا نام و نشان بھی تصور میں نہیں ہوتا۔

ایسے میں تکیے پر اپنا سر رکھتے ہیں تو اس کا نرم و نازک وجود اور لچک ہمیں دلی فرحت بخشتی ہے۔ یوں تکیہ ہمارے دل و دماغ کی تمام تر پریشانیوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور بدلے میں پرسکون نیند کا تحفہ ہماری نذر کرتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر دکھ، دھوکا اور تکلیف گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ جن سے ہم پیار کرتے ہیں، جن پر بھروسہ اپنی ذات سے زیادہ بڑھ جاتا ہے، جن کے بنا زندگی کا تصور بھی برا لگتا ہے، پھر ان سے بہت سی امیدیں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں اور دل و دماغ ان پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ جب ایسے میں اپنے ہی دھوکا دے جاتے ہیں تو انسان ایک ایسے گلاب کی مانند ہو جاتا ہے جسے کسی چاہنے والے نے بے دردی سے توڑ دیا ہو اور سرِ راہ تن تنہا پھینک دیا ہو۔ جس میں مہک تو بہت ہوتی ہے مگر زندگی کی رونق نہیں ہوتی۔ اس دوراہے پر انسان کسی کا نہیں رہتا بس تنہائی اور خاموشی ہی اسے راس آتی ہے۔ ایسے میں صرف تکیہ ہی ہمارا غم گسار بن جاتا ہے اور جب ہم اس پر اپنا سر رکھتے ہیں تو لاتعداد آنسوؤں کی لڑی ہماری آنکھوں سے بہہ نکلتی ہے اور یہ تکیہ

کسی رازدار کی طرح سارے آنسو، سارے غم، ساری تکلیفیں اپنے اندر جذب کرلیتا ہے، پھر رات گئے جب آنکھوں سے اشکوں کا ساون چپکے سے نیند کی آغوش میں لے جاتا ہے اور صرف یہ تکیہ ہی ہے جو ہماری محرومی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور پھر اپنے چاہنے والوں کی کمی کی شدت آہستہ آہستہ دم توڑنے لگتی ہے تو بالآخر ہم رو کر، تھک ہار کر اپنا سر تکئیے پر رکھ کر سو جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ نیند تو ایسی چیز ہے جو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

پرانے زمانے میں جب فیشیل ٹشو ایجاد نہیں ہوئے تھے، بے چارہ تکیہ ہی عاشقوں کے آنسو جذب کیا کرتا تھا اور ان تکیوں پر خواتین کڑھائی کے ذریعے بیل بوٹے بنا کر یہ اشعار لکھا کرتی تھیں ۔

بلبلو شور نہ کرو میرے صنم سوتے ہیں
تم تو اڑ جاتی ہو وہ مجھ پہ خفا ہوتے ہیں

یا پھر ۔

کوشش کروں، ہزار نہ آئیگی مجھ کو نیند
تکیہ ہے نرم، بیوی کا برتاؤ سخت ہے

بے معنی و بے محل جملوں یا الفاظ کے بارے میں جن کو بار بار دہرایا جائے ''تکیہ کلام'' کہتے ہیں۔ بقول داغ دہلوی ۔

ہر وقت داغ کا یہی تکیہ کلام ہے
میرے حضور مجھ کو تو نگر بنائیں گے

تکیہ کلام ابھی اور بھی ہیں جیسا کہ ''فرمائیں جی، لو کرلو گل، جائے جہنم میں، ہاں جی، واہ کیا خوب، جانے بھی دو، غصہ تھوک دو، مٹی پاؤ جی، قسم سے، کمال ہے، اللہ جھوٹ نہ بلوائے، توبہ توبہ'' کے علاوہ انگریزی میں بھی ''ونڈرفل، شٹ اپ، آئی سی، ایگزیکٹلی، ایکچوئلی، بائے دی وے، بائی گاڈ، او مائی گاڈ اور آف کورس'' وغیرہ۔

ہائے رے تکئیے تری شان تو کبھی سرہانہ ہے تو کبھی درباروں میں گاؤ تکیہ پھر کیوں نہ تجھ پہ تکیہ کریں۔

محمد اشفاق ایاز

لال بیگ

یہ میری پہلی نوکری کی دفتر میں حاضری کا پہلا دن تھا۔ دفتر کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی لمبا برآمدہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ایک نادر الوجود شخصیت پر نظر پڑی۔ درمیانہ قد، جسم پتلا، سر اور مونچھیں سرخ مہندی سے رنگی ہوئی، رنگ تھوڑا سفید لیکن سرخ مہندی کے شیڈ نے اسے تانبا بنا رکھا تھا۔ وہ برآمدے کے آخری کونے میں ایک میز پر ڈھیر سارے خط اور لفافے رکھے، انہیں گوند سے بند کر کے ان پر سرکاری ٹکٹیں زبان پر رگڑ کر تھوک سے چسپاں کر رہا تھا۔ اس کا یہ فلسفہ چند دن بعد سمجھ میں آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ٹکٹوں کی پشت پر پہلے ہی گوند لگی ہوتی ہے پھر مزید گوند ضائع کرنے کا فائدہ؟ پاکستان پہلے ہی غریب ملک ہے۔ بچت کرنی چاہئے'' یہ اس کا تکیہ کلام بھی تھا۔ جو وہ اکثر گفتگو میں استعمال کرتا تھا۔

تو یہ میرا دفتر میں پہلا دن تھا۔ برآمدے کے آخر میں ہیڈ کلرک صاحب کا کمرہ تھا۔ ان کے ذریعے بڑے صاحب کے سامنے پیشی ہوئی۔ وہ اس وقت سگریٹ کے کش ایسے لگا رہے تھے جیسے نہر کنارے بیٹھا کوئی فلسفی کائنات کے اسرار و رموز پر غور کر رہا ہو۔ میری ان کے کمرے میں آمد سے ان کے خود ساختہ تخیل میں ہلچل پیدا ہوئی۔ ''فوراً بولے'' یہ تمہاری پہلی نوکری ہے۔ دھیان سے کام کرنا، شکائت کا موقع نہ ملے'' اور ہاتھ سے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس موقع پر مجھے وہ دلہن یاد آ گئی۔ جسے رخصتی کے وقت اس کا باپ بآواز بلند یہ کہہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے'' سب کو خوش رکھنا۔ شکائت کا موقع نہ ملے''۔ اور دلہن روتے پیٹے یا ہنستے کھیلتے اپنے سسرال روانہ ہو جاتی ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ اور اپنے ساتھ والی میز میرے نام کر دی۔ اس پر ایک پرانا ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ میز کے دائیں طرف دو دراز بھی تھے۔ کمرے میں ایک ہی چھت والا پنکھا تھا۔ جس کا زیادہ تر حصہ ہیڈ کلرک صاحب کی طرف تھا۔ وہ نیم دلی سے ایسے جھول رہا تھا گویا اسے خودکشی کے لئے لٹکنے کے لئے لگایا گیا ہو۔ میں نے اپنے ذاتی کاغذات، جو گھر سے لے کر آیا تھا، رکھنے کے لئے دراز کھول کر دیکھے۔ نیچے والا دراز بالکل خالی تھا۔ جبکہ اوپر والے دراز میں ایک پڑیا رکھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کسی کلرک بادشاہ نے امرود کھانے کے

لئے نمک رکھا ہوگا۔ پڑیا کو کھولا تو جو نظر آیا میرے لئے بالکل ہی غیر متوقع تھا۔

پڑیا میں پورے چار لمبے اور توانا لال بیگ تھے۔ تین کا غالباً دم گھٹنے سے دیہانت ہو چکا تھا۔ جبکہ چوتھا نیم مردہ حالت میں اپنی اگلی دونوں ٹانگیں ہلا ہلا کر اعلان کر رہا تھا ''اک ستم اور میری جاں، ابھی جاں باقی ہے''۔ ابھی میں حیرت اور غصے کے سمندر میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ کانوں میں ہیڈ کلرک صاحب کے دبے دبے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے قہقہے کا گلا گھونٹنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں یہی سمجھا شائد یہ دفتر میں پہلے دن کے استقبال کے مذاق کا ہی حصہ ہو۔ میں نے بھی اپنی خفت اور غصہ دباتے ہوئے یوں مسکرانے کی کوشش کی جیسے چارلی چپلن اپنی اکثر فلموں میں اپنے بے عزتی کو دانت نکال کر ہضم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے پڑیا سمیت چاروں لال بیگ کمرے سے باہر برآمدے میں پھینک دئے۔ جو سیدھا مہندی والی تانبا شخصیت کے میز کے عین سامنے جا گرے۔ جو ان کی نظروں کے راڈار پر فوراً آ گئے۔ غصے سے ان کا چہرا مزید تانبا ہو گیا۔ ایک ہاتھ میں قینچی اور دوسرے میں بڑا خاکی لفافہ، جسے وہ مختلف حصوں میں کاٹنے والے تھے، اٹھائے میری میز کے سامنے آ کر رک گئے۔ ہیڈ کلر صاحب کو اس خطرے کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ کہ میں نے دشمن کے علاقے میں جو بم پھینکے ہیں۔ اس کے ردِّ عمل میں دشمن کی توپ کا منہ بھی کھلے گا۔ انہوں نے یکدم کرسی سمیت منہ دوسری طرف کر کے لیجر بک کی یوں ورق گردانی شروع کر دی جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو۔ اب دشمن کے سامنے صرف ایک ٹارگٹ یعنی میں بقلم خود رہ گیا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے دو تین بابو بھی آ کر ہمارے کمرے کے باہر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''یہ تم نے پھینکے ہیں''، تانبا شخصیت بولی۔

''جی کسی نے اس دراز میں پہلے ہی رکھے ہوئے تھے''۔ میں حالات کی نزاکت سے بے خبر تھا۔

''جی چاہتا ہے تمہاری گردن مروڑ دوں''۔ وہ بولے۔

ہیڈ کلرک صاحب جو منہ دوسری طرف کئے ہنسی دبائے بیٹھے تھے، انہوں نے کرسی اور اپنا رخ ہماری طرف کیا۔ اور تانبا شخصیت کو دیکھ کر بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

''میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ آج اس کا پہلا دن ہے۔ آج معافی'' یہ تنبیہ کرتے ہوئے وہ اپنے میز پر جا بیٹھے۔

کمرے کے باہر بابو لوگ تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ پر تماشہ نہ ہوا۔ کھل کر ہنستے ہوئے اپنی اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت تک میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بابوؤں کے کمرے سے ایک اور بزرگ ٹائپ نادر شخصیت برآمد ہوئی۔ اس نے برآمدے میں پڑے بیچ سے اخبار اٹھایا۔ اور ان چاروں لاشوں کو اخبار پر لاد کر برآمدے سے باہر پھینک آیا۔ اور آ کر میری میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہنستے ہوئے سلام کیا۔ پیار سے ہاتھ ملایا اور ہنستے ہوئے بولا ''یہ بم آپ نے پھینکے تھے؟'' اور جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے لئے یہ مسئلہ بہت گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔

جب دیکھا کہ مطلع صاف ہو چکا ہے اور سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ تو میں نے ہیڈ کلرک صاحب سے پوچھا یہ سارا معاملہ کیا ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب شائد ابھی تک اسی بات کے منتظر تھے کہ میں ان سے کچھ پوچھوں۔ میرے سوال پر انہوں نے اپنے سامنے کھلی فائل سے سر اٹھایا اور عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے۔ قہقہہ لگانے کی کوشش کی مگر قہقہہ پوری طرح نکلا نہیں۔ جس طرح کسی بوڑھے کے گلے میں بلغم اٹک جاتی ہے۔ تھوڑی دیر مجھے تکتے رہے، پھر باہر نظر دوڑائی۔ اور دھیمی آواز میں بولے ''برخوردار۔ ابھی چپکے بیٹھے رہو۔ تمہیں خود پتہ چل جائے گا۔''

اگلے دو چار دن میں محتاط ہو گیا۔ اور دفتر کے ماحول کو سمجھنے کے لئے خود کھوج کاری کرتا رہا۔ اس دوران اگر مجھے کہیں لال بیگ پڑا ہوا یا رینگتا نظر آتا تو دل ہی دل میں اسے سلام پیش کر کے اپنی سیٹ پر آ بیٹھتا۔

میری چند روزہ تحقیق کے مطابق تانبا مارکہ شخصیت کا نام اس

کی والدہ محترمہ نے بعد از مشورہ اس کے ابا جان ''محمد لال'' رکھا تھا۔ جو خاندانی سابقوں اور لاحقوں کے اضافے کے ساتھ ''مرزا محمد لال بیگ'' ہو گیا۔ پھر جوں جوں مرزا محمد لال بیگ جوان ہوتا گیا، پتھر کی طرح لڑھکتے لڑھکتے گول ہو کر صرف ''لال بیگ'' رہ گیا۔ نام رکھائی کے وقت تو اماں جان کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے چکنے چکنے پات کو آئندہ زندگی میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس دور میں گھروں میں لال بیگ نہ پائے جاتے ہوں۔ یا گاؤں میں اس کا کوئی اور نام ہوتا ہو۔ یہ تو شہر کی کرامات تھی کہ یہاں باورچی خانوں، غسلخانوں اور سٹور روم میں چیونٹیوں اور مکوڑوں کے ساتھ لال بیگ نام کی مخلوق بھی وافر تعداد میں پائی جاتی ہے۔ مرزا لال بیگ دفتر میں بطور قاصد بھرتی ہوئے۔ ان کا کام دفتر میں آنے والی ڈاک کو احتیاط سے کھولنا اور متعلقہ فائلوں میں رکھ کر ہیڈ کلرک صاحب کی خدمت میں پیش کرنا جبکہ دفتر سے جانے والی ڈاک کو دھیان سے لفافوں میں بند کر کے قریب ہی واقع ڈاک خانے میں دے آنا تھا۔ پہلے پہل تو ان کے مہندی رنگے سرخ بالوں اور تانبے جیسی رنگت پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ مشہوری تو اس وقت ہوئی جب دفتر کے ایک سینیئر کلرک سرور کا بیٹا کالج سے گھر جانے کی بجائے دفتر آ گیا۔ اس کی نظر جب مرزا محمد لال بیگ پر پڑی تو اس نے اپنے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ سرور پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ دوسروں کے زبردست استفسار کے باوجود اس نے صرف اتنا کہا ''کل بتاؤں گا''۔ اور بیٹے کے ساتھ چلا گیا۔ یہاں یہ بتانا از حد ضروری ہے کہ بابو سرور اور مرزا لال بیگ میں کچھ عرصہ سے کھٹ پٹ چلی آ رہی تھی۔ بابو سرور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ مرزا لال بیگ کی جی بھر کر بے عزتی بھی کرے اور اس پر جوابی وار بھی نہ ہو۔

دوسرے دن دفتر کے کچھ بابو سرور کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دن وہ لیٹ آیا تو اس کا چہرہ فتح مندی کے احساس سے یوں چمک رہا تھا جیسے اسے امریکہ میں سفیر تعینات کر دیا گیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ بس سارا راز اس لفافے میں تھا۔ اس نے بابوؤں کے کمرے میں داخل ہونے سے قبل دروازے کی

دہلیز پر ہاتھ میں پکڑے خاکی لفافے کو الٹا۔ اس میں سے دو تین لال بیگ تیزی سے نکلے۔ ان میں سے ایک تیزی سے دروازے کی درز میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ جبکہ دو مرزا لال بیگ کی میز کی طرف دوڑے۔ سرور نے جلدی سے جوتی اٹھائی اور ''تیرے لال بیگ دی ماں نوں۔۔۔۔۔'' گالیاں دینا شروع کر دیں۔ مرزا لال بیگ ہکا بکا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اسے گالیاں بھی دی جا رہی تھیں لیکن وہ جوابی حملہ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ باقی بابو سرور کی اس ذہانت پر عش عش کرنے کے ساتھ قہقہے لگانے لگے۔ مرزا لال بیگ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سرور کا اصل ہدف کون ہے۔ اور وہ کس لال بیگ کی ماں بہن ایک کر رہا ہے۔ اور یوں دفتر میں لال بیگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کبھی کسی ایک دراز سے لال بیگ برآمد ہوتے تو کبھی فرش پر رینگتے نظر آتے۔ سرور ہاتھ میں جوتی پکڑے ان کی خبر گیری کرتا نظر آتا۔ مرزا لال بیگ بھی کچھ دن اس بے حرمتی کا بدلہ لینے کا سوچتا رہا۔ ایک دن وہ کہیں سے شاپر میں مرا ہوا چوہا دفتر لے آیا اور عین بابوؤں کے کمرے کے سامنے رکھ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگا۔ مگر کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔ یوں وہ بات نہ بنی۔ جو

مرزالال بیگ اور سرور کے لال بیگ میں تھی۔ مرزالال بیگ کو اپنی توپ کے ''مس فائر'' ہونے کا قلق ہوا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کی رنگت لال بیگ سے ملتی جلتی تھی مگر چوہا کسی بھی طور سرور یا کسی بابو سے ملتا جلتا نہیں تھا۔

ان تمام رنجشوں، دلی کدورتوں، چھوٹی موٹی جھڑپوں کے باوجود مرزالال بیگ سادہ دل اور شریف آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا۔ دفتر میں سروری لال بیگوں کے آمد کے بعد تو اس نے کسی سے مذاق کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ میرے دفتر میں حاضری کے پہلے دن جو میری دراز سے لال بیگ نکلے تھے ان میں میری کوئی غلطی یا کوتاہی شامل نہ تھی تو وہ میرے قریب ہوتا گیا۔ کیوں کہ نہ میں کسی سے مذاق کرتا تھا اور نہ کسی دوسرے کے مذاق کا حصہ بنتا تھا۔ دفتر میں سب اسے لال بیگ کہہ کر پکارتے، مگر میں اسے ''مرزا جی'' کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ جب بھی اپنے دفتری کام سے فارغ ہوتا تو میرے پاس آ بیٹھتا۔ اور مذہب، ملکی سیاست، گاؤں کی چودھراہٹوں، پنچائتی فیصلوں پر ایسے تبصرہ کرتا جیسے سب لوگ اس کے مشورے کے محتاج ہوں۔ اس میں ایک سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ منہ پھٹ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے جھوٹ سے نفرت ہے۔ اسی لئے وہ منہ پر سچ بات کہنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کی سچ گوئی سے کئی دفعہ دفتری ماحول میں بدمزگی بھی پیدا ہوئی۔ بابو سرور کے ساتھ اس کی ان بن اسی سچ گوئی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک دن دفتر میں ایک خاتون کسی کام کے سلسلے میں تشریف لائیں۔ اور سیدھا بابوؤں کے کمرے میں چلی گئیں۔ سرور نے اسے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا اور خاتون سے گفتگو شروع کر دی۔ مرزالال بیگ کو پہلے بھی گلہ تھا کہ سرور دفتر میں آنے والی اکثر خواتین کے ساتھ بے تکلف ہو جاتا ہے۔ اور انہیں مشروبات بھی پیش کرتا ہے۔ مرزالال بیگ اپنی کرسی سے اٹھا اور غیر محرم عورتوں کے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو کے خلاف اسلامی لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس عورت نے سرور کی منگوائی بوتل، جس سے ابھی اس نے ایک گھونٹ ہی بھرا تھا، میز پر رکھا اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ سرور نے اسے اپنی ہتک سمجھا،

> ایک صاحب اقبالؔ پر کام کر رہے تھے۔ ایک اجلاس کے دوران ان کی گفتگو سُننے کے بعد قدرت اللہ شہاب نے ابنِ انشاء سے کہا ''مجھے تو یہ شخص حواس باختہ معلوم ہوتا ہے۔''
>
> ابنِ انشاء فوراً بولے ''یہ تو آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ حواس باختہ تو وہ بالکل نہیں، ہاں البتہ اقبالؔ باختہ ضرور ہے۔''
>
> **قلم کاروں کی خوش کلامیاں** از **نارنگ ساقی**

اور بس دونوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ جو وقفے وقفے سے ہلکی پھلکی گالیوں کی صورت میں اپنی سنگینی کا احساس دلاتی رہتی۔

ایک دن روزمرہ ڈاک سے فارغ ہو کر مرزا لال بیگ میرے پاس آ بیٹھا۔ اور ایک بہت بڑا انکشاف کیا۔ کہنے لگا:

''مجھے پتہ چل گیا ہے پانی سے بجلی کیسے نکالتے ہیں''۔ اس نے ''بجلی نکالنے'' پر اتنا زور دیا کہ حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ میں نے پوچھا ''تم نے کہاں اور کس کو پانی سے بجلی نکالتے دیکھا ہے''۔

''میں کل ایک شادی پر ایک گاؤں گیا تھا۔ اس کے قریب نہر پر بجلی گھر بھی تھا۔ میں وہاں گیا۔ کیا دیکھا کہ نہر پر ایک پل سا بنایا گیا ہے جس کے نیچے مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ پل کے اس طرف جہاں سے نہر کا پانی آ رہا ہے وہاں پانی کی سطح اونچی ہے، جب پانی سے مشینیں بجلی نکال لیتی ہیں تو دوسری طرف پانی کی سطح نیچی ہو جاتی ہے۔'' میں نے مرزالال بیگ کی اس منطق پر اسے داد دی۔ اس نے پانی سے بجلی نکالنے کا مشاہدہ بڑی ہنرمندی سے کیا تھا۔ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا:

''مرزا جی آپ کو پتہ جس پانی سے بجلی نکال لی جاتی ہے وہ پینے کے قابل نہیں رہتا''۔

''اچھا جی؟۔ پاکستان تو پہلے ہی غریب ہے۔''

''مرزا جی۔ پانی میں بجلی ہی تو انسان کے جسم میں طاقت پیدا کرتی ہے۔ اب جس پانی سے بجلی ہی نکال لی جائے۔ اس میں طاقت کہاں رہتی ہے۔ بلکہ الٹا نقصان کرتا ہے''۔ اس توجیح نے مرزالال بیگ کی نظروں میں میری عقلمندی اور دانش پر مہر لگا دی۔

مراد علی شاہد

پھوپھو

پھوپھو ایسا معاشرتی کم رشتہ دارانہ کردار رہے جس کے لئے جنس کی حیثیت ثانوی ہے، مرد ہو کہ عورت، دونوں یہ کردار بخوبی نبھا سکتے ہیں، بس لگائی بجھائی میں مہارت شرطِ اوّل ہے۔ پھوپھو آپ ہو بھی سکتے ہیں اور ذرا چغلیانہ خصلت سے بن بھی سکتے ہیں مگر اصل پھوپھو تو پھر صحیح والی پھوپھو ہی ہوتی ہے اور یہی اصلی ''پھپھے کٹنی'' بھی ہوتی ہے۔

پھوپھو کے کردار و اقسام

دونوں ہی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ اقسام میں بڑی اور چھوٹی پھوپھو، جبکہ کردار میں بھائیوں سے شادی سے قبل اور بعد کے دورانیہ کی بنیاد پر۔۔۔ شادی سے قبل محبت سے بھرپور، جان چھڑکنے والی، بھائیوں کی دلہنیں تلاش کرنے والی اور شادی بیاہ کی تمام رسومات میں مرکزی کردار ادا کرنے والی۔۔۔ اِدھر بھائی کی شادی ہوئی، اُدھر پھوپھو کا اصلی چہرہ مکمل رنگ و روپ اور تمام پھیکی میٹھی گالی گلوچ سمیت کھل کر سب کے سامنے اور پھوپھو یک ساعت پھوپھو سے ''پھپھا کٹنی'' بن جاتی ہے اور بھابی جسے از خود پھوپھو بڑے چاؤ، مان، سمان کے ساتھ بیاہ کر کے لائی ہوتی ہے، اب اُسی بھابی میں پھوپھو کو سو سو کیڑے اور خامیاں نکالنے میں مزہ آتا ہے۔ اب محلے میں کون سا گھر ہوگا جس میں یہ فقرہ گردشِ محلہ نہ ہو کہ بس بہنا کیا بتاؤں، میں تو اُس وقت کو کوستی ہوں جب اُس چڑیل (جو شادی سے قبل چاند سے بھی زیادہ خوبصورت تھی) کو بیاہ کر لائی تھی اور تو اور بھائی بھی ''چڑھو'' نکلا اور ہر ویلے ''تھلے لگا'' رہتا

ہے۔(غریب گھروں میں تھلے لگنا، متوسط گھرانوں میں رن مرید اور امیر گھرانوں میں اِسے understanding کا نام دیا جاتا ہے) اِتنی تو ہمارے گھر میں ہانڈی تھلے نہیں لگتی جتنا یہ ''چڑھو بھائی'' بس بہنا، جادو اور وہ بھی ایسا کہ جو سر چڑھ کر بولے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پھوپھو شادی کے بعد بھی پھوپھو ہی رہتی ہے۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہی میکے وارد ہو کر براجمان ہو جائے گی اور وہ بھی مع خاوند و جملہ اطفال، دو تین دن گزارے گی اور پھر ہر بار کی طرح ایک جملہ ''ہمیں کیا؟ یہ کون سا ہمارا گھر ہے، ہم تو مہمان ہیں، گھر والے جانیں یا گھر کی مالکن (اشارہ بھابی کی طرف)۔''

جیسے ہر خاندان میں ایک پھوپھو ہوتی ہے، ویسے ہی ایک روائتی پھوپھو محلے میں بھی ہوتی ہے جو عمر رسیدہ اور بیوہ ہو چکی ہوتی ہے۔ جنرل نالج اس کا ایسا ہوتا ہے کہ محلے کے ہر گھر کی اندرونی کہانی محلّہ کی پھوپھو کی زبانی ہر کسی کو معلوم ہو جاتی ہے۔ اہلِ محلّہ کی عورتوں میں اُنہیں مرکزی اور باعزت مقام حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ گھر گھر کی کہانی پھوپھو کی فنگر ٹپ (Finger tip) پر ہوتی ہے۔

☆ محلّہ کمیٹی پھوپھو کے ہاں ڈالی جاتی ہے۔

☆ روزانہ اور ہفتہ وار چغلی / محلّہ میٹنگ پھوپھو کے ہاں ہوتی ہے۔

☆ ساس کی ہمدردی اور بہو کی برائیاں پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے۔

☆ جب تک محلّہ میں ساس بہو کے درمیان جھگڑا کروا نہ لے، پھوپھو کا سونا حرام ہوتا ہے کہ ساس بہو کی لڑائی اس کے لئے اطمینانِ قلب ہوتا ہے۔

☆ کسی بھی علاقے میں پورے محلے کی رپورٹ آپ کو دو ہی جگہوں سے مل سکتی ہیں، نائی کی دُکان اور پھوپھو کا مکان، نائی کی دُکان مردوں کا ''چغلی انسائیکلو پیڈیا'' اور پھوپھو کا مکان سسر، ساس کے تعلقات اور ساس بہو کی لڑائی کی ''لال کتاب'' جسے آپ ''پھوپھو کے ٹوٹکے'' یا ''پھوپھو کی ہلکی پھلکی شرارتیں'' کا عنوان دے سکتے ہیں۔

پھوپھو کے ساتھ خوشگوار تعلقات سارا سال پانی کے بہاؤ کی طرح چلتے رہیں گے، ماسوا چند تہواروں کے، جیسے عید، شب برات، شادی بیاہ یا فیملی فنکشنز کہ ہر تہوار اور خاص موقع پر روٹھنا پھوپھو کا حق لازم ہے۔ بات بے بات پر ناراض ہونا، باوجودیکہ کسی بھی تقریب کے لئے مہمانوں میں جو سب سے پہلے قدم رنجہ فرما ہوتے ہیں ان میں پھوپھو صفِ اوّل میں نظر آئیں گی۔ ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، تاہم ناراضی اور برہمی کا اظہار اِس بات پر بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کا موٹی والے آئیں گے تو میں دوبارہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھوں گی یا گھر میں کام کرنے والی ماسی نے پھوپھو سے پہلے کسی اور کو ناشتہ دے دیا ۔۔۔ یا پھر ۔۔۔ یا پھر ۔۔۔ اور پھر اس گردان کو ایک لامتناہی سلسلہ سمجھیں۔

پھوپھو سے بچنے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ پھوپھو سے ہی بچا جائے۔

۱۹۷۵ء کے آل انڈیا مشاعرے میں ایک نوجوان شاعرہ نے اپنے حسن اور ترنم کے طفیل شرکت کا موقع حاصل کر لیا تھا۔ جب موصوفہ نے غزل پڑھی تو سارے سامعین جھوم اٹھے۔ غزل بھی اچھی تھی اور آواز بھی غضب، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نادانستگی میں اس شاعرہ سے زیر زبر اور پیش کی کئی غلطیاں سرزد ہوئیں تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر تاڑ گئے کہ غزل کسی اور نے لکھ کر دی ہے۔
غزل سنانے کے بعد جب موصوفہ اپنی نشست پر واپس آ کر جلوہ گر ہوئیں تو ایک مداح شاعر نے ان سے کہا ''محترمہ! آپ کے کلام نے تو واقعی مشاعرہ لوٹ لیا۔''
اس پر بیدی صاحب خاموش نہ رہ سکے، برجستہ تصحیح فرمائی ''یوں کہیے برخوردار کہ محترمہ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ بیچاری غزل پر تو اتنا بڑا الزام مت لگائیے۔''

ہم سب کو اپنی نیتوں کا جائزہ لینا چاہئیے۔۔۔

حافظ مظفر محسنؔ

فاروق چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ تھا اُسے ریحا سے عشق کیا ہوا اُس نے اپنی زندگی کے سارے انداز ہی بدل ڈالے، میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کتابوں کی لسٹ تیار کر رہا تھا، عشقیہ قسم کے ناول۔۔۔ میں نے جب ''صحرانورد کے خطوط'' اور ''صحرانورد کے رومانس'' لکھوائے تو وہ جلدی سے اٹھا، پرانی ''پھٹ پھٹ پھٹ'' کرتی کالی موٹر سائیکل کو ''کک'' ماری اور ''یہ جا وہ جا''۔۔۔ یہ اب اُردو بازار جائے گا اور دوکان دوکان پھر کے یہ ناول تلاش کرے گا۔۔۔ دوپہر تین بجے مجھے ایک انجان نمبر سے کال آئی ''فاروق بول رہا ہوں؟۔۔۔ یہ فاروق صاحب آپ کے دوست ہیں؟''

''جی مجھے سمجھ نہیں آئی۔۔۔ لگتا ہے آپ نے Lunch نہیں کیا؟''

''میں نے کوئی فارسی میں بات نہیں کی۔۔۔ صرف یہی کہا ہے'' (غور سے سنیں اس بار) وہ بولا ''فاروق بول رہا ہوں اور یہاں میرے پاس ایک اور صاحب ہیں یہ بھی فاروق کہلاتے ہیں اور آپ کے دوست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، شکل سے معزز اور پڑھے لکھے بھی لگتے ہیں۔''

''اب سمجھا۔۔۔ حکم کریں۔۔۔؟؟''

''آپ اگر تشریف لے آتے تو بہتر تھا'' فاروق صاحب نے مجھے بلایا اور میں بھی اپنی موٹر سائیکل پر بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچا، لیکن سارے راہ میں سوچتا رہا کہ ''یہ کیسا بلاوا ہے؟''

یہ شہر کا سب سے بڑا کتابوں کا شوروم تھا، فاروق صاحب ایک پرانی طرز کے اوورکوٹ پہنے شخص نے بڑی عینک کے بیچ میں سے مجھے جھانکا۔

''جی میں ہوں۔۔۔ آجائیں مظفر محسن صاحب!''

میں پرانے ٹوٹے اسٹول پر بڑی احتیاط سے بیٹھ گیا۔

''بلاؤ مہمان کو'' اُن صاحب نے اپنے ہی انداز میں ایک بوڑھے ملازم سے کہا اور دائیں طرف اندھیرے کمرے میں سے ایک صاحب تیزی سے چلتے باہر نکل آئے۔

''فاروق تھا۔۔۔میرا دوست'' میں بھی کھڑا ہو گیا فاروق کے ساتھ۔

''مظفر محسن صاحب آپ کی کتابیں ہمارے شوروم میں آتی ہیں، میں ویسے بھی آپ کو جانتا ہوں۔۔۔یہ فاروق صاحب آپ کے دوست ہیں؟''

''جی۔۔۔ جی بالکل''۔۔۔ میں نے فاروق کے سنجیدہ چہرے پر دیکھتے ہوئے''ہاں'' کہہ دیا۔

''آپ کے دوست فاروق صاحب نے ہمارے شوروم سے کتابیں چوری کی ہیں!''

''اف''۔۔۔میری ہنسی نکل گئی مگر دونوں فاروق سنجیدہ تھے بڑی عینک والے فاروق نے تمہید باندھی۔

''مظفر صاحب! ہم نے یہ سادہ سا بزرگ آدمی اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ یہ سارا دن کتابوں کے بیچ پھرتا رہتا ہے اور ہر روز اُن لوگوں کو پکڑتا ہے جو''علم'' حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی ''چوری'' کر کے۔۔۔ ہے ناں بُری بات؟ آپ کے دوست فاروق نے ہزار روپے والا ناول چوری کیا ہے۔۔۔میں نے اپنا ہم نام ہونے کی وجہ سے انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا لیکن یہ

اقرار کر چکے ہیں اپنے اوورکوٹ کے نیچے چھپا کر اب تک یہ تین کتابیں پہلے بھی چرا کے لے جا چکے ہیں جن کی مالیت گیارہ سو روپے بنتی ہے؟ آپ کی ایک کتاب کی پانچ کاپیاں آپ نے رکھوائی تھیں، چار فروخت ہو چکی ہیں یہ ایک پڑی ہے۔۔۔ ۵۰ فیصد رعایت کر کے گیارہ سو ستر روپے آپ کے بنتے تھے۔۔۔

گیارہ سو روپے ہم نے آپ کے دوست فاروق کی چوری شدہ کتابوں کے حوالے سے کاٹ لئے یہ ''ستر روپے'' آپ رکھ لیں اور یہاں Sign کریں۔'' فاروق صاحب نے میرے دوست کی چوری کی ہوئی کتابوں کی ''سزا'' مجھے دی اور ستر روپے مجھے تھما دیئے۔

میں نے ستر روپے اپنے دوست ''فاروق'' کی جیب میں ڈالے اُس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں ہنستے ہوئے باہر آ گئے۔

''سرکار اب تو یہ کام چھوڑ دیں'' میں نے محبت سے کہا ''آپ نے تو ساحو مالی کی بات ہی پلّے باندھ لی ہے کہ چوری کا گلاب کا پودا ہو تو اُسے جو گلاب کے پھول لگتے ہیں وہ زیادہ خوبصورت اور خوشبودار بھی ہوتے ہیں؟''

''یار مزہ آتا ہے چوری کی کتاب پڑھ کے'' فاروق نے ہنستے ہوئے کہا ''اور تم نے بھی تو تین سال پہلے ''فیض احمد فیض'' کی کتاب ''دستِ تہ سنگ'' یہیں سے چوری کی تھی۔''

''یار چپ کر کوئی سن لے گا'' میں نے فاروق کا ہاتھ دباتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُسے چپ کرا دیا۔

کل رات جب ڈیفنس کے ایک خوبصورت گھر میں خوبصورت لوگوں کی شاعری سن کر جب ہم آنے لگے تو زاہد شمسی نے کہا ''ابھی آپ نہیں جا سکتے، ہماری کتابیں تو لیتے جائیں۔۔۔ یہی تو تحفہ ہے جو ہم آپ کو پیش کر سکتے ہیں؟''

زاہد شمسی کی کتاب ''سبز خوشبو'' میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے ورق گردانی کی تو اُن کے نعتیہ اشعار سامنے آ گئے۔

کیفیت اشک بھری دل پہ مرے طاری ہو
اور پھر اسمِ محمد ﷺ کا سخن جاری ہو
کیسے ممکن ہے کہ آنکھیں ہوں تیرے روضے پر
اور ہونٹوں پہ زمانے کی طرف داری ہو
میں تیرے نام کے اِک حرف پہ قربان کروں
میرے ہاتھوں میں یہ دنیا بھی اگر ساری ہو

پھر محترمہ یاسمین بخاری صاحبہ نے اپنی کتاب ''حرفِ رقصاں'' پیش کی تو یہ اشعار دیکھے اور پڑھتا چلا گیا۔

تجھے تصویر کرنا چاہتی ہوں
میں گھر تعمیر کرنا چاہتی ہوں
سمجھتا ہے جو خود کو کوہ جیسا
اُسے تسخیر کرنا چاہتی ہوں
تجھے رانجھا بنا کے اپنے دل کا
میں خود کو ''ہیر'' کرنا چاہتی ہوں

''فیض یوتھ فیسٹول'' میں کتابوں کے سٹال پر میں، مرزا شعیب اور احمد سہیل نصراللہ کتابوں کے حوالے سے گفتگو کر رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ''کتابوں کے سٹال خالی پڑے ہیں سب کھانے پینے اور میوزک میں مگن ہیں۔''

ہم نے علامہ اقبال کے نصب شدہ مجسمہ کی طرف دیکھا، شاید علامہ اقبالؒ اس بات پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ وہاں ایک تھری پیس میں ملبوس نوجوان کھڑا تھا۔ ہم نے جب پیچھے مڑ کر اُدھر کا رخ کیا تو وہ علامہ اقبال کے مجسمہ کے پاس کھڑا مسکراتا ہوا۔۔۔ کتابوں سے ہماری اس لاتعلقی پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا۔ اِس دوران ہم نے اُس نوجوان سے بات شروع کی تو اُس نوجوان نے کہا کہ فیض احمد فیض صرف میوزک اور آرٹ سے ہی دلچسپی نہ رکھتے تھے وہ آخری عمر میں مذہب سے بھی وابستہ ہو چکے تھے۔ ''سلیم منصور خالد کے بقول فیض نے آخری عمر میں اپنی اس شدید خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ کاش میں پورا قرآن پاک حفظ کر پاتا ویسے وہ آدھا قرآن پاک حفظ کر چکے تھے۔'' احمد سہیل نصراللہ نے وضاحت کرتے ہوئے ہمارے علم میں اضافہ فرمایا اور ہم پر زور میوزک اور نوعمر MOD لڑکوں لڑکیوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے الحمراء میں منعقدہ ''فیض یوتھ فیسٹول'' کو خدا حافظ کہہ کر سنجیدگی سے سوچتے ہوئے مال روڈ پر آ چکے تھے۔

خادم حسین مجاہدؔ

ادبی اجلاس

کانفرنس ہال دھکا دھک اور کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ شور میں حاضرین کے لئے اپنی ہی آواز پہچاننا مشکل ہو رہا تھا، پھر بھی سب حسبِ توفیق اس کارِ خیر میں حصہ ڈال رہے تھے۔ خواتین والی سائیڈ کا حال سب سے برا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ نازک مزاج لوگوں کو تو اپنے کانوں کے پردے پھٹنے کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر دوسروں کو خاموش کرانے کی کوشش میں مزید شور کا باعث بن رہے تھے۔ خواتین کے موضوعاتِ گفتگو نئے جوتے جیولری اور پرانے معاشقے اور مردوں کے مہنگائی اور نئے معاشقے تھے۔ رپورٹر مجرد تنہا کو گرلز کالج کے باہر فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے دوران تاخیر ہو گئی تھی، بہر حال وہ اپنے صحافیانہ تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے مجمعے کو کودتا پھاندتا روندتا سٹیج کے قریب پہنچ گیا اور اگلی نشستوں کو تاڑتے ہوئے سب سے کمزور اور شریف جان کر ضعیف قضا کو میڈیا کی دھونس دے کر اٹھایا اور اس کی نشست پر قابض ہو کر اپنے چینل کے لئے رپورٹنگ اور ریکارڈنگ کی تیاری کرنے لگا۔ آخری درویش نے ترس کھا کر ضعیف قضا کو اپنے ساتھ اٹکا لیا ورنہ کھڑے کھڑے اس بیچارے کی ٹانگیں بے کار ہو جاتیں۔ بابا شوقی نے ڈائس پر قبضہ جما کر آخری درویش کو کرسیِ صدارت اور مسٹر طوطی فرام نقار خانہ کو مہمان خصوصی کی نشست پر دھرنا دینے کے لئے کہا جبکہ مسز طوطی فرام نقار خانہ خواتین کی نمائندگی کے لئے زبردستی نشست سمیت سٹیج پر براجمان ہو گئیں۔ بے بے شوقی اور آپا زبیدہ نے اِس پر اعتراض کرتے ہوئے اسے اقربا پروری قرار دیا تو آئیندہ انہیں نمائندگی دینے کا وعدہ کر کے چپ کرایا گیا ورنہ ایک نئی جنگ چھڑ جاتی۔ اچانک بابا شوقی نے مائک آن کر کے بلند آواز میں ایک خوفناک قہقہہ لگایا تو ہال میں یکدم خاموشی چھا گئی تو اس نے پروگرام کا باقاعدہ آغاز کرنے کے لئے کہنا شروع کیا۔

بابا شوقی: ''حاضرین! ادب کا پوسٹ مارٹم کرنے کے نیک ارادے سے ہم ایک بار پھر جمع ہوئے ہیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب ادب کو کوئی حادثہ پیش آئے گا اور اس حادثے کی ایک کوشش آج کا یہ پروگرام ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ادب کو دیس نکالا نہیں مل جاتا یا پھر شعراء ادباء کو۔ امید ہے آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں گے۔ سب سے پہلے دعوت دوں گا میں خود کو اور میں اس جدید دور کی کہانی قدیم انداز میں سناؤں گا تو استقبال کیجئے کہ تشریف لاتا ہوں میں خود۔

دس بارہ دفعہ کا ذکر ہے کہ ملک ویران میں ایک عدد بادشاہ رہتا تھا ملک میں چار سو جمہوریت ہی جمہوریت تھی اس لئے بادشاہ بیچارے کے پاس اِتنے اختیارات تھے کہ انہیں اختیارات کی تہمت ہی کہا جا سکتا تھا ورنہ تو اسے واش روم بھی وزیر اعظم سے پوچھ کے جانا پڑتا تھا اور باہر آنے کے لیے ایک بار پھر اجازت لینا پڑتی تھی۔ دراصل قدیم بادشاہوں کے اپنے بلا شرکت غیرے اختیارات کو لونڈیوں کی طرح استعمال کرنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔ اسی لئے بادشاہ کی ایک ہی ملکہ تھی کیونکہ پارلمینٹ نے اس سے زیادہ

عیاشی کی اجازت بادشاہ کو دی ہی نہ تھی۔ اس کی دوسری شادی کا اس وقت کوئی چانس نہ تھا، جب تک پہلی کنارے نہ لگ جاتی کیونکہ بادشاہ کی اتنی جرأت نہ تھی کہ بیک وقت دو بیویاں رکھ سکتا اور پھر ملکہ اوّل اس کی اجازت بھی کب دیتی۔ بادشاہ کی خوش قسمتی کہ ملکہ ایک دفعہ بیمار پڑ گئی تو بادشاہ دوسری شادی کے سہانے خواب دیکھنے لگا اس دوران ملکہ نے اس سے پوچھا کہ ''اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟'' اسی بے دھیانی میں بادشاہ کے منہ سے سچ نکل گیا کہ ''دوسری شادی!'' یہ سنتے ہی ملکہ نے مرنے کا ارادہ ملتوی کر کے جوتا پکڑا اور بادشاہ کی صفائی شروع کر دی۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات سے جاری ہونے والی افوہوں کے مطابق بادشاہ کے بال اس لئے نہیں جھڑے تھے بلکہ اس کی وجہ پریشانی تھی کیونکہ ان کی اولاد کرپشن سکینڈل میں پھنسی ہوئی تھی۔ آخر بھاری رشوت دے کر وہ انہیں اس چکر سے نکالنے میں کامیاب ہوئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔''

بابا شوقی: آپ نے دیکھا جمہوری دور میں بادشاہوں کا کیا حشر ہوتا ہے کوئی ایمرجنسی یا مارشل لا؟ لگانا چاہتا ہے؟

ضمیر ناطقی: جمہوریت کے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر ہمیں تو بادشاہ پر ترس آ رہا ہے۔ جمہوریت آنے سے اس کا حال تو اس سے بھی بدتر ہوا جو ہمارے ہاں آٹھویں ترمیم کے خاتمے کے بعد صدر کا ہوا۔

شریر صحرائی: شکر ہے کہ جمہوریت نے بادشاہ کے نفس، زبان اور ہاتھ کو لگام دے رکھی اور وہ روایتی بادشاہوں کی طرح نہ تو ملک بھر کی حسین لڑکیوں سے حرم بھر سکا اور نہ ہی درباریوں کی فوج ظفر موج تیار کر سکا اور نہ ہی قصیدہ خوانوں کے منہ موتیوں سے بھر کے مالیاتی بحران پیدا کر سکا ورنہ پانامہ لیکس کا شکار ہو جاتا۔

جالینوس فرمانی: لیکن جمہوریت کی زیادتی سے سیاستدانوں کے معدے اور دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ جمہوری سینماؤں پر جمہوریت کی فلمیں چلانا شروع کر دیتے ہیں، لہٰذا اکثر اوقات ان پر مارشل لاؤں کا سنسر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو لوگ بھوکے مرتے رہتے ہیں، کشمیر جلتے رہتے ہیں اور نیرو کرکٹ کھیلتے رہتے ہیں۔

پریشان حیرانی: جی ہاں جمہوریت اور آمریت میں بس نام کا ہی فرق ہے ورنہ آمریت میں جو اختیارات بادشاہ کے پاس ہوتے ہیں جمہوریت میں وہی وزیراعظم کے پاس ہوتے اور دونوں ایک جیسے مسائل ہی پیدا کرتے ہیں۔

بابا شوقی: آپ نے کہانی کی بین السطور چھپے پہلوؤں کو خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے لیکن اس سے قبل کہ ہم سیاسی کیچڑ کے دلدل میں ''گٹے گوڈوں'' سمیت دھنس جائیں، واپس ادب کی طرف آتے ہیں اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے مسٹر طوطی فرام نقار خانہ سے سنتے ہیں کامی شاہ کا کچا چٹھا۔

مسٹر طوطی فرام نقار خانہ: کامی شاہ دُور سے جون ایلیا کا چھوٹو ایڈیشن لگتا ہے اس لئے یہ جون ایلیا سے ملنے سے احتراز کرتا تھا کہ کہیں وہ آئینہ دیکھ کے برا نہ منا جائے یہ پاس بیٹھا ہو تو انتظار حسین لگتا ہے اور بول رہا ہو تو اشفاق احمد لگتا اور اگر سوچ رہا ہو تو منٹو لگتا

مجھے ہنسنا ہنسانا پسند ہے لیکن کچھ لوگوں کا ہنسنا ہنسانا دیکھ کر مرثیہ گوئی کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک صاحب ہیں جو کسی معمولی سی بات پر ہنستے ہیں اور پھر ہنستے چلے جاتے ہیں۔ ان کا مخاطب انتظار کرتا ہے کہ ان کی ہنسی ختم ہو تو وہ آگے بات بڑھائے۔ لیکن ان کے آدھے جملے پر یہ صاحب پھر سے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور اتنا ہنستے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے جس پر وہ دھوتی کا پلو اوپر اٹھا کر آنکھ صاف کرتے ہیں دوسرے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔!

ایک اور صاحب کو میں جانتا ہوں جو قسطوں میں ہنستے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ ہنس چکے ہیں لیکن ایک جھٹکے کی کیفیت کے ساتھ وہ دوبارہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مخاطب کی بات جاری رکھنے کے لیے پوچھنا پڑتا ہے کہ بھائی صاحب اگر آپ ہنسنے سے مکمل طور پر فارغ ہو چکے ہیں تو براہ کرم مطلع فرمائیں تا کہ گفتگو کا باقی حصہ بھی پیش کیا جا سکے۔

عطاء الحق قاسمی

ہے اور لکھ رہا تو کچھ کچھ مظہر الاسلام۔ یہ تختی لکھنے کے وقت سے لکھ رہا ہے اس لئے ملک اور بیرونِ ملک کوئی بھی قابلِ ذکر اور نا قابل ذکر اخبار یا رسالہ اس کے شر سے محفوظ نہیں۔ اس کے لکھنے کی رفتار سے اگر ہمارا ملک ترقی کرتا تو آج امریکہ ہمارے قدم چوم رہا ہوتا۔ چونکہ یہ علامتی افسانہ نگار اور تجریدی شاعر ہے اس لئے یہ ادب کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے خصوصاً شاعری میں تو اس نے اتنے تجربات کئے ہیں کہ جتنے ہمارے طلباء لیبارٹریوں میں بھی نہیں کرتے اس کی ایک نظم دیکھئے۔

باتیں میری محبوبہ کی
ہیں کچھ ایسی جیسے
سوال ہو گندم
اور جواب ہو چنا
اس کا ایک قطعہ دیکھئے

جس قدر پیسہ میری بیوی نے
اپنے میک اپ پہ خرچ ڈالا ہے
اِتنا پیسہ جو جمع کر لیتا
بیوٹی پارلر ہی میرا ہونا ہے

ہم اس کی جدید شاعری کو محض تشویش کی نظر سے دیکھتے ہی نہیں بلکہ عملی سدِ باب کے لئے پیروڈی وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں کیونکہ یہ بنڈلوں کے حساب سے موصول ہوتی رہتی ہے ایسی ایک کوشش آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

بھلا کس جیب میں پیسہ بچا ہے
ہمارے کھیسے میں آنہ بچا ہے
کنواری منہ چھپائے رو رہی ہے
نگر میں ایک ہی منڈا بچا ہے
وہ کھانا بانٹ کر کہنے لگا کل
تمھارے واسطے بھوسا بچا ہے
وہ جس میں رہ گیا مچھر ہی پھنس کر
وہ برفی کا بس اِک ٹکڑا بچا ہے
ہم اندھی آنکھ سے چلتے رہے ہیں
بھلا لیڈر سے اپنا کیا بچا ہے
لڑے گا کس طرح بیگم سے آخر
جو شوہر اس قدر تیلا بچا ہے
کبھی تھی مل مکمل پاس میرے
مگر اب ایک ہی ٹکڑا بچا ہے
میں بینک کو لوٹ کر آیا تھا طوطی
سو تھانے جانے کا رستہ بچا ہے

بابا شوقی: کیا کوئی اس ہولناک تجربے پر کوئی سخن آرائی کرنا چاہتا ہے۔

آخری درویش: رجعت پسند بھلا شاعری کے جدید تجربات کو کیسے ہضم کر سکتے ہیں۔ ان کو تو چند جدید اشعار سن کر ہی گیس ہو جاتی ہے ورنہ کامی بے چارے نے تو سراسر منطقی شاعری کی ہے۔ اس کا قطعہ ہی دیکھ لیں، کس خوبی سے کامی نے عورتوں کی فضول خرچی کی خوفنا کی کو ظاہر کیا ہے۔

مسز طوطی فرام نقار خانہ: لیکن اس بات کو آپ تسلیم کریں گے کہ مسٹر طوطی نے کس صفائی سے کامی کی شناخت پریڈ کی ہے۔

بے بے شوقی: خصوصاً بغیر سوچے سمجھے مسٹر طوطی نے کامی کی غزل کی جو پیروڈی کی ہے وہ ہمیں سوچنے پر ضرور مجبور کرتی ہے کہ اصل غزل بھی بغیر سوچے سمجھے لکھی گئی ہو گی۔

بابا شوقی: واقعی سوچ سمجھ کے لکھا جائے تو اس قدر لکھنا ممکن ہی نہیں، اس لئے کامی کو اپنے مجموعے کا نام اندھا دھند شاعری رکھنا چاہیے۔ اب سنیئے ایک مضمونچہ مسز طوطی فرام نقار خانہ سے۔ عنوان ہے محبت۔

مسز طوطی فرام نقار خانہ: محبت کا وائرس آنکھوں کے راستے دل پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ دماغ کو بند کر دیتا ہے اور نظروں کو تیز نظر کو محدود کر دیتا ہے، جس سے محبوب کی صرف خوبیاں نظر آتی ہیں، خامیوں سے آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ محبوب کی خوبیوں سے قلم معذور ہو جاتا ہے اور گنتی کرنا چاہیں تو اعشاری نظام ختم ہو جائے۔ دنیا کے کسی بھی سکیل پر محبت کی پیائش ناممکن ہے، اس کے لئے محبت کا کوئی اپنا سکیل ہی تیار کرنا پڑے گا بقول ایک ریاضی دان

کے، زیرو سے انتہا تک محبت ہی محبت ہے اور اس کی مقدار معلوم کرنا چاہیں تو کمپیوٹر بھی پاگل ہو جائے۔ انسان اس چکر میں کتنے پاگل ہوئے، اس بارے میں مکمل اعداد و شمار پاگل خانوں سے ہی مل سکتے ہیں لیکن اس حساب سے کھلے پھرنے والے پاگل بھی کم نہیں کیونکہ محبت پاگل پن کا دوسرا نام ہے اور ہر انسان زندگی میں ایک بار ضرور پاگل ہوتا ہے، بعد میں چاہے ٹھیک ہو جائے۔ محبت کانٹوں کا تاج ہے لیکن ہر ایک اسے پھول سمجھ کر پہن لیتا ہے پھر یہ کانٹے چاہے روح تک میں اتر جاتے ہیں اور انسان ساری عمر روح و بدن کی مرہم پٹی کرتا رہتا ہے۔ کچھ مرہم کے طور پر شادی کر لیتے ہیں لیکن بعد میں کھلتا ہے کہ بیوی تو ان زخموں پر نمک کا اثر رکھتی ہے۔

بابا شوقی: مسز طوطی نے محبت کے سمندر کو لفظوں کے کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے کوئی اس پر بات کرنا چاہتا ہے؟

ہوشیار باتونی: یہ محبت پر ایک ریاضیاتی سائنسی رپورٹ ہے، جس میں اس نازک موضوع کا پوسٹ مارٹم کر دیا گیا ہے جو ہم جیسے نوجوانوں پر کسی ضلم سے کم نہیں۔

مقدر رونقی: اچھا ہی ہے کہ محبت کو بطور جذبہ زیرِ بحث نہیں لایا گیا ورنہ ذوقِ جمال کی لاش ہی اٹھتی۔

آتش برفی: یہ ذوقِ جمال کون ہے؟

نقیب ریگستانی: مصنف کی نظر صرف محبت کی خامیوں پر ہی جا سکی ہے ورنہ اس کے فوائد قوم کی بدنیتی کی طرح واضح ہیں۔

بابا شوقی: اب آپ کی تواضع ایک نمکین غزل سے کرنے آ رہے ہیں، کے ایچ مجاہد استقبال کیجئے۔

کے ایچ مجاہد: عرض کیا ہے۔

عشق کا دردِ لا دوا نہ ملا
اور حسینوں کو آسرا نہ ملا
بھاگ ہی جاتی موقع پا کر وہ
پر کوئی ڈھنگ کا آشنا نہ ملا
گھوڑے دوڑاتے بحرِ ظلمت میں
پاس دریا ہی نور کا نہ ملا
ملنے سیلاب میں بھی آ جاتے
کوئی کشتی، کوئی گھڑا نہ ملا
ڈش کا کیبل کا شور گھر گھر میں
کوئی درہم کو بے صدا نہ ملا
آ گئے غالباً اسمبلی میں
شہر میں اب کوئی گدھا نہ ملا
توڑتے ہم ریکارڈ مجنوں کا
ہم کو صحرا کا آسرا نہ ملا

بابا شوقی: کے ایچ مجاہد صاحب نے شاعری کے ساتھ حسبِ عادت بہت بڑا ہاتھ کر دیا ہے کوئی اِن کی گوشمالی کرنا چاہتا ہے؟

بے بے شوقی: لگتا ہے لڑکیاں اب سیانی ہو گئی ہیں جو عاشقوں کو ان کا آسرا نہیں مل رہا۔

بے بس مجبوری: لڑکیاں اور سیانی؟؟ ہاں یہ کہہ سکتی ہیں کہ اب وہ سوچ سمجھ کر بھاگنے لگی ہیں۔

شاطر پہاڑی: مگر آپ نے عاشق کی بے بسی پر تو غور کیا ہی نہیں جو اس آزاد دور میں بھی عشق سے محروم ہے۔

غافر انجانی: سب گدھے اسمبلیوں میں تو نہیں گئے، اکثر تو ہمارے معدوں میں پہنچ گئے ہیں۔

بابا شوقی: آپ نے ٹھیک کہا اب بندہ کس پر بھروسہ کرے۔ اس بات سے آپ کی طبیعت مکدر ہو گئی ہو گی اسے ٹھیک کرنے کے لئے میں دعوت دیتا ہوں آخری درویش کو جو کوئی جدید کہانی سنائیں گے۔

آخری درویش: دوسری دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کسان اپنے بیٹے کے ساتھ گدھا بیچنے شہر جا رہا تھا، باپ بیٹا گدھے کی رسی پکڑے چل رہے تھے کہ راستے میں ان کو ایک شخص ملا اور کسان سے کہنے لگا "تم کتنے بے وقوف ہو، گدھے کے ہوتے ہوئے پیدل چل رہے ہو، کم از کم اپنے بیٹے کو ہی گدھے پہ بٹھا دو۔" یہ سنتے ہی گدھے کو اس مشیرِ فتنہ پر شدید غصہ آیا اور اس نے پیچھے سے اسے دولتی جڑ دی اور وہ غریب دور جا گرا۔ کسان کو بھی کان ہو گئے

اور وہ خاموشی سے گدھے کو لے کر چل پڑا۔ پھر راستے میں کسی نے کسان پر کوئی اعتراض نہ کیا اور کوئی مفت مشورہ بھی نہ ملا۔ شاید دولتی کی خبر عام ہوگئی تھی اور گدھے کی ہیبت ان کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی۔

بابا شوقی: گویا گدھا بھی اتنا گدھا نہیں ہوتا، کوئی اس پر ڈھینچوں ڈھینچوں۔۔۔ میرا مطلب ہے اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہے؟

کشف طغیانی: دورِ جدید کے گدھے اپنے حیوانی حقوق سے بخوبی آگاہ ہیں اور وہ بزورِ دولتی بھی ان کو حاصل کرنا بالکل معیوب نہیں سمجھتے اور وہ پرانے دور کے گدھوں کی طرح باپ بیٹے اور بوجھ کو بیک وقت خود پر نہیں لاد سکتے۔

حیران پریشانی: یہ جمہوری دور ہے جس میں ہر کسی کو اپنا نفع نقصان سوچنے کا پورا حق ہے چاہے وہ گدھا ہی کیوں نہ ہو۔

ناز زخنجری: شاید یہ کہانی حیوانی حقوق کی تنظیموں کے ایما پر لکھی گئی ہے۔

تیغ نشتری: کاش انسانوں کو بھی حقوق مل جاتے جو حیوانوں کو مل چکے ہیں۔

سرد چنگاری: لیکن موجودہ دور میں گدھے کی طرح دولتیاں جھاڑنے کے بغیر حقوق کا حصول ممکن نظر نہیں آتا۔

شعلۂ برفاب: لیکن سب تو گدھے نہیں بن سکتے، میرا مطلب ہے دولتیاں نہیں جھاڑ سکتے۔

فتنہ بجلی: لیکن جو ایسا کر لیتے ہیں وہ دوسروں کے حقوق اپنے گلے میں بھی ڈال لیتے ہیں اور پھر جب کوئی ان سے حق مانگے تو اسے بھی دولتیاں جھاڑتے ہیں پھر کوئی بڑی دولتی جھاڑ کر ہی ان سے کوئی اپنا حق لیا جاسکتا ہے۔

کرگس قصائی: جی ہاں اسی لیے تو ہر شعبہ میں دولتیوں والے اگلی صفوں میں نظر آتے ہیں۔

بابا شوقی: آپ کی باتیں درست ہیں لیکن ان میں ایک تکنیکی غلطی ہے کہ دولتی گدھوں کی ہوتی ہے جبکہ انسانوں کی یک لتی۔ آپ لوگوں نے کہانی کو اچھی دولتیاں میرا، مطلب ہے یک لتیاں لگائی ہیں۔ امید ہے آخری درویش کا مزاج درست ہوگیا ہوگا۔ اب آخر میں کچھ شاعروں کی مختصر شاعری آپ کو سنواتے ہیں تاکہ آپ کے ہوش ٹھکانے آجائیں سب سے پہلے مجھ سے سنیے فارغ خیالی کا شعر

نہ ملا کر ''اوباش'' لوگوں سے
حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں

طوطی فرام نقار خانہ: اور مجھ سے قطعہ سُن لیجیے۔

مرمت فرض ہوتی جارہی ہے
کسی کا قرض ہوتی جارہی ہے
بدن کو چاٹ لے گی اب یقیناً
لگائی مرض ہوتی جارہی ہے

آخری درویش: میں چند شعری غزل پیش کرتا ہوں۔

نقص تم میں ضرور ہے کوئی
یونہی کب تم سے دور ہے کوئی
مسکراتے ہیں لوگ تو یارو!
حور کے سنگ لنگور ہے کوئی
کال کرنا ہی چھوڑ دی اُس نے
گھات اس میں ضرور ہے کوئی

ناطقہ کشش: میں تو بس دو شعر پیش کرنا چاہوں گی۔

میرے دل میں ہے روشنی تم سے
وولٹیج بجلی کے نہ کم کرنا
میں تو ہوں سادگی مزاج بہت
مجھ پہ میک اپ کا نہ ستم کرنا

بابا شوقی: شاعر تو اور بھی تھے مگر پھر سہی کیونکہ پروگرام کا وقت ختم ہورہا ہے اور یہ سب برداشت کر کے میری ہمت جواب دے چکی ہے امید ہے آپ کا حال مجھ سے بھی پتلا ہوگا لہٰذا ایک دوسرے پر اور ادب پر رحم فرماتے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں۔ دعوتِ طعام کو کوئی سوچے بھی نہیں کہ جب سے گدھے کا گوشت پکڑا گیا ہے، ہمیں کھانا نہ کھلانے کا ایک اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔ خدا حافظ، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

حنیف عابدؔ

پیوند کاری

کوئی بھی چیز اپنی اصل شکل وصورت میں جب تک رہتی ہے اُس کی قدر و قیمت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ اگر اس کی اصل شکل وصورت میں تبدیلی رونما ہو جائے تو کبھی کبھی آسمان کی پوشاک خاک پر آگرتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بازاروں میں عروسی ملبوسات نہایت زرق برق قسم کے شو کیسوں میں سجے ہوتے ہیں دور سے اپنی جانب کھینچتے ہوئے ان ملبوسات کی قیمت جب کانوں کے ذریعے دماغ تک پہنچتی ہے تو کبھی کبھی انسان کے حواس معطل ہو کر رہ جاتے ہیں ورنہ عمومی طور پر کششِ ثقل معکوس شکل اختیار کر لیتی ہے اور انسان کسی اور جانب اپنی توجہ مبذول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عقلمند صارف ایسے مواقع پر کمال ہوشیاری کے ساتھ مذکورہ لباس پر تحقیری نگاہ ڈال کر اپنی عزتِ نفس کو ڈھال فراہم کرتے ہیں۔

ایسی ہی صورتحال کا سامنا اس وقت بھی ہوتا ہے جب کوئی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص اپنے لاڈلے بچے کے لئے سالگرہ کا تحفہ خریدنے بازار پہنچ جائے اور دل میں یہ خواہش رکھتا ہو کہ وہ اس سالگرہ پر اپنے بچے کو اُس کی پسند کا تحفہ دے۔ ایسا شخص جب شو کیسوں میں سجے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر نظر ڈالتا ہے تو کئی ایسے کھلونے ہوتے ہیں جو اس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ ان کھلونوں کی قیمت پوچھتا ہے، اس کے دل و دماغ سے اِن کھلونوں کا اثر ایسے ہی زائل ہو جاتا ہے جیسے انسدادِ تجاوزات کا محکمہ بااثر اور مالدار قابضین کے قومی شاہراہوں پر پھیلے ہوئے شیطان کی آنت کی مانند غیر قانونی قبضے کو چھوڑ کر کسی غریب پتھاریدار کا وہ چھوٹا سا پتھارا اٹھا کر اپنے ٹرک میں ڈال کر اس کے وجود کا نام ونشان مٹا دیتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ پتھارا ہوتا ہے جس پر وہ غریب شخص رومال اور بچوں کی چڑیاں فروخت کر کے ایک جانب اپنے بچوں کے پیٹ کا جہنم بھر رہا ہوتا ہے اور دوسری جانب غریب کے بچے کی سرپوشی کے لئے سامان بھی فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جس معاشرے میں انسانیت، شرافت، قانون کی عملداری محض زبانی جمع خرچ تک محدود ہو چکی ہو وہاں ''گیہوں کے ساتھ گُھن پِسنے'' کا محاورہ تک اپنی اصل شکل کھو دیتا ہے۔ ہمارے یہاں تو چن چن کے گیہوں الگ کر دیا جاتا ہے جب بھی پِستا ہے صرف گھن ہی پِستا

ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو محکمہ انسداد تجاوزات کا ٹرک بھی اس محکمے کے افسران اور عمال کے پیٹ کی مانند عمرو عیار کی زنبیل ثابت ہوتا ہے جس میں غریبوں کی اٹھائی گئی اشیاء ایسے غائب ہو جاتی ہیں جیسے اس محکمے کے افسران و عمال کی جانب سے لی جانے والی رشوت اور حرام کی کمائی کے ثبوت۔ لاکھ کوشش کر لیں اس حرام کی کمائی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس کی وجہ سے محکمہ انسداد رشوت ستانی اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود کچھ ہاتھ نہ لگنے پر انہی افسران اور عمال سے اپنی تھکن دور کرنے اور ناکامی کی خفت مٹانے کے لئے سیر تفریح کی غرض سے نذرانہ وصول کرتے ہی کیس کو داخل دفتر کر کے اپنی پیشہ ورانہ اور قومی ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر سے اتار کر سرخ رو ہوتا ہے۔

انسان کا ظاہر و باطن دورخی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ظاہر کے ثبوت تو آسانی سے سامنے لائے جا سکتے ہیں لیکن باطن میں کیا چھپا ہوتا ہے اس کا جاننا ''جوئے شیر'' لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ فرہاد لاکھ تیشے چلاتا رہے خبثِ باطن کے پہاڑ میں راستہ نہیں کھوجا جا سکتا۔ جہاں تک ظاہری کیفیت کی بات ہے اب تو اس کا جاننا بھی آسان نہیں رہا۔ میک اپ کے ذریعے ماضی میں انسانی شکل کی بدصورتی کو خوبصورتی کا روپ دیا جاتا تھا۔ یہ روپ عارضی ثابت ہوتا تھا اور منہ دھوتے ہی بڑھاپے اور بدصورتی کے آثار نمایاں ہو جاتے تھے۔ بھری محفل میں جو صاحب اپنے خوبصورت بالوں کی وجہ سے جاذب نظر دکھائی دیتے وہ گھر میں تنہائی میسر آتے ہیں سر پر چٹیل میدان نمودار ہوتے ہیں خوف زدہ کرنے لگتے۔ پلاسٹک سرجرین اور کاسمیٹک سرجری نے انسان کے ظاہری نقائص بھی چھپا دیئے۔ اب تو ایسی ایسی پیوند کاری کی جاتی ہے کہ انسانی عقل ہی دنگ رہ جاتی ہے۔ کالی کلوٹی رنگت کی تبدیلی کے لئے انجکشن کا کورس مکمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کورس کے نتیجے میں جلد کی سیاہی ایسے ڈھل جاتی ہے جیسے نیب میں پلی بارگین کر کے لوگ اپنے کردہ گناہ دھو کر دامن پاک صاف کر لیتے ہیں۔ قوم کے اربوں روپے کھاؤ اور لاکھوں دے کر یا چند کروڑ دے کر نیک نامی اور شرافت کی سرکاری سند حاصل کر کے معاشرے میں سر اٹھا کر چلو۔ بالکل اسی طرح جیسے کل کے ''کالے خان'' چند ہزار خرچ کر کے گورا ہونے کے انجکشن لگانے کے بعد ماہ جبینوں کی جھرمٹ میں سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ اسی طرح چہرے پر وقت، حالات اور اعمال کی وجہ سے نحوست ٹپکنے اور جھریاں لٹکنے لگیں تو گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ اپنی ہم عمر خواتین کے بجائے اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کی عمروں کی خواتین کے لئے پرکشش شخصیت بن سکتے ہیں۔ بس آپ کو تھوڑی سی پیوند کاری کروانی ہوگی۔ کسی بھی پلاسٹک سرجن کی خدمات حاصل کریں، بھاری معاوضہ ادا کریں اور اپنے چہرے سے جھریوں کے ساتھ بڑی حد تک نحوست کو بھی اتار دیں۔ اگر آپ مشہور شخصیت ہیں یا کسی ٹی وی شو کے اینکر پرسن ہیں تو آپ کو اپنے پلے سے خرچ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ حالانکہ آپ لاکھوں روپے کما رہے ہوتے ہیں اور اس کاسمیٹک سرجن کی جیب ہی نہیں دراز تک نوٹوں سے بھر سکتے ہیں لیکن آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ وہ پلاسٹک یا کاسمیٹک سرجن برضا و رغب بلا کسی بغض و عناد کے آپ کی عمر رفتہ کو روکے رکھنے اور بڑھاپے میں جوان دکھائی دینے کے لئے آپ پر جتنی بھی پیوند کاری کر یا گا اس کی کوئی فیس نہیں لے گا بلکہ آپ کو سجانے اور سنوارنے کے دوران آپ کی ہی نہیں آپ کے دیگر اسٹاف کی بھی خوب آؤ بھگت کی جائے گی اور دو تین کیمروں کے ساتھ یہ پورا پروسیجر ریکارڈ بھی کیا جائے گا۔ بعد ازاں اس ریکارڈنگ کے کچھ حصے اشتہارات میں شامل کر کے اس ادارے میں دیگر مرغے پکڑنے کا مکروہ دھندہ جاری رہے گا۔

ہمارے یہاں پیوند کاری کے اس دھندے میں اس حد تک قانونی امور کا خیال رکھا جاتا ہے جس حد تک تیسری دنیا کے سیاست داں سیاست کے دوران خدمت کے جذبے کا خیال رکھتے ہوئے کسی بھی مرحلے پر وہ اپنی اپنے خاندان کی، اپنے قریبی ساتھیوں اور اپنے اقتدار کو طول دینے میں معاونت کرنے والوں کی خدمت کرتے ہوئے نہیں چوکتے۔ یعنی ان مشہور شخصیات کی خدمت بظاہر ان کی شہرت اور حیثیت کی بنیاد پر کی جا رہی ہوتی ہے لیکن یہ بھی اسی طرح کا فریب ہوتا ہے جیسا فریب پیوند کاری کے

ذریعے دیا جاتا ہے۔ متعلقہ سرجن یا ادارہ اس تمام خدمت کا بھاری بل تیار کرتا ہے اور یہ بل اپنے ہی ادارے کی ''سی ایس آر'' کی مد میں ظاہر کر کے حکومتی ٹیکس سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور قانون کے مطابق وہ اپنی آمدنی کا جو مخصوص حصہ سماجی خدمت کے لئے مختص کرنے کا پابند ہوتا ہے اس فرض سے بھی احسن طریقے سے آئیگی کا سرٹیفکیٹ ہمارے حکومتی اداروں سے حاصل کر لیتا ہے۔ اب یہ کیا کم سماجی خدمت ہے کہ جو اینکر اپنی عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہو جہاں اسے صرف اللہ اللہ کرنی چاہیئے وہ کمسن اور نوجوان خواتین کے ساتھ آپ کو ٹھٹھے لگاتا ہوا ٹی وی اسکرین پر دکھائی دے رہا ہو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پیوند کاری کے یہ ادارے ایسے پھل پھول رہے ہیں جیسے ہمارے حکمرانوں کے کاروباری ادارے۔ ایک زمانہ تھا جب پیوند کاری کو غربت اور سفید پوشی کا سمبل سمجھا جاتا تھا۔ آج کے جدید دور میں پیوند کاری ایک آرٹ بن گیا ہے۔ یہ بڑے لوگوں کا کھیل بن کر غریب کو مزید غریب کر گیا ہے۔ اب کوئی نہیں کہتا کہ ''کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا'' یقین نہ آئے تو کسی بھی بالوں کی پیوند کاری کرنے والے ڈاکٹر کے آپریشن تھیٹر کا دورہ کر لیں۔ وہ آپ کے ہی جسم کے اس اس حصے کے بال نکال کر آپ کے سر میں پیوند کاری کر رہا ہوتا ہے جہاں آپ بار بار دیکھنا بھی پسند نہ کرتے ہوں۔

بیوی

چار حرفی پہ نہ میں بھیج سکوں چار حرف
اس کی دہشت نے بدن سارا ہلا رکھا ہے
اس سے رہتے ہیں سدا سارے کنوارے محروم
ڈانٹ میں بیوی کی قدرت نے مزہ رکھا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بڑھاپے میں

وہ بیت گئے دن جب آزاد دل و جاں تھے
اب دل کی خبر مظہر تم شام و سحر رکھنا
ہے دردِ محبت سے اب دردِ کمر بڑھ کر
سامانِ سفر میں بس اک پین کلر رکھنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ابن الوقت

ہیں ابن، وقت سارے ہی تو آزما کے دیکھ
کیا چھوٹا کیا بڑا ہے کوئی درمیانہ کیا
اوقات کیا ہے تیری یہ کرسی سے اُٹھ کے دیکھ
''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

چار بار شادی

چار شادی کی اجازت عدل سے مشروط ہے
نام سورہ کا 'نساءٗ ہے، غور سے دیکھو میاں!
آرہی تھیں روتی دھوتی، لب پہ تھے شکوے گلے
ایک ملا جی کے پیچھے چار تھیں مُلّانیاں

تنویر پھول

پارلیمنٹ ہاؤس

منتخب ارکان ہیں یہ قوم کے
لنچ میں کھاتے ہیں جو مرغابیاں
جس جگہ ہوتا ہے ان کا اجتماع
جوتیوں میں دال بٹتی ہے وہاں

تنویر پھول

نرالا شوہر

مل گیا شوہر نرالا، گو غزالہ نام تھا
اُس کے چہرے کو ہمیشہ وہ کہے دیہاتی طباق
ٹانگ کو کہتا ہے کھمبا، پیٹ کو خالی گھڑا
چھیڑتا اُس کو ہے وہ روزانہ کرتا ہے مذاق

تنویر پھول

ایک سوال

گھی، دودھ، دہی دینے کے لئے
بے چاری چرتی تھی چارا
نقصان ترا کیا کرتی تھی؟
"مِری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا"

تنویر پھول

عجلت میں منگنی

منگنی تو کر لی شوق سے
اِک یار اپنا پھنس گیا!
ابا تھے ہیلی کاپٹر
بیٹی تھی انجن ریل کا

تنویر پھول

لال داڑھی

ننھے بچوں کو خوب بھاتے ہیں
بال ہیں لال لال داڑھی کے
بال سر کے تو ہو گئے کھچڑی
پک گئے سارے بال داڑھی کے

تنویر پھول

رات میں اُس کی گلی

نیند کے مارے حال بُرا ہے
گلی میں کتا بھونک رہا ہے
اُس کے میاں کو دیکھ کے سمجھے
اُس کا تایا یا چاچا ہے

تنویر پھول

نئی "جمہوریت" کی تعریف

اقبال متفکر تھے، بہت سوچ کے بولے
مردانِ خرد یونہی تو بولا نہیں کرتے
"جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"

تنویر پھول

آفت کا پرکالہ

ایک پرکالہ ہیں آفت کا، ذرا اِن سے ملیں
نام ہے ننھے میاں لیکن بڑے شیطان ہیں
آنکھ میں ان کی شرارت، بولنا آتا نہیں
اپنی خالہ جان کو کہتے ہیں، وہ "خلجان" ہیں

تنویر پھول

ریڈیو پروگرام "میں نہ مانوں" کی یاد

چھِن گئی کرسی، کیوں چھِنی کرسی؟
"میں نہ مانوں" کے لب پہ ہیں نعرے
"میں نہ مانوں" میں عکس بھارت کا
اب یہاں بھی یہ حال ہے پیارے!

تنویر پھول

مرچوں کے شوقین

مرغوب اُن کو مرچ بہت ہے بڑے عزیز
منہ میں لگائیں آگ، نہیں جس کا ہے دھواں
اب کثرتِ مروڑ سے بے حال شیخ جی
منہ سے گیا تھا پیٹ میں مرچوں کا کارواں

تنویر پھول

دولت باہر، ملک خالی

حال اپنا کیا بتائیں قوم کے یہ مذہبیں
کوئی سکہ، کوئی پائی، کچھ پراپرٹی نہیں
ملک میں دولت تھی جتنی، پارسل باہر ہوئی
کھا گئے سب لُوٹ کر یہ ملک وملت کے "امیں"

تنویر پھول

بکرا

ہم تو انس اب آپ ہی اپنی مثال ہیں
ہم سا کوئی ملے گا نہ قرب و جوار میں
مفلس غریب لوگوں سے نظروں کو پھیر کر
بکرا خرید لائے ہیں ستر ہزار میں

محمد انس فیضی

ران

اب شوربے قلیے سے یہ دل اوب چکا ہے
اے کاش کے ادلے کا ہی امکان نکل آئے
سسرال سے آیا ہے انس آج جو حصّہ
اللہ کرے اس میں کوئی ران نکل آئے

محمد انس فیضی

دو بیویاں

ایک کمرہ تھا انس اور بیویاں تھیں دو مری
کس طرح تم کو سناؤں اس گھڑی کا ماجرہ
کھینچتی تھیں اپنی جانب باعثِ حاجت مجھے
اک طرف شبنم تھی میرے اک طرف تھی حاجرہ

محمد انس فیضی

سعودی عرب

وہ گھومتی ہیں روز ہی ساحل کی ریت پر
کس شان سے میاں کا سہارا لیے ہوئے
جن کے خصم سعودی عرب ہیں گئے ہوئے
"بیٹھی رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے"

محمد انس فیضی

تضمین

نظران کی یاروں نہ جانے کہاں ہے
وہ چہرہ ہمارا تو کم دیکھتے ہیں
ہماری بھی نظریں کہیں اور ہیں اب
ہمیں جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

محمد انس فیضی

مولوی مطلوب

کام مجھ کو آ پڑا ہے مولوی مطلوب سے
روز صدمہ مل رہا ہے کیا کروں محبوب سے
میں نے سوچا تھا اکیلا ہوں وفا کی راہ میں
ان کا ٹانکا بھڑ گیا ہے پاس کے مرغوب سے

محمد انس فیضی

نورِ نظر

کسی بابا سے بس اِک بار میں ایسے ہی بولا تھا
دعا کیجے کہ ہو جائے محبت میں اثر پیدا
اب اکثر اپنے بچوں کی میں گنتی بھول جاتا ہوں
انس ہر سال ہو جاتا ہے اِک نورِ نظر پیدا

محمد انس فیضی

لفافہ

انس دیتا نہیں میں بھی کبھی دس بیس سے زائد
ہمیشہ کم کے چکر میں اضافہ بھول جاتا ہوں
کسی کے ہاتھ پیلے ہوں کسی کے پیر ہوں بھاری
میں اکثر ایسے موقع پر لفافہ بھول جاتا ہوں

محمد انس فیضی

باجی کی سہیلی

نہ کوئی ساتھ میں چاچی نہ ممانی تھی انس
گھر سے پردے میں وہ اس بار اکیلی نکلی
حال پوچھا تو مرے گال پہ مارا تھپڑ
یار برقع میں تو باجی کی سہیلی نکلی

محمد انس فیضی

VIP

مل جائے مقدر سے تو مل جائے وگرنہ
ہو لاکھ سفارش بھی تو بھائی نہیں ملتا
ملتے ہیں مسلمان سبھی عید پہ عارف
بس ایک یہ کم بخت قصائی نہیں ملتا

محمد عارف

کھُسر پھُسر

اڑوسن پڑوسن کو بتلا رہی تھی
بہت رازداری سے یہ ہولے ہولے
جہنم سے بدتر ہے وہ گھر کہ جس میں
بڑی عید سے پہلے بکرا نہ بولے

محمد عارف

سانجھا دکھ

اپنی اپنی محبوبہ پر مرتے ہیں
دیوانے ہیں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں
بکرے اور عاشق کا دکھ اک جیسا ہے
عید کے دن بھی دونوں باں باں کرتے ہیں

محمد عارف

دل تو دل ہے

مونچھیں اپنی کِل رکھتا ہے
داڑھی بالکل نِل رکھتا ہے
لمبے لمبے بال ہیں تو کیا
بکرا بھی تو دل رکھتا ہے

محمد عارف

پلیز!

اپنی پلکوں کے لنگر اُٹھاؤ کبھی
میرے دل کی یہ نیا چلی ہے ابھی
میں بھی پکڑوں یہاں پیار کی مچھلیاں
جال ڈالے ہوئے ہیں شکاری سبھی

خادم حسین مجاہد

ایک راز

تحریریں مری یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ چیزیں مگر تجھ کو ستانے کے لئے ہیں
یہ علم کا پنگا، یہ کتابیں، یہ رسالے
لوگوں سے فقط جان چھڑانے کے لئے ہیں

خادم حسین مجاہد

واہ نصیبا!

دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں
ہائے کیسے نصیب ہوتے ہیں
پھڈا ڈالیں کہیں پہ گھر والوں
اور کہیں پر رقیب ہوتے ہیں

خادم حسین مجاہد

واہ حیرتا!

جب سویرے یہ سُنا کہ گھر میں چوری ہو گئی
حیرتوں کے جال میں سمجھو کہ میں جکڑا گیا
بچ کے بیگم کی نظر سے چور آیا کس طرح
میں تو جب بھی دیر سے گھر میں گھسا، پکڑا گیا

شوکت جمالؔ

یہ سیاست کے پہلوان

یہ سیاست کے پہلوان یہ ہٹے کٹے
کھیلتے رہتے ہیں آپس میں یہ وٹے سٹے
بس دکھاوے کی ہے آپس کی یہ دھینگا مشتی
ایک تھیلی کے ہیں یہ اصل میں چٹے بٹے

شوکت جمالؔ

خطرہ

مجھے قبول ہے، کہنے کو تھا میں قاضی سے
کہ میرا دل، مرا برسوں کا آشنا بولا
ابھی بھی وقت ہے، مچھلی سے ہی سبق سیکھو
وہ جا کے پھنس گئی کانٹے میں جس نے منہ کھولا

شوکت جمالؔ

آئینہ

نظر انداز کر کے عاشق کو
حُسن کارِ ذیاں ہی کرتا ہے
کسی ہیرو سے عشق چہ معنی
ہیرو ہیروئنوں پہ مرتا ہے

نوید ظفر کیانی

یادِ رفتگاں

اب کہاں ہے وہ نشتروں کی بہار
طنز رخصت ہوا فگارؔ کے ساتھ
کچھ بھی باقی نہیں ہے محفل میں
شیروانی گئی خمارؔ کے ساتھ

آثم پیرزادہ

اُف گرانی!

ریٹ اتنے بڑھے ہیں جوتوں کے
کیسے جوتے خرید کر لاؤں
اب تو جوتوں کے واسطے آثم
سوچتا ہوں نماز پڑھ آؤں

آثم پیرزادہ

غنیمت شمارِ عمر

جوانی جا رہی ہے جانِ جاناں
گلابی پھول جوڑے میں سجا لے
ابھی کھل سکتے ہیں دو چار چھ گل
وکٹ گرنے سے پہلے رن بنا لے

آثم پیرزادہ

گزارش

کسی سے دل لگانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے
نظر کی چوٹ کھانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے
ترے کوچے میں ہی دو چار پڑ جاتے تو اچھا تھا
مرے محبوب تھانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے

آثم پیرزادہ

تو نہیں اور سہی۔۔۔

نہیں تیرے کہتے ہی دشمن ہمارے
علاقے میں دشواریاں اور بھی ہیں
تمھیں ہم سے نفرت اگر ہے تو کیا غم
محلے میں چنگاریاں اور بھی ہیں

آثم پیرزادہ

مصیبت سی مصیبت

حل نہیں ہے کوئی مصیبت کا
حال کیا ہو گا تیری محفل کا
خاک ہو گا علاجِ دردِ دل
ڈاکٹر خود مریض ہے دل کا

آثم پیرزادہ

نئے رند، نئے ساقی

بات میخانے میں پہلی سی نہیں ہے اب وہ
اب جو کم ظرف ہیں میکش تو پھٹیچر ساقی
شیخ کو جب نہ ملی رات، بھڑک کر بولا
تو بھی لوفر ہے ترا باپ بھی لوفر ساقی

آثم پیرزادہ

چہ را کارِ کند عاقل۔۔۔

گئے لیلیٰ سے ملنے کو جو ہم مجنوں کے ٹیلے پر
پلس کا وہ پڑا چھاپہ، وہاں یاد آ گئی نانی
ہمیں تھانے میں لے جا کر یہ بولا ہم سے تھانیدار
چرا کارِ کنند عاقل کہ باز آید پشیمانی

آثم پیرزادہ

مجبوری

نظر خراب ہوئی، عمر کیا بڑھی آثم
عجیب وقت ہے، کیا کیا دکھائی دیتا ہے
اِسی لئے تجھے کہتا ہوں پاس کو آ جا
مجھے قریب سے اچھا دکھائی دیتا ہے

آثم پیرزادہ

سب لال

خاک آئے گی اب بہار اِدھر
ہے خزاں میں گھرا چمن ہر سو
کنکروں کا پہاڑ ہے مطلوب
اِتنے شیطاں ہیں خیمہ زن ہر سو

آثم پیرزادہ

بھاڑ میں جاؤ!

دل جو کھویا ہے تو اسے آثم
ڈھونڈنے تم کباڑ میں جاؤ!
دل ہی جب جا چکا تو ایسے میں
تم حسیں ہو تو بھاڑ میں جاؤ!!

آثم پیرزادہ

محمد عارف

شاعری میں طنز و مزاح کا تصور

مصنف کی کتاب ''مزاحیہ غزل کے خدوخال: قیامِ پاکستان تا ۲۰۱۳ء'' مطبوعہ: ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'' کا ایک ذیلی باب

شاعری میں ظرافت کے ابتدائی نقوش حضرت امیر خسرو کے کلام میں بھی ملتے ہیں، لیکن مرزا جعفر زٹلی کے کلام میں یہ نقوش زیادہ واضح اور بھرپور ہیں۔ اس ضمن میں نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اردو میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طنز و مزاح کی صنف وجود میں آچکی تھی، جس کی مثال میں جعفر زٹلی کا کلام پیش کیا جاسکتا ہے۔''[۱]

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے نقوش ابتدا ہی سے ملتے ہیں، گو کہ یہ باقاعدہ تو نہیں لیکن بکھری ہوئی صورت میں مختلف شعرا کے کلام میں موجود ہیں۔ ابتدائی غزل گو شعرا کے ہاں زاہد، واعظ، رقیب اور محبوب وغیرہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ جب کہ نظم کی مختلف اقسام میں ہجو، شگفتگی یا بزلہ سنجی کی صورت میں طنز و مزاح کے یہ نمونے موجود ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''اردو کی مختلف اصنافِ شعری میں جا بجا طنز و مزاح کے نشانات شروع ہی سے ملتے ہیں۔ غزلوں کے متفرق اشعار اور مثنویات و قصائد کے بعض ٹکڑے اس سلسلے میں بآسانی پیش کیے جاسکتے ہیں۔''[۲]

مرزا جعفر زٹلی ذہین و فطین شاعر تھے۔ ان کا کلام طنز، ظرافت، ہزل گوئی اور مختلف ہجویات کا مرقع ہے، گو کلام کا بیشتر حصہ فحاشی، عریانی اور پھکڑپن پر مشتمل ہے لیکن اس کے باوجود زبان و بیان اور فن پر ان کی دسترس سے انکار ممکن نہیں۔ نظم و نثر ہر دو اصناف میں ان کے کلام کا غالب حصہ فارسی پر مشتمل ہے تاہم

اردو نظمیں اور ہجویات بھی قابلِ غور ہیں۔ ماہرینِ نقد ونظر کے مطابق جعفر زٹلی ہی اردو کا پہلا باقاعدہ طنز ومزاح نگار شاعر قرار پاتا ہے اس ضمن میں طاہر تونسوی کی رائے دیکھیے:

''طنزیہ ومزاحیہ شاعری کی ابتدا کے حوالے سے امیر خسرو کے کچھ اشعار بھی مزاح اور بزلہ سنجی کے نمونے پیش کرتے ہیں لیکن اردو کا پہلا باقاعدہ مزاح نگار جعفر زٹلی ہی ہے۔'' [۳]

معروف مزاح گو شاعر سرفراز شاہد، جعفر زٹلی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو کے پہلے طنز وظرافت نگار وشاعر مرزا جعفر زٹلی کا کلام اردو مزاحیہ شاعری کا عظیم ورثہ ہے۔'' [۴]

پروفیسر مظفر حنفی کے مطابق بھی:

''اردو کا پہلا اور کل وقتی طنز ومزاح نگار شاعر جعفر زٹلی تھا جس نے آج سے کم وبیش تین صدیاں پہلے کھٹوا نامہ، بھوت نامہ، بڑھوا نامہ جیسی دل چسپ ظریفانہ نظمیں لکھیں۔'' [۵]

جعفر زٹلی کے بعد اردو ظریفانہ شاعری کا اہم نام مرزا محمد رفیع سودا ہے۔سودا نے شاعری کی مختلف اقسام پر طبع آزمائی کی لیکن جو مقام انھیں ہجو گوئی میں حاصل ہوا اسے کوئی نہ پاسکا۔سودا کے عہد میں میر ضاحک، فدوی، بکین، بقا وغیرہ بھی ہجو کہتے تھے لیکن سودا کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔سودا کے بعد اس میدان کے دو اہم نام انشاء اور مصحفی ہیں جن کی چشمکیں بھی طنز وظرافت کے حوالے سے اردو شاعری کا حصہ ہیں لیکن اس کے باوجود محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''مرزا رفیع کی ہجویں ان کی کتب میں موجود ہیں۔مگر شیخ مصحفی، سیّد انشاء کی ہجویں چند بڈھوں کی زبانوں پر رہ گئی ہیں''[۶]

مزاحیہ شاعری کے اس دور کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے بھی دیکھیے:

''اسے خوبی کہہ لیجیے یا خرابی، حقیقت یہ ہے کہ اردو میں ہم قافیہ الفاظ حتیٰ کہ بے ڈھنگے، مہمل اور خواہ مخواہ ہنسا دینے والے الفاظ کی کثرت ہے۔اس کثرت کا اندازہ کرنا ہو تو مشکل زمینوں میں سودا، ذوق ،مومن،اور مصحفی و انشاء کے قصائد دیکھیے۔اگر ان الفاظ کو کسی وزن و بحر میں پڑھیں تو خود بخود ہنسی آجاتی ہے۔''[۷]

ان اساتذۂ سخن کے بعد نظیر اکبر آبادی ظریفانہ شاعری کا اہم نام ہے۔اردو کی مزاحیہ شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی اہمیت اور اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو ہجو گوئی سے نکال کر ایک وسیع تناظر مہیا کیا۔نظیر نے زندگی اور ماحول کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور انھی تجربات و مشاہدات کو موضوعِ سخن بنا کر عوامی شاعر کہلائے۔نظیر کی نظمیں ''آدمی نامہ''،'' پیسہ نامہ''، ''روٹی نامہ''، ''عید''، ''شب برأت''،''ہولی''، ''دیوالی''، ''بسنت'' وغیرہ نہ صرف اُس دور کی عوامی زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں بل کہ ان کے بعض حصے تو آج بھی تر وتازہ ہیں۔

ریاست رام پور کے نواب کلب علی خان انگریز گورنر سے ملاقات کیلئے بریلی گئے تو مرزا اسداللہ خان غالب بھی اُن کے ہمراہ تھے، انہیں دلی جانا تھا، چنانچہ بوقت روانگی نواب صاحب نے مرزا سے کہا ''مرزا صاحب،الوداع،خدا کے سپرد!''
مرزا غالب جھٹ بولے''حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا تھا،اب آپ الٹا مجھے خدا کے سپرد کررہے ہیں۔''

ازاں بعد اردو شاعری میں طنز ومزاح کے حوالے سے ایک رو ''ریختی'' کی صورت میں آئی۔صنفِ نازک کی زبان میں مخصوص زنانہ الفاظ ومحاورات وتشبیہات،نسوانی اشارے،جنسی کنائے اور فحش باتوں کا غزل کے اشعار میں بیان، ریختی ہے۔ریختی کا دور مغل سلطنت کے زوال کے بعد لکھنو میں شروع ہوا۔یہ مزاح کی پست قسم ہے۔بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

''ریختی کا موضوع اگر چہ عورتوں کے عشقیہ جذبات و احساسات اور ان کی زندگی کی دیگر کیفیات کا اظہار ہے تاہم ریختی میں عشق کا جسمانی پہلو غالب ہوتا ہے۔ معاملہ بندی اور بعض پست حرکات وتفصیلات ریختی کا موضوع ہیں جن کے بیان سے انسان ہیجان انگیزی کا شکار ہو۔اس اعتبار سے ریختی ایک فحش اور مبتذل صنف شمار ہوتی ہے''[۸]

اردو شاعری میں قدیم ترین ریختی میراں ہاشمی بیجاپوری کے کلام میں ملتی ہے جو کہ ''دکنی اردو'' میں ہے۔بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

''دکن کے شاعر میراں ہاشمی کو ریختی کا موجد مانا جاتا ہے''[۹]

یوں ہاشمی بیجاپوری اردو ادب میں ریختی کے موجد ہیں۔ان کے بعد سعادت یار رنگین اور انشاء اہم ہیں۔سعادت یار رنگین تو اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ انھوں نے ریختی کو اس طرح ترقی دی کہ ان کے تتبع میں جان صاحب، نازنین، عفا بیگم، عصمت، قیس وغیرہ نے اس طرزِ سخن کو اپنا کر اسے ترویج وترقی دی۔بقول پروفیسر مظفر حنفی:

''ریختی کے نام پر انشاء، جان صاحب، رنگین وغیرہ نے جو گل کھلائے ہیں ابتذال اور جنسی آلودگی کے باوصف ان میں بھی ہنسنے ہنسانے کے سامان کم نہیں ہیں۔''[۱۰]

کلاسیکی شاعری میں طنز و مزاح کے حوالے سے مرزا غالب اہم اور منفرد شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز و ظرافت اور شگفتگی کے ایسے عمدہ نمونے ملتے ہیں جو ان سے پیش تر کے شعرا کے کلام میں مفقود ہیں۔ فکر و فن کے ساتھ ساتھ شوخی اور شگفتگی بھی ان کے کلام کا خاصہ ہے اسی وجہ سے حالی نے انھیں ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ ویسے بھی:

''شاعری میں مطالعہ، مشاہدہ، ذوقِ سلیم کے علاوہ بنیادی عنصر ظرافت بھی ہے۔''[۱۱]

غالبؔ بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں لیکن ان کی شاعری میں موجود مزاح اور شگفتگی کے رنگ ایسے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ان کے کلام میں موجود ظرافت کے نمونے ایسی فکری بنیاد پر ایستادہ ہیں کہ یہ مضامین آج بھی تر و تازہ ہیں، اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے دیکھیے:

''قدیم شعرا میں نظیر اکبر آبادی اور غالب کے یہاں البتہ طنز و مزاح کے بعض بہت حسین اور کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ نظیر کا دائرہ صرف مزاح اور چٹکلے بازی تک محدود ہے لیکن غالب کے یہاں ظرافت و مزاح کے دوش بدوش طنزیہ شاعری کے شاہ کار بھی نظر آتے ہیں۔''[۱۲]

اردو شعر و ادب میں طنز و مزاح کے حوالے سے ''اودھ پنچ'' ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ مزاحیہ شاعری کے حوالے سے ''اودھ پنچ'' نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ''اودھ پنچ'' سے قبل کی بیش تر مزاحیہ شاعری فارسی مزاح کے تتبع میں تھی اس کے اجرا سے اردو شاعری میں طنز و مزاح کی اپنی الگ روش قائم ہوئی۔ ''اودھ پنچ'' کو منشی سجاد حسین نے لندن کے مشہور رسالہ ''لندن پنچ'' کی طرز پر شروع کیا۔ شاعری کے حوالے سے منشی سجاد حسین، جوالہ پرشاد برق، تربون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، احمد علی شوق، سیّد محمد آزاد، ستم ظریف، مرزا مچھو بیگ، ٹریڈ مارک، مولانا جنوبی، عرش لااُبالی اور اکبرالہٰ آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جب ''اودھ پنچ'' کا اجرا ہوا تو اس وقت تک مغلیہ سلطنت مکمل طور پر زوال پذیر ہو چکی تھی ،مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے معاشرے کی اکثریت اپنی ثقافت و روایات سے منہ موڑ کر مغربی افکار و اقدار کی گرویدہ ہو چکی تھی اسی وجہ سے یہ دور طنز و مزاح کی ترویج میں بہت اہم ثابت ہوا کہ اس وقت وہ تمام عناصر موجود تھے جو طنز و مزاح کی ترویج میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا۔ مغربیت کا سیلاب بڑھتا چلا آ رہا تھا، مشرق کو زوال نصیب ہو چکا تھا۔ اس لیے طبائع ہر اس چیز سے بیگانہ یا متنفر تھیں جس میں مشرقی آب و رنگ کی جھلک ہوتی۔ دوسری طرف ہر اس چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ تھیں جن میں مغرب کی چاشنی ہوتی۔''[۱۳]

''اودھ پنچ'' کا ایک نمائندہ نام اکبرالہٰ آبادی ہیں۔ اکبر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے صرف تفننِ طبع کے بجائے طنز و مزاح نگاری کو مکمل طور پر اپنا کر شاعری میں ایک نیا رنگ ایجاد کیا۔ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کا آغاز اکبر کی شاعری کا زمانۂ عروج ہے۔ یہ انقلابی دور تھا اس دور کے سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی مسائل پر آپ کا کلام ایسی مثال ہے کہ اردو طنزیہ و مزاحیہ شاعری ایسی کوئی اور مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان کی شاعری میں موازنہ، مزاحیہ صورتِ حال، لفظی بازی گری، مزاحیہ کردار، رمز اور پیروڈی وغیرہ مزاح کے تمام اماثل دستیاب ہیں۔ اکبر کے ہاں بزلہ سنجی اور انگریزی الفاظ کے استعمال کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ الغرض انھوں نے طنز و مزاح کو فکری و فنی سطح پر اتنے بھرپور طریقے سے استعمال کیا کہ اردو شاعری میں طنز و مزاح نگاری الگ

سے ایک رنگِ سخن کی صورت اختیار کر گئی۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''حیوانِ ظریف کا صحیح اطلاق اکبرالٰہ آبادی پر ہوتا ہے۔ وہ اردو کے تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری ظرافت کی جملہ اقسام پر محیط ہے۔ طنز و مزاح، ہجو ملیح، کنایہ، رمز، بزلہ سنجی، لطیفہ چٹکلہ اور پیروڈی غرض کہ ظرافت نگاری کی جتنی ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں، سب ان کے یہاں ملتی ہیں اور اس درجہ مؤثر و دلکش پیرائے میں کہ اردو کی شاعری میں نہ اُن سے پہلے اس کی مثال ملتی ہے نہ اُن کے بعد۔'' [۱۴]

''اکبر کے طفیل اردو کی مزاحیہ شاعری نے سنجیدہ و ثقہ حلقوں میں رتبۂ اعتبار حاصل کر لیا۔ اسے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مستقل موضوع اور اسلوبی صنفِ سخن کی حیثیت مل گئی۔'' [۱۵]

اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا معیار از اوّل تا آخر معدودے چند شعرا کے استثنا کے بہت اچھا نہیں رہا، بعض اوقات تو یہ ابتذال، عامیت، سوقیت اور پھکڑ پن کی سطح پر اتر آیا۔ تاہم جہاں بہت سے شعرا نے اسے محض وقت گزاری، دل لگی اور باہمی چپقلش میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کیا وہیں بعض شعرا نے طنز و مزاح کو سنجیدگی سے اپنا کر اسے سمت آشنا کیا اور اردو شاعری میں طنز و مزاح کی مضبوط روایت کو استوار کیا۔

قدیم و جدید اردو شاعری میں جگہ جگہ طنزیہ و مزاحیہ اشعار ملتے ہیں، جن میں سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی حوالے سے طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ میں مزاح گو شعرا کی تعداد اگرچہ بہت کم ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ سنجیدہ شعرا کے ہاں بھی طنز و مزاح کے نمونے دستیاب ہیں۔ بقول پروفیسر محمد طٰہٰ خان:

''ہمارے صفِ اوّل کے اساتذہ عام طور سے اردو اور فارسی زبانوں میں شعر گوئی کے علاوہ مزاحیہ اور طنزیہ اشعار کہنے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ ولی سے اقبال تک صفِ اوّل کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے طنز و مزاح کے میدان میں قدم نہ مارا ہو۔'' [۱۶]

حوالہ جات

۱۔ نثار احمد فاروقی، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مشمولہ: ''آج کل''، دہلی، ۱۹۷۴ء، شمارہ ۱۰، ص ۳

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص ۵

۳۔ طاہر تونسوی، طنز و مزاح، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۳

۴۔ سرفراز شاہد، اردو مزاحیہ شاعری، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، اشاعت دوم، ص ۱۵

۵۔ مظفر حنفی، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح، دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۰۳ء، ص ۹

۶۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء، ص ۲۸۱

۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، ص ۱۲

۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۶۶

۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، ص ۶۷

۱۰۔ مظفر حنفی، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح، ص ۱۲

۱۱۔ محمد طٰہٰ خان، پروفیسر، قرینۂ شعری، پشاور، جدون پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۹ء، ص ۱

۱۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، دیباچہ: شوخیٔ تحریر، سیّد محمد جعفری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۲

۱۳۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، نئی دہلی، جامعہ مکتبہ، دوسری بار، ۱۹۹۲ء، ص ۹۰

۱۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، ص ۱۵

۱۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، دیباچہ: شوخیٔ تحریر، سیّد محمد جعفری، ص ۱۳

اکبر الٰہ آبادی اور انور مسعود

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا تقابلی مطالعہ

آیئے دیکھتے ہیں اکبر کے دور میں مسلم اُمہ کو درپیش مسائل کون سے رہے؟

اکبر الٰہ آبادی اور انور مسعود کے عہد کا سیاسی تقابل

اکبر نے ۱۶/نومبر ۱۸۴۶ء میں آنکھ کھولی، تو ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کا سورج اپنے عروج کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت چھن چکی تھی اور وہ اپنے ہی ملک میں تیسرے درجے کی قوم کے طور پر زندگی کے دن بسر کرنے پر مجبور تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ نے مسلمانوں پر زندگی کے تمام شعبوں کے دروازے بند کر کے ان میں مایوسی کو فروغ دیا۔ اکبر کی جوانی تک حالات مزید بدل گئے اور عوام نے انگریزوں کے اقتدار کو آہستہ آہستہ قبول کرنا شروع کر دیا۔ مسلمان مصلحین نے جدید تعلیم اور روزگار کے لیے مسلمانوں کو انگریزوں سے مصالحت کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔ سرسید اور ان کے رفقا اس کام میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے انگریزوں کو مستقل حاکم تصور کر کے مسلم عوام کو ان کا وفادار بنانے کی انتھک کوششیں کیں:

''۔۔۔ مصلحین یہ خیال کرنے پر مجبور ہو گئے کہ انگریزوں کا تسلط اس قدر مضبوط ہو چکا ہے کہ اُن کو نکالنے کا خیال دل میں لانا نادانی ہے۔ چونکہ انگریز ہمیشہ ہندوستان کے حکمران رہیں گے اس لیے ان سے بگاڑ پیدا کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اب قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسے انگریزوں کی انتہائی وفادار رعایا بنا دیا جائے۔ انگریزوں سے حق نہ مانگا جائے، درخواست کی جائے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا محرک یہی ہے کہ انگریز ہمیشہ یہاں رہیں گے۔۔۔۔''

سرسید اور ان کے رفقاء مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے لیکن ایسے وقت میں بھی لوگوں

میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا اُبل رہا تھا اور مسلمان کئی مقامات پر انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریک نے احیائے اسلام کے باب میں انمٹ نقوش چھوڑے۔ سیّد احمد بریلوی شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے عملی جہاد کو اپناتے ہوئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ان دونوں بزرگوں نے مسلمانوں میں رواج پانے والے غیر اسلامی عقائد کو مسلم معاشرے سے ختم کرنے کے لیے اپنی کتابوں ''صراطِ مستقیم'' (سیّد احمد بریلوی شہید) اور ''تقویت الایمان'' (شاہ اسمٰعیل شہید) میں بہترین مشورے دیے جن کا تذکرہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنے مقالے میں کیا ہے:

''۱۔ ہندی ایرانی اور رومن عناصر کا اخراج جو مسلمانوں کے عقائد میں غلط فہمی کی بنا پر داخل ہو گئے ہیں۔

۲۔ اُن صوفیوں کی مخالفت جو شریعت کے قوانین کی پروا نہیں کرتے۔

۳۔ خدا اور رسول کے متعلق بے ادبی کی باتوں کی مخالفت۔

۴۔ اپنے مرشد سے بت پرستی کے انداز میں لگاؤ اور مزاروں کو سجدے کرنے کی ممانعت۔

۵۔ محرم کو ایک عوامی میلے کی طرح منانے کی مخالفت۔

۶۔ ہندو تہواروں میں شرکت، رشیوں کی خدمت اور ان کے مقدس مقامات کی زیارت کی مکمل ممانعت۔''

اکبرالٰہ آبادی کے عہد میں جمال الدین افغانی نے دنیائے اسلام کو سامراجی قوتوں کے پنجے سے نکالنے کے لیے جو اقدامات کیے ان سے اکبر بھی متاثر تھے۔ اکبر کا تعلق اُس طبقے سے تھا جو سرسید کے ہم خیالوں کے مخالف اور انگریزوں کی اندھا دھند تقلید کے برعکس اسلامی خیالات و نظریات کے حامی تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت تمام عالم اسلام کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں پرونے کی متمنی تھی اس لیے مشاہیرِ اسلام ان سب کے ہیرو تھے اور اکبر کا تعلق اسی اکثریتی طبقے سے تھا۔ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت ٹوٹتی تو ان سب کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ اکبر کی زندگی میں ہی مسلمانوں نے اپنی سیاسی قوت کے اظہار اور نمائندگی کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ (۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء) کی بنیاد رکھی۔ کانگرس کو مسلم لیگ کا قیام ایک آنکھ نہ بھایا اور انھوں نے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہونے سے روکنے کے لیے کئی معتبر مسلم رہنماؤں کو اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ مسلمانوں کی الگ سیاسی حیثیت کا تعین ہوتے ہی ان کے شعور وادراک میں اضافہ ہونے لگا اور وہ سیاسی معاملات میں حصہ لینے لگے۔ اکبر کی وفات تک مسلم لیگ نے مسلمانوں کی نمائندگی کا سہرا کافی حد تک اپنے سر پر سجا لیا تھا۔

اکبرالٰہ آبادی کی وفات کے ۱۴ برس بعد انور مسعود نے جنم لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی اقوام بالعموم اور مسلمان بالخصوص انگریزوں سے آزادی کے حصول کے لیے سرگرداں تھے۔ دیگر اقوام صرف ایک قوم، انگریزوں سے آزادی کی خواہاں تھیں جب کہ مسلمان فرنگی استعمار کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی چھٹکارہ چاہتے تھے۔ اکبر کے انتقال (۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء) کے وقت ہندوستان کی سیاسی صورتحال گھمبیر تھی اور آزادی کے آثار ابھی واضح نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برعکس انور مسعود کے ہوش سنبھالنے تک پُلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی گزر چکا تھا۔ انھوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا اور کئی خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے۔ امید کی شمعیں ہر جانب روشن و تاباں ہونے لگ گئی تھیں۔ اکبر نے جن مخرب رجحانات پر طنز کے تیر چلائے تھے، انور مسعود ان رجحانات کا خاتمہ بالکل قریب دیکھ رہے تھے لیکن ان کی یہ امیدیں اور تمنائیں اس وقت دم توڑ گئیں جب قائداعظم کی وفات کے فوراً بعد پاکستان کی خالق جماعت میں حصولِ اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ ذاتی مفادات پر قومی و ملی مفادات بے دریغ قربان ہونے لگے۔ اقربا پروری کے مظاہرے عام ہو گئے۔ جن سے آزادی کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے اپنے خون کے دریا بہا دیے، ان کے ساتھ ملکی معاملات پر مشورے ہونے لگے۔ الغرض قیامِ پاکستان کے بعد، جلد ہی مقاصد کا حصول پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ اسلامی اقدار سے ہٹ کر انگریزی اذہان کی جانب جھکاؤ رکھنے والے مملکتِ خداداد کے آقا بن بیٹھے اور منزل دور ہونے

لگ گئی۔ ایسے وقت میں انور مسعود نے وہی راہ اپنانے کا فیصلہ کیا جو ان کے پیش رو اکبرالٰہ آبادی کی راہ تھی۔ انھوں نے اپنے سنجیدہ کلام کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا لیکن اکبر کی طرح پذیرائی صرف ان کے طنزیہ و مزاحیہ کلام کو ملی۔

اکبر اور انور کے شعری موضوعات کا تقابل

اکبرالٰہ آبادی اور انور مسعود کے موضوعات میں حیران کن حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ اِن کے ہاں موضوعات کی یکسانیت کی بڑی وجہ دونوں کے ادوار میں مسلمانوں کا تنزل کی جانب سفر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اکبر کا عہد دوسری اقوام کے تسلط میں بسر ہوا اور انور کے عہد میں مسلمان اپنوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُس وقت جو خاندان انگریزوں کے لیے کام کرتے تھے، اب اُن کی اولادوں نے حکومتوں کی باگ ڈور سنبھال کر اُسی قانون قاعدے کو زندہ کر رکھا ہے۔ اکبر دوسروں کی غلامی پر نوحہ کناں تھے تو انور اُس سوچ اور فکر پر خون کے آنسو روتے ہیں جو یزیدی دور میں پیدا ہو چکی تھی اور اب ہم پر راج کر رہی ہے۔ اُس وقت ایک یزید تھا اور اب خاندانوں کے خاندان اُس کے پیروکار ہیں۔ اس لحاظ سے رسمِ شبیری ادا کرنے کا فریضہ انور مسعود نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے۔ اکبر و انور کے موضوعات میں مشابہت و تقابل درج ذیل ہے:

شیخ و مولانا کی مخالفت

اکبر اور انور دونوں اسلام کو مسلمانوں کی زندگی پر حاوی دیکھنا چاہتے ہیں۔ نماز روزہ اور دیگر فرائض کی پابندی میں دونوں شعرا برابر ہیں اور اسلام ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا ملتا ہے۔ تہذیب کے بدل جانے کو دونوں نے دل سے قبول نہیں کیا اور مسلمانوں کا ایک ''مقدس'' نشان جو مولانا، شیخ، زاہد اور واعظ وغیرہ کے ناموں سے جانا جاتا ہے جب اپنا رُخ نئی تہذیب کی جانب بدلتا ہے تو دونوں اس صورتِ حال پر اُسے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اکبر کے دور میں واعظ نے نئی تہذیب کا چولا ابھی پوری طرح نہیں بدلا تھا، وہ دھیرے دھیرے مغربی رنگ اپنا رہا تھا۔ اس کے برعکس انور مسعود کے عہد تک آتے آتے اُس نے وہ تمام روشیں اپنا لی تھیں جن پر پہلے فتوے صادر کرتا تھا۔ ہوائی جہاز جس میں بیٹھنا حرام قرار دیا گیا تھا کہ یہ مساجد کے اُوپر سے گزرتا ہے، اب اسی پر بیٹھ کر حج کیا جاتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر جو انگریزوں کی ایجاد سمجھ کر استعمال میں ہچکچاہٹ برتی جاتی تھی اب ہمسائیوں کی نیندیں حرام کرنے کے لیے ڈنکے کی چوٹ پر مستعمل ہے۔ ٹی وی کی ایجاد کے بعد عرصے دراز تک گھروں میں اس سے لطف اندوزی پر فتوے لگائے جاتے رہے اور آج وہی مولوی اپنے اپنے ٹی وی چینل کھولے عبرت کا نشان ہیں۔ ان دوغلی پالیسیوں پر اکبر و انور نے طنز کے جو نشتر برسائے، اُن کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

اکبرالٰہ آبادی:

ے واعظ تو بتاتے ہیں مسلمان کو کافر
افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے

ے مسلمانوں کو لطف و عیش سے جینے نہیں دیتے
خدا دیتا ہے کھانا شیخ جی پینے نہیں دیتے

ے تہذیبِ مغرب کی بھی ہے وارنش غضب
ہم کیا جنابِ شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

ے محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر اچھل کود آیا

انور مسعود:

ے کوئی ہو جائے مسلمان تو ڈر لگتا ہے
مولوی پھر نہ بنا دے اُسے کافر بابا

برسبیلِ تذکرہ اِک روز میڈم نے کہا
اپنے شوخ و شنگ اندازِ تکلم کے بغیر
میرا وعدہ ہے کہ گانا چھوڑ دوں گی میں اگر
مولوی تقریر فرمائے ترنم کے بغیر

جو ہے اوروں کی وہی رائے ہماری بھی ہے
ایک ہو رائے سبھی کی، یہ کچھ آسان نہیں
لوگ کہتے ہیں فرشتہ ہیں جنابِ واعظ
ہم بھی کہتے تو یہی ہیں کہ وہ انسان نہیں

کرپشن کا آغاز میری پیدائش کے کچھ دن بعد سے ہوا جب دادا جی نے میرا نام رکھنے کے لیے اندرونِ خانہ الیکشن کروانے کا حکم دیا۔ بڑے چاچا اس الیکشن کے منتظم تھے۔ پرچیاں ڈالی گئیں۔ سب نے اپنی اپنی پسند کے نام لکھوائے تھے۔ جب دادا جی نے اپنے مبارک ہاتھ سے پرچی نکالی تو اس پر میرا موجودہ نام لکھا تھا یعنی۔ارسلان۔

جوتوں کے ڈر کی وجہ سے بڑے چاچا نے دادا جی کی وفات کے بعد یہ انکشاف کیا کہ میرا پسندیدہ نام ارسلان تھا۔ اس لئے میں نے تمام پرچیوں پر ارسلان، ارسلان ہی لکھ دیا۔

ارسلان بلوچ

سیاسی نظام پر طنز

اکبر الٰہ آبادی نے اپنے زمانے میں انگریزوں کی جانب سے ملنے والے نظام پر دل کھول کر تنقید کی۔ وہ جبر اور غلامی کی موجودگی میں ملنے والی ممبری اور اختیار کو درخت کی جگہ پتوں کا ڈھیر کہتے تھے۔ اس نظام میں طاقتور کو اختیارات حاصل تھے جس کی مثال اکبر نے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے محاورے میں پیش کی ہے:

اُس کا گھوڑا جس کی کاٹھی
بھینس اُس کی جس کی لاٹھی

اک دل لگی ہے وقت گذرنے کے واسطے
دیکھو تو ممبروں کے ذرا ہیر پھیر کو
ایسی کمیٹیوں سے ہے پھل کا امیدوار
اکبر درخت سمجھا ہے پتوں کے ڈھیر کو

انور مسعود کے عہد میں بھی انگریزوں کا دیا ہوا وہی نظامِ سیاست قائم رہا جو انگریزوں کی دین تھا۔ علامہ اقبال کے بقول اس میں بندوں کو تولنے کی بجائے سروں کو گنا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک شریف شخص دو مجرموں کے مقابلے میں شکست خوردہ سمجھا جاتا ہے۔ عالمی غنڈا گردی اور کافرانہ نظام کے تحت ہونے والے انتخابات اور ممبران کا کچا چٹھا کھولتے ہوئے انور مسعود اس طرح چٹختے ہیں:

اپنی جمہوری ترقی کا قصیدہ پڑھ ضرور
لیکن اس کے بعد باقی عمر استغفار پڑھ

تمہاری بھینس کیسے ہے کہ جب لاٹھی ہماری ہے
اب اس لاٹھی کی زد میں جو بھی آئے سو ہمارا ہے
مذمت کاریوں سے تم ہمارا کیا بگاڑو گے
تمھارے ووٹ کیا ہوتے ہیں جب ویٹو ہمارا ہے

شاعرانہ اور ظریفانہ ہو گر ذوقِ نظر
زندگی میں جا بجا دلچسپ تشبیہیں بھی ہیں
ریل گاڑی اور الیکشن میں ہے اک شے مشترک
لوگ بے ٹکٹے کئی اس میں بھی ہیں اُس میں بھی ہیں

ووٹوں سے کہ نوٹوں سے کہ لوٹوں سے بنے ہیں
یہ راز ہیں ایسے جنھیں کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
اندر کی جو باتیں ہیں ٹٹولا نہیں کرتے

اسلام سے دوری

مسلمانوں کی بربادی اور محکومی کی سب سے بڑی وجہ اسلامی احکامات اور حقوق و فرائض سے غفلت ہے۔ جو خوبیاں اِن کو اقتدار، علم اور اخلاق کے عروج پر لے گئی تھیں اُن کو حریف قوموں نے اپنا کر مسلمانوں کو اپنا دستِ نگر بنا لیا۔ اللہ اور رسول ﷺ سے رشتہ توڑ کر گمراہی کی گہرائیوں کے دہانے تک پہنچ کر ہی مسلمان در بدر ہوئے۔ انگریزوں کی حاکمیت کا قائم ہونا مسلمان بادشاہوں کے شاہانہ و عیاشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ممکن ہوا اور ایک صدی سے زائد عرصے بعد ہمیں انگریزوں سے نجات ملی۔ اکبر نے اپنے دور میں مسلمانوں کو ہوش دلانے اور اسلام سے رشتہ جوڑنے کے لیے اپنی شاعری کو وقف کر دیا۔ ایسے سینکڑوں اشعار کلیاتِ اکبر کا حصہ ہیں جو مسلمانوں کا ناتا اللہ اور اُس کے دین سے قائم کرنے پر زور دیتے ہیں:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو

ایک بار میں نے اپنے ایک شاعر دوست سے سوال کیا "یار تم تو شادی سے پہلے بہت غمگین اور دُکھی شاعری کرتے تھے۔ لیکن جب سے شادی ہوئی ہے تمہاری تو زندگی ہی بدل گئی ہے۔ اب تو تم بہت طنز و مزاح ہی لکھتے ہو۔"
شاعر دوست نے جواب دیا "ابے او کمبخت، میں تو اب بھی اپنے دکھ اور مظلومیت کا اظہار کرتا ہوں جو تم کنوارے لوگوں کو طنز و مزاح لگتا ہے۔"

ارسلان بلوچ

جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

- مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر
لیکن اک عالمِ خموشی پایا

انور مسعود نے اکبر کا تتبع کرتے ہوئے مسلمانوں کو مذہب سے رشتہ قائم کرنے کی تلقین کی۔ اسلام کو مرکزِ حیات بنا کر حصول پاکستان کے مقاصد تک رسائی ان کا مطمحِ نظر رہا:

ہیں جس کے من میں لندن و پیرس بسے ہوئے
مکے سے اُس کے دل کی فضا کو قریب کر
یورپ کی یونین سے ہیں جس کو عقیدتیں
اسلام سے بھی اُس کو محبت نصیب کر

مسلمانوں کی ذہنی غلامی پر طنز

مسلمانوں کو ذہنی غلامی کا شکار بنانے کے لیے انگریزوں نے کئی چالیں چلیں۔ سب سے پہلے بڑے بڑے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جو رائے عامہ کو ہموار کرتے تھے۔ اس کے بعد تعلیم میں وہ تبدیلیاں کیں جو ان کے جانے کے بعد کالے انگریزوں اور کلرکوں کی ایک بڑی فصل پیدا کرنے کا سبب بنی۔ اسی تعلیم نے لوگوں کے ذہنوں سے رُوحِ مسلمانی نکال کر انھیں مغرب کا مستقل غلام بنا دیا۔ اکبر ہمیشہ اسی ذہنی غلامی کا مرثیہ پڑھتے رہے اور اُن کے بعد انور مسعود نے بہ حسن و خوبی یہ فریضہ انجام دیا:

اکبر الہ آبادی

- یہ سڑک کس سمت میں آخر نکالی جائے گی
آنے والی نسل کس سانچے میں ڈھالی جائے گی

- نقل مغرب میں جو چھوڑی ایشیاء نے اپنی اصل
گھٹ گئی شانِ عرب حسن عجم جاتا رہا

- میں کیا کہوں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی۔ اے کیا نوکر ہوئے پینشن ملی اور مر گئے

انور مسعود

حمیت ہو چکی ہے دل سے رُخصت
حیا سے آنکھ خالی ہو گئی ہے
بھلی قدریں بھلا بیٹھے ہیں بھیا
ہمیں روشن خیالی ہو گئی ہے

تعلیمی نظام پر طنز

اکبر ترقی کے مخالف ہرگز نہیں تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ مفید علم ضرور حاصل کیا جائے لیکن اپنی روایات اور دین و مذہب کے ساتھ علم کا سودا نہ کیا جائے بلکہ اللہ کے ساتھ تعلق استوار رکھتے ہوئے اپنی حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ عہدِ اکبر میں مسلمانوں نے سرسید اور ان کے ساتھیوں کی راہ پر چلتے ہوئے انگریزی زبان کو سیکھنے کی سعی شروع کر دی۔ انگریزی اداروں نے ان کو انگریزی زبان سکھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کے بدترین شکنجوں میں کسنا شروع کر دیا۔ تعلیم، معاشرت، معیشت، مذہب و اقدار وغیرہ سب کچھ بدیسی رنگ میں رنگی جانے لگیں۔

اکبر اس حق میں تھے کہ اپنی قومی تہذیب کی جڑوں کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ تعلق قائم رکھ کر ہی ناسازگار حالات کو سازگار بنایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس وقت کے جدید انگریزی رجحانات کی پُرزور مخالفت کی اور ان کی یہ مخالفت مٹتی ہوئی اقدار کو سنبھالا دینے کی کوشش تھی۔ سیاسی منظر کی تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو بدل لینا قومی وحدت اور غیرت و حمیت پر کاری ضرب

لگانے کے مترادف تھا۔ اکبر بھی سیاسی موسم کی تبدیلی پر بدل جانے کو بُرا خیال کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

اِک برگِ مضمحل نے یہ ''اسپیچ'' میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمھیں ؟
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں؟

جس بات میں تم شکست ملت سمجھو
اس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو
جو بندۂ نفس ہو مخالف اس کا
قومی غیرت کی اس میں قلت سمجھو

؎ پڑھ کے انگریزی میں دانا ہو گیا
کم کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

انور مسعود جدید تعلیم کے مخالف نہیں بلکہ اس بات کے حامی ہیں کہ تعلیم کی ترویج قومی زبان میں ہونی چاہیے۔ انگریزی زبان کی مخالفت اور اردو زبان کی مدافعت میں ان کے کئی اشعار زبانِ زدِ عام ہیں۔ اکبر نے کہا تھا کہ میں طلبا سے اس لیے کچھ نہیں کہوں گا کہ پہلے ہی ان کا نصاب بہت زیادہ ہے۔ ان دونوں بزرگ شعرا کا کلام نصاب کا حصہ بن چکا ہے اور انور مسعود کو تو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُن کی زندگی ہی میں اُن کا کلام کئی جماعتوں کے نصاب میں شامل ہے۔ انور مسعود نے بچوں کے نصاب میں شامل انگریزی کے مضمون کی مخالفت کی ہے:

دوستو انگلش ضروری ہے ہمارے واسطے
فیل ہونے کو بھی اک مضمون ہونا چاہیے

کبھی پھر گفتگو ہو گی کہ یہ سوغاتِ افرنگی
عموماً آدمی کی ذہنیت کیسی بناتی ہے
ابھی اتنا کہے دیتا ہوں انگریزی کے بارے میں
کچھ ایسی ڈھیٹ ہے کمبخت آتی ہے نہ جاتی ہے

خواتین کی بے پردگی پر طنز

مغربی تہذیب وتمدن کا سب سے بڑا تحفہ بے حیائی وفحاشی ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستانی معاشرے میں خواتین کو بے لگام کرنے کا آغاز کیا گیا۔ اکبر کے عہد سے انور مسعود تک آتے آتے فحاشی وعریانی کا یہ سیلاب تمام تر بند توڑ کر ہر قریہ میں داخل ہو گیا۔ حکمرانوں نے اس جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا اور ان کی بہو بیٹیاں جو پہلے ہی یورپی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں، کی دیکھا دیکھی عام خواتین نے بھی وہی روش اختیار کی۔ اکبر خوش قسمت تھے کہ انھوں نے صرف بے پردہ خواتین کو منڈلاتے دیکھا، انور مسعود کے عہد میں تو یہ بے پردگی کئی شکلیں بدلنے کے بعد اب عریانی و بے حیائی کی منزلیں بھی طے کر چکی ہے:

> ایک فضول سی تحقیق سے ثابت ہوا کہ دماغ کے زیادہ استعمال سے انسان گنجا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اکثر مرد حضرات گنجے اور خواتین کے بال لمبے ہوتے ہیں۔
> ارسلان بلوچ

اکبر الٰہ آبادی

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

؎ حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

؎ خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اُن کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

انور مسعود

اپوا کی پُر خلوص مساعی کے باوجود
اب تک ہے اک رویۂ پسماندگی یہاں
انور مجھے تو فکر ثقافت نے آلیا
باپردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں

بہت نہیں ہے نئی طرزِ پیرہن سے گلہ
مجھے تو اس سے فقط ایک ہی شکایت ہے
بٹن وہاں ہے ضرورت نہیں بٹن کی جہاں
وہاں نہیں ہے جہاں پر بڑی ضرورت ہے

رُخِ زیبا پلستر در پلستر
عجب کوہان سا باندھا ہے سر سے
ٹھٹھک کر رہ گئی ہے والدہ بھی
دُلہن آئی ہے بیوٹی پارلر سے

جدیدیت کا مذاق اُڑانا

اکبر نے انگریزوں کی ملازمت میں ہونے کے باوجود ان پر طنز کے نشتر چلائے۔ اکبر نے وطن کی غلامی سے زیادہ مسلمانوں کی اُس ذہنی غلامی کا ماتم کیا جس نے اپنی تہذیب وتمدن کو پسِ پشت ڈال کر مغربی تہذیب کا رنگ اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ اکبر دیکھ رہے تھے کہ عنقریب رائج الوقت قوانین وطریقے راہیِ ملکِ عدم ہو جائیں گے اور نئی روشنی فرنگی لبادے میں قومیت کی جڑیں کھوکھلی کر دے گی۔ اس حوالے سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

؎ یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

؎ کر لی ہے خوب میں نے نئی روشنی کی جانچ
مجھ سے بہت نہ کیجیے اب آپ تین پانچ
ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

؎ جو میری ہستی تھی مٹ چکی تھی، نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ ان کا دماغ میرا، خیال ان کا زبان میری

؎ مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

انور مسعود نے جدید تہذیب کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اس کے عاملین کی وہ خبر لی ہے کہ ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری اپنے معاصرین میں نمایاں ہو کر اُبھری۔ والدین، جن کو اسلامی طرزِ معاشرت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے مغربی معاشرہ انھیں عضوِ معطل سمجھ کر اولڈ ہاؤسز میں چھوڑ آتا ہے۔ مغرب پسندوں کو دیسی گھی سے بُو آنے لگتی ہے۔ مردوں نے عورتوں کی مشابہت اختیار کر لی ہے اور عورتیں بال کٹوا کر بغیر دوپٹے کے مرد بنی نظر آتی ہیں، اُوپر سے منہ کو موچنے سے نوچ کر عجیب صورتیں سامنے آ کر مشرقی تمدن کا مذاق اُڑاتی ہیں:

ذرا سا سونگھ لینے سے بھی انور
طبیعت سخت متلانے لگی ہے
مہذب اس قدر میں ہو گیا ہوں
کہ دیسی گھی سے بو آنے لگی ہے

؎ مرد ہونی چاہیے، خاتون ہونا چاہیے
اب گریمر کا یہی قانون ہونا چاہیے

اس مختصر جائزے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکبر الٰہ آبادی اور انور مسعود کی ذہنی کیفیات، سوچ کے انداز، مشاہدات، اُسلوب اور افکار میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ عہدِ حاضر کے بیشتر شعرا نے انور مسعود کی اس خصوصیت کو محسوس کرتے ہوئے انھیں اکبر ثانی کا خطاب دیا ہے۔ اکبر اور انور کے موضوعات میں اشتراک کے باوجود ان کے ہاں چند موضوعات میں تفاوت بھی ہے۔ انور مسعود نے معاشرتی بُرائیوں کو خاص ہدفِ طنز بنایا ہے جو اکبر کے ہاں موجود نہیں۔ چور بازاری، رشوت، سفارش، ملاوٹ، اقربا پروری، ماحولیات وغیرہ ایسے ہی موضوعات ہیں۔ اکبر کی شاعری میں خواتین کو بہت سے حوالوں سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اس طرح کا مواد کثیر تعداد میں کلیاتِ اکبر کا حصہ ہے۔ اسلامی تناظر میں کی گئی اکبر کی شاعری کی بہتات انور مسعود کے ہاں موجود نہیں ہے۔ افکار کی مکمل مماثلت انور مسعود کو اکبر ثانی کا لقب عطا کرنے میں پیش پیش ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انور مسعود اپنی فکر کے لحاظ سے عہدِ حاضر کا اکبر الٰہ آبادی ہے۔

احمد راہیؔ اور حبیب جالبؔ کہیں کھڑے تھے کہ اچانک ایک فقیر نے حبیب جالبؔ کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ احمد راہیؔ کچھ دیر تو یہ منظر دیکھتے رہے، پھر فقیر سے مخاطب ہو کر بولے ’’تمھیں علم ہے کہ تم آج تک فقیر کے فقیر کیوں ہو، اس لئے کہ تمھیں پتہ ہی نہیں کہ کس سے لینا ہے اور کسے دینا ہے۔‘‘

عبدالمنان

مزاحیہ شاعر، رنگین یا سنگین

شاعر معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ شاعری میں مزاح کا تڑکا لگ جائے تو کیا کہنے۔ وطن عزیز کی مردم خیز مٹی نے جہاں اور شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں گول نمونوں (رول ماڈلز) کو جنم دیا ہے وہیں طنز و مزاح کے میدان میں بھی کئی رول بلکہ رولڈ گولڈ شخصیات کی آبیاری کی ہے۔ آج کل جس طرح کی سنجیدہ شاعری ہو رہی ہے اسے سن کر پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور مزاحیہ شاعری پر رونا آتا ہے۔ ہمارے کچھ شاعر لافٹر لینے کے لئے ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں کہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ڈارون سچا تھا۔ ہمارے مزاحیہ شاعر اپنی شاعری میں رنگ بھرنے کے لئے صنف شاعری کے ساتھ سنگین مذاق کر جاتے ہیں۔

طاہر شہیر کو ہی لے لیجئے۔ شاعری ان کے منہ مبارک سے کیسے نکل جاتی ہے حالانکہ انہوں نے منہ پر لاک (فرنچ کٹ داڑھی) لگوایا ہوا ہے۔ یہ فرنچ کٹ داڑھی بھی عجیب چیز ہے اچھے بھلے آدمی کا منہ دیسی تالے جیسا بنا دیتی ہے۔ موصوف داد ایسے مانگتے ہیں جیسے نائیلون کی جوتیوں کے بدلے پیالے مانگ رہے ہوں۔ ان کی شاعرانہ بے بسی خود ان کے اس قطعے سے جھلک رہی ہے۔

بڑھاپے میں افیر کا بھی اڈ وانچ نہیں ہوتا\
اگر ہو جائے بھی ٹھیک سے مینج نہیں ہوتا\
وہاں واٹس ایپ سے لے کر فیس بک تک سب سپیڈ میں ہیں، یہاں گھنٹے میں مر کے دوسرا میسج نہیں ہوتا۔

منڈی بہاؤالدین کے ادریس قریشی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے رخِ زیبا پر حسن کی بارش ہو تو وہ کیسا لگتا ہے۔ ان پر تو حسن کی اتنی بارش ہوئی ہے کہ خاصے کیچڑ زدہ لگتے ہیں۔ بات کر رہے

ہوں تو باقاعدہ پان کھانے والی بکری لگتے ہیں۔ فیشن سینس اتنا ہے کہ کچھ اور نہ ملے اپنے جہیز کی رضائی کا ہی سوٹ سلوا لیتے ہیں۔ کردار کے غازی ہیں اور اپنے بارے میں موصوف خود ہی فرماتے ہیں کہ

شعر کہتا ہوں میں روانی سے
بات کرنی ہو جب زنانی سے

میں ہوں بچپن سے نکما اِس لئے شاعر بنا
میں جہاں جاتا ہوں میرے آگے مائیک کر دیا
میں ہوں نالائق مگر مجھ کو تو نالائق نہ کہہ
فیس بک پر مجھ کو بھی لوگوں نے لائک کر دیا

چائنہ کے ڈاکٹر یونس بٹ جواد حسن جواد بول تو نثر رہے ہوتے ہیں لیکن اصرار ہوتا ہے کہ یہ شاعری ہے۔اوپر سے داد بھی چاہئے ان کو۔ ان کا بھی ایک نثر پارہ ملاحظہ ہو۔

خودی کا مطلب ہوتا ہے سیلفی
یعنی اپنا فوٹو آپ

جناب عبدالحکیم ناصف جسے سے پہلوان نما قوال لگتے ہیں۔ ادا سے بھی پتہ نہیں لگتا شاعری کر رہے ہیں یا پہلوانی۔ شعر ایسے کہتے ہیں جیسے دھوبی پٹڑا مار رہے ہوں۔ ناصف صاحب کا تعلق کراچی سے ہے اس لئے داد بھی بھتے کی طرح مانگتے ہیں۔

خاموشی بزم سخن میں ہے یہ کانٹوں کی طرح
جس میں کانٹے ہوں وہ گلشن تو نہیں ہوتا ہے
بھائی بہنوں میں ہوں شاعر مجھے واہ واہ کہو
وہ واہ کہنا کرپشن تو نہیں ہوتا ہے

انور مسعود، سلیمان گیلانی اور سرفراز شاہد کا شمار مزاحیہ شاعری کے سرخیلوں میں ہوتا ہے۔ خالد مسعود جدید مزحیہ شاعری کے ٹرینڈ سیٹر ہیں۔
سرفراز شاہد صاحب محکمہ موسمیات میں ہیں۔ موسم کے بارے میں تو شاید کبھی کوئی صحیح پیش گوئی نہ کی ہو لیکن شاعری کے ذریعے بدعنوانی کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں۔

ضابطے جو تھے شرافت کے وہ توڑے ہم نے
گند کی پوٹ سے پیسے ہی نچوڑے ہم نے
خر تو خر ہیں یہاں کتے بھی نہ چھیڑے ہم نے
قوم کے پیٹ میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

دنیا میں آنسو پوچھنے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن ناک پوچھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ اسی طرح رُلانے والے تو بہت مل جاتے ہیں مگر ہنسانے والا کم ہی ملتا ہے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں اگر کوئی مسکراہٹیں بانٹ رہا ہے تو اس سے بڑھ کر کون ہوگا۔ معاشرتی ناہمواریوں کے ناسور کا طنز و مزاح کے نشتر سے تریاق کرنے والے طبیب قابل ستائش ہیں۔

نوید ظفر کیانی

گوروں کی بذلہ سنجیاں

جب معروف انگریزی شاعر جان ملٹن نابینا ہوا تو اُس کی شادی ایک بہت تیز مزاج خاتون سے ہوگئی۔

بکنگھم کے نواب نے اُس کے سامنے اُس کی بیوی کی تعریف کی اور اُسے گلاب سے تشبیہہ دی تو ملٹن نے کہا ''اگرچہ میرے پاس اب رنگوں کو جانچنے کا تو کوئی پیمانہ نہیں رہا لیکن بیگم صاحبہ کے گلاب ہونے کی بات پر میں بھی آپ سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ مجھے اِن کے کانٹوں سے ہر آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔''

مشہور انگریزی شاعر جان پوپ نے ایک بار موج میں آ کر اپنی بیوی سے کہا ''ساری دنیا پاگل ہے سوائے تمھارے اور میرے۔۔۔ بلکہ تم بھی میرے مقابلے میں کچھ کچھ پاگل ہی ہو۔''

مشہور انگریزی شاعر، ادیب اور محقق الیگزینڈر پوپ نوجوانوں سے بہت متنفر رہتا تھا، ایک بار اُس نے ایک نوجوان سے بڑی تحقیر آمیز لہجے میں دریافت کیا کہ کیا اُسے معلوم ہے کہ محقق کس کو کہتے ہیں؟

نوجوان نے جواب دیا ''محقق ایک چور ہوتا ہے جو دوسروں سے اُن کی کمائی تحقیقانہ پستول کی نوک پر چھین لیتا ہے۔''

مشہور انگریزی شاعر کولرج بُری گھڑسواری کے لئے مشہور تھا۔ ایک بار وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ کسی نے اُس سے مذاق اُڑانے کی غرض سے

پوچھا ’’آپ کو پتہ ہے کہ بالام (بائبل کے مطابق ایک بُرا کردار) کے ساتھ کیا ہوا تھا؟‘‘

کولرج اُس کی نیت بھانپ چکا تھا، چنانچہ فوراً جواب دیا ’’وہی ہوا تھا جو اس وقت مجھ سے ہوا ہے، ایک گدھا اُس سے بولنا شروع ہو گیا تھا۔‘‘

معروف انگریزی ادیب سڈنی سمتھ جب بیمار ہوا تو ڈاکٹر نے اُسے خالی پیٹ کے ساتھ صبح کی سیر کا مشورہ دیا۔

’’یہ کس سواری کا نام ہے؟‘‘ سڈنی سمتھ نے حیرانی سے پوچھا۔

انگریزی ادیب آسکر وائلڈ کی بیوی سے تلخ کلامی ہو گئی۔

اُس کی بیوی جل کر بولی ’’خدا کرے کہ میں مر جاؤں اور تمھاری شادی کسی چڑیل سے ہو جائے، تب تمھیں میری قدر آئے گی۔‘‘

آسکر وائلڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ’’ہمارے ملک کا قانون دو بہنوں سے شادی کی اجازت نہیں دیتا۔‘‘

معروف انگریزی مصنف اور سیاستدان پروفیسر تھورڈ راجر ۱۸۸۵ء کے الیکشن کے دوران ہونے والے ایک واقعے کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں کیا کرتے تھے۔ کنویسنگ کے دوران اُنہیں ایک مرتبہ خاصے جارحانہ ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سٹور والے نے اُنہیں نہایت درشت آواز میں کہا ’’ہرگز نہیں، میں آپ

کو ووٹ کسی بھی صورت نہیں دے سکتا، ووٹ دینے سے پہلے میں آپ کو جہنم میں دیکھنا پسند کروں گا۔‘‘

پروفیسر تھورڈ راجر نے نہایت نرم اور منحنی سی آواز میں کہا ’’ٹھیک ہے جناب، تب آپ فوراً سے پہلے وہاں پہنچیں، یقین مانئے مجھے وہاں اپنا منتظر پائیں گے۔‘‘

پروفیسر تھورڈ راجر ایک اور واقعہ کو بھی خاصے لون مرچ لگا کر بیان کیا کرتے تھے۔ پروفیسر تھورڈ راجر کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ نہ صرف زبانی بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے تھے بلکہ ان کے عملی مذاق بھی خاصے دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ اسمبلی سے اپنی نشست کھونے سے کچھ عرصہ قبل اُن کا رجحان دریائے ٹھیمس کی دگرگوں حالت کو بہتر بنانے کی طرف رہا تھا۔ اُنہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ میٹروپولیٹن بورڈ کے چیئرمین سر جیمز میکجیرل ہوگ کو اس امر پر مائل کیا جائے اور خاطر خواہ اصلاحات لائی جائیں لیکن ناکام رہے۔ سر ہوگ نے اس طرف مطلق توجہ نہ دی۔ آخر تنگ آمد بجنگ

آمد، تھورڈ راجر دریائے تھیمس کے ساحل پر گئے اور ایک بڑی سے بوتل میں بہت سا پانی اور تمام نمائندہ آلودگی بھر لی، اُس بوتل پر جلی حروف میں ''آبِ غسلِ ہوگ'' تحریر کیا اور پھر اُس کو ہاؤس آف کامن کے ہال میں عین درمیان میں لٹکا دیا۔ ہاؤس آف کامن کے ممبران نے اس کا بھرپور حظ لیا اور کئی دنوں تک اخبارات میں اس کا تذکرہ رہا۔

ایک اور واقعہ میں پروفیسر تھورڈ راجر نے جب ایک الیکٹرول سے اپنے لئے ووٹ کی استدعا کی تو اُس نے کہا ''میں آپ کے مقابلے میں شیطان کو ووٹ دینا پسند کروں گا۔''

تھورڈ راجر نے اپنے مخصوص دھیمے لیکن توانا فکاہی انداز میں کہا ''بہت بہتر جناب، لیکن اگر آپ کا دوست الیکشن میں کھڑا نہ ہوا تو ووٹ دیتے وقت مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔''

اُن کے اس مکالمے کا نتیجہ بہت بار آور رہا۔ انتخابات کا وقت آیا تو وہی شخص اُس کے پُرجوش حامیوں میں پیش پیش تھا۔

ایک صاحب نے ڈاکٹر گریگری ہاؤس کو راستے میں روک کر دریافت کیا ''کیوں ڈاکٹر صاحب، اگر آپ کو بہت زیادہ ٹھنڈ لگ جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گے؟''

فیس! ڈاکٹر نے نرم و نفیس لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

مسز سڈنز اور ڈاکٹر جانسن کے درمیان خاصا سیاسی تناؤ رہا ہے۔ ایک بار مسز سڈنز باہمی ملاقات کے لئے ڈاکٹر جانسن کے پاس گئیں۔ مسز سڈنز کے معاون مارک کو اُن کے لئے کرسی کا اہتمام کرنے میں ذرا سی دیر ہو گئی تو ڈاکٹر

جانسن کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی، اُنہوں نے برجستہ کہا ''دیکھ لیجئے محترمہ، آپ جہاں جاتی ہیں، کرسیاں آپ سے پہلے ہی احتجاجاً وہاں سے واک آؤٹ کر جاتی ہیں۔''

ایک بار ایک رات گئے کی پارٹی میں کسی نوجوان کو صاحبِ خانہ نے ذمہ داری سونپی کہ وہ لیڈی ورجینا وولف کو اُن کے گھر چھوڑ کر آئیں۔ راستے بھر نوجوان کا ذہن اسی تگ و دو میں رہا کہ کون سا ایسا موضوعِ گفتگو چھیڑا جائے کہ وقت کٹ جائے لیکن اُسے کوئی دلچسپ بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔ راستے میں اُن کا گزر ایک فارم ہاؤس سے ہوا، سڑک کے کنارے سرسبز چراگاہ پر بہت سی گائیں نظر آئیں، نوجوان کو

موضوع سوجھ گیا، اُس نے پُرلطف لہجے میں کہا ''کیوں مادام، کیا آپ کو یہ بات محسوس نہیں ہوتی کہ گائیں کس قدر ممتا بھری شخصیت کی حامل ہوتی ہیں؟''

ورجینا وولف کا فی الفور جواب تھا ''مجھے تو یہ بات محسوس نہیں ہوتی، ہاں البتہ کسی بچھڑے کو یہ بات ضرور محسوس ہو سکتی ہے۔''

پھر خاتون کو گھر ڈراپ کرنے تک اُن کے مابین کسی بھی موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

سیاستدان

افلاطون نے کہا تھا کہ ریاست سے سارے شاعروں کو نکال دینا چاہیے کیونکہ یہ معاشرے کو منفعل کرتے ہیں مگر میں کہتی ہوں کہ معاشرے سے سارے سیاستدانوں کو نکال دینا چاہیے کیونکہ یہ معاشرے کو بیوقوف بناتے ہیں۔ بلکہ یہ اپنے سوا ہر ایک کو بیوقوف بناتے ہیں۔ایک شاعر کی نسبت ایک سیاستدان زیادہ ملعون ومطعون ہوتا ہے۔شاعر کم از کم انسان کو لطیف احساس اور نشاط و کیف سے گزارتا ہے لیکن سیاستدان تو عوام کو سبز باغ دکھا کر صحرا میں دھکیل دیتے ہیں۔ دنیا میں زیادہ بیوقوف بنانے کا ٹھیکہ سیاستدانوں نے اُٹھا رکھا ہے۔ اِتنا ٹھیکیداروں نے کھوکھلے پلازوں، کمزور مکانوں اور دم پخت سڑکوں کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوگا۔

خدا نے سیاستدان کی سرشت میں سچ نہیں رکھا ہوتا اور جو سچ بولے وہ سیاستدان نہیں۔ شاعر اپنی اصلیت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے مگر سیاستدان وہ بہروپیا ہے جو مرنے کے بعد ہی اپنی اصلیت کیساتھ ظاہر ہوتا ہے، بلکہ خود ظاہر نہیں ہوتا ، دوسرے اسے ظاہر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک سیاستدان ایک بہروپیا ہے۔ایسا بہروپیا جو موقع محل کے مطابق سوانگ بدل لیتا ہے۔اگر ہمارے سیاستدان پڑھے لکھے ہوتے تو میں اُن سے گزارش کرتی کہ وہ ڈرامے لکھیں کیونکہ وہ ڈرامہ اچھا کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ سیاستدان اگر لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رکھتے تو وہ شیکسپئر سے بڑے ڈرامہ نگار ہوتے۔ارسطو نے اپنے اُستاد افلاطون کے نظریات کو غلط ثابت کیا۔اگر ہمارا کوئی سیاستدان ڈرامہ رائٹر ہوتا تو وہ شیکسپئر کے ڈراموں اور ڈائیلاگ کو غلط ثابت کر دکھاتا کیونکہ سیاستدان بذاتِ خود ایک چلتا پھرتا اور یجنل ڈرامہ ہے۔ قدرت نے سیاستدان میں ڈرامائی ارتقاء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔سیاستدان چھوٹا بڑا ڈرامہ خوب اچھی طرح کرنا جانتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ڈرامے کو کب ٹریجڈی اینڈ میں بدلنا ہے اور کب اس میں کامیڈی سین ڈالتے ہیں۔ وہ ڈرامے کو اپنی مرضی کیمطابق ڈھال لیتا ہے۔سیاستدان اگرچہ خود ایک کردار ہے لیکن وہ بیک وقت ڈرامے میں کئی پارٹ آسانی سے ادا کر لیتا ہے۔ سیاستدان ڈبل رول اور ڈبل ٹریک کے لئے تو خواہ

مخواہ ہی مشہور ہے وگرنہ اصلاً تو سیاستدان بیک وقت چھ کردار ادا کرنے کی زبردست صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہ چھ کردار وہ اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے یعنی اپنے چھ اطراف میں استعمال کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دنیا میں اگر سیاستدان نہ ہوتے تو دنیا کافی بہتر اور پُرسکون جگہ ہوتی مگر میرا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا میں اگر عورت کے دم سے رنگینی ہے تو سیاستدان کے وجود سے رونق اور ہلچل ہے۔

سیاستدانوں کی کئی قسمیں ہیں لیکن ہر قسم ہر قسم سے بڑی ہے۔ سیاستدان کبھی بنتا نہیں ہے، وہ ہمیشہ دوسروں کو بناتا ہے۔ سیاستدان ماں کے پیٹ سے بنا بنایا آتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے نکل کر دنیا میں آ کر وہ صرف پالش ہوتا ہے۔ دیسی اور ولائتی سیاستدانوں کے علاوہ پاکستان میں برائکر سیاستدانوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ پیدائشی یا وراثتی طور پر سیاستدان نہیں بنتے۔ بس کبھی سیاستدان بننے کا اُبال اُٹھا، شوق نے بے چین کیا کہ لیڈر بنیں اور پیسے کے بل بوتے پر لیڈر بن بیٹھے۔ برائکر سیاستدان شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں، کچھ عرصہ ہلا گلا مچاتے ہیں، اپنی پارٹیاں بنا کر پیسے بٹورتے ہیں، شور شرابا کر کے بڑی مشکل سے ایک آدھ آدمی اسمبلی تک پہنچتا ہے۔ یہ سراسر ''ون مین شو'' ہوتا ہے۔ برائکر سیاستدانوں میں طاہر القادری، عمران خان، مسرت شاہین وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

سیاستدانوں کی ایک قسم دیکھنے میں لاچار، مجبور، خداترس اور مسکین و یتیم نظر آتی ہے مگر ہوتی میسنی ہے۔ میسولینی بھی اِسی قسم کا سیاستدان گزرا ہے۔ دبنگ قسم کے سیاستدان اور حکمرانوں میں ماؤزے تنگ، گورباچوف، چواین لائی، نیلسن منڈیلا، آیت اللہ خمینی، مہاتیر محمد، ہٹلر، نپولین، چرچل، سٹالن اور بھٹو آتے ہیں۔

کچھ سیاستدان ''مخولیے'' بھی ہوتے ہیں۔ ویسے تو ہر سیاستدان ''مخولیا'' ہی ہوتا ہے جو عوام کو بیوقوف بنانے کے ''مالیخولیا'' میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بظاہر نہایت سنجیدہ ہوتے ہیں لیکن باتیں وہ کرتے ہیں جنہیں سُن کر پبلک کے پیٹ میں ہنسی کے گولے اُٹھتے ہیں اور سنجیدہ طبقے کو ان کے مخول پر ہول اُٹھتی ہے۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جو باتیں بڑی فراست کی کرتے ہیں لیکن چہرے سے کافی مجہول نظر آتے ہیں۔ ان کی ہیئت کذائی ایسی ہوتی ہے کہ اُنہیں دیکھ کر اکثر کو لاحول یاد آ جاتی ہے۔ تیسری قسم ان سیاستدانوں کی ہوتی ہے جو کبھی غصیلے نظر آتے ہیں اور کبھی ہنسوڑ۔

اکثر سیاستدانوں کو خدا نے قوتِ گویائی کی ایسی نایاب طاقت عطا کی ہوتی ہے کہ وہ قبر میں پاؤں یا دھڑ لٹکانے کے باوجود موقع ملتے ہی پوری قوت سے تقریر کر ڈالتے ہیں۔ سیاستدانوں کو خدا نے ''ایکسٹرا انرجی'' سے بھی نوازا ہوتا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ اکثر سیاستدان لمبی عمریں پاتے ہیں اور عوام کے لئے تنگئی ساماں و ساماں کا سبب بنتے ہیں۔ باچا خان، غلام اسحٰق خان، نوابزادہ نصر اللہ، پیر پگاڑہ، یاسر عرفات، واجپائی، معمر قذافی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ باچا خان کی تو قبر بھی کئی دن پہلے کھدوالی گئی مگر باچا خان مرنے پر تیار نہیں تھے۔ ایک بندہ (خدا اُسے معاف کرے اور ولی خان بھی معاف کریں) نے کہا ''باچا خان کی ابھی مرنے کی عمر نہیں تھی۔'' جس طرح ان کی قبر تیار کروائی گئی اور وہ بھی کئی دن تک نہ مرے تو مجھے یقین ہے کہ کسی نے چُپ کر کے اُنہیں ہمیشہ کے لئے سُلا دیا ورنہ یقین نہیں آتا کہ ایسی دبنگ سیاسی شخصیت مر بھی سکتی ہے۔

ویسے تو کچھ لوگ مرنے کے لئے نہیں صرف مارنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ سیاستدان بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں۔ اس بندے نے کہا کہ جب کوئی یہ ٹھان لے کہ اب فلاں کو دنیا سے گزر جانا چاہئے اور وہ نہ گزرے تو اسے گزار دیا جاتا ہے۔ یہ صدیوں سے بلکہ ازل سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ نواب زادہ نصر اللہ خان بڑی سدا بہار شخصیت تھے، وہ بھی سو کے ہندسے تک پہنچ گئے تھے کہ بچھڑ گئے۔ اپنی رحلت سے دو دن پہلے تک اُنہوں نے مختلف میٹنگز میں حصہ لیا۔ میاں نواز شریف اور بینظیر سے گپ شپ کی، صحافیوں کو انٹرویو دئے اور حکومت کو لتاڑا۔ ایک جگہ عوام سے خطاب بھی کیا اور دوسرے دن مر گئے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے ہمیشہ دو

باتوں کا بُرا منایا، ایک حکومت کی باتوں کا، دوسرے عمر پوچھنے کا۔ وہ لمبی لمبی باتیں کرتے، بڑی بڑی تقریریں کرتے، اونچے اونچے نعرے لگاتے، ساری زندگی کنبہ بڑھانے اور سیاست میں گنوادی البتہ اُنہوں نے شہرت اور دولت بے حساب کمائی۔ اُنہوں نے ہمیشہ اپنے لئے بڑے بڑے کام کئے۔ وہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی امداد بھی کرتے تھے۔

سیاستدانوں کے اصل ہونے کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے لئے ہمیشہ بہت بڑے کام کرتے ہیں اور عوام کے لئے بہت چھوٹے کام کرتے ہیں۔ وہ عوام کی جو مدد کرتے ہیں وہ بھی عالمی فنڈ یا لوگوں کے عطا کردہ چندے میں سے کرتے ہیں۔ اپنی جیب سے کبھی کسی سیاستدان نے کسی غریب، مجبور، مظلوم کی مدد نہیں کی ہے۔ شائد اس لئے کہ جانتے ہیں کہ اپنی جیب سے دئے گئے پیسے غریب کو نہیں لگیں گے۔ ان کی جیب میں عوام کی لوٹ کھسوٹ ہی کا تو پیسہ ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کے ذرائعِ آمدن کو حلال نہیں سمجھا جاتا، اسی لئے وہ اپنا پیسہ عوام پر خرچ کرنا حرام سمجھتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ سیاستدانوں میں سے اگر کوئی زکوٰۃ کی مد میں بنک کو پیسہ دے تو وہ بینک دیوالیہ ہو جاتا ہے۔

آج تک کوئی حکیم، طبیب، سنیاسی یا سائنسدان یہ نہیں جان سکا کہ سیاستدان کا خمیر خدا نے کس چیز سے اُٹھایا ہے۔ دانشوروں کا خیال ہے کہ سیاستدان دراصل ضمیر فروشوں کا گروہ ہوتا ہے۔ حکیم اور طبیب سیاستدانوں کو مالیخولیا کے مریض خیال کرتے ہیں۔ سائنسدان سیاستدانوں کو ان کے آباء واجداد کی حیرت انگیز ایجاد قرار دیتے ہیں اور عامل، سنیاسی، سیاستدانوں کو معجزہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیاستدان جنوں، بھوتوں اور شیطانوں سے بڑی مخلوق ہیں اور دنیاوی آفات کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے توڑ کے لئے کالے علم میں بھی جوڑ ڈالنا پڑتا ہے۔ سیاستدانوں سے نمٹنے کے لئے ان کے ہم پلہ سیاستدانوں کی ضرورت پڑتی ہے، جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، اس طرح سیاستدانوں کو سیاستدان کاٹتا ہے۔ جس طرح درزی اپنی ماں کا نہیں ہوتا اور ماں کے کپڑوں میں سے بھی کپڑا کھا جاتا ہے، بالکل اُسی طرح سیاستدان بھی اپنی بیوی کا نہیں ہوتا۔ حکمران بنتے ہی وہ اپنی بیوی کا حق اور وقت ہڑپ کر جاتا ہے۔ عموماً تخت سے اُترنے کے بعد سیاستدان کا تختہ ہوتا ہے، تب بیوی کو پتہ چلتا ہے کہ میاں موصوف عوام کی خدمت کی آڑ میں سوکن کے ساتھ گل چھرّے اُڑا رہے تھے۔ سیاستدان بیوی کو یہی بتاتا ہے کہ وہ میٹنگ میں ہے، یہ بہت بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی میٹنگ میں تھا اور میٹنگ کی وجہ سے ہی وہ مزید بیویوں اور ڈیڑھ درجن بچوں کا باپ بن چکا ہے۔ تفتیش پر آلۂ قتل ہی دریافت نہیں ہوتا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ بہت سارے شواہد بھی مل جاتے ہیں۔ عینی اور غیبی دونوں قسم کے گواہ بھی مل جاتے ہیں جو اس کارِ خیر میں شامل تھے۔ عموماً یہ عینی اور غیبی گواہ قریبی رفقاء ہوتے ہیں، جنہیں اس کام کے عیوض بھاری معاوضہ ادا کیا گیا ہوتا ہے۔ بہرحال اصلی بیوی یہ جانکاہ خبر سُن کر آگ بگولہ ہو جاتی ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کے نشے میں میاں موصوف نے پہلے ایک شادی رچائی اور ابھی دوسری بیوی کا بچہ ہوا تھا کہ جناب نے اقتدار اور مردانگی کے زعم میں تیسری شادی بھی رچالی۔ اب تیسری بیوی اُمید سے ہے اور چند ماہ تک تیسری بیوی سے دوسرا بچہ ہوا چاہتا ہے۔ پہلی بیوی کا پلّہ چونکہ ہر لحاظ سے بھاری ہوتا ہے، وہ حجم اور عمر کے لحاظ سے بھی بھاری ہوتی ہے۔ خاندانی ہونے کے علاوہ میاں کے چھ بچوں کی جائز اور قانونی ماں ہوتی ہے لہٰذا وہ میکے جانے کی دھمکی دیتی ہے، نیز بھانڈہ پھوڑنے کی بھی، چنانچہ میاں صاحب جو اقتدار سے باہر نکالے جا چکے ہوتے ہیں، اُنہیں چھٹی کے دودھ کے ساتھ ساتھ شہد اور گھٹی بھی یاد آ جاتی ہے اور وہ فی الفور شادی سے مکر جاتے ہیں۔ اقتدار کے دنوں میں جو مال کمایا تھا اس میں سے مولوی اور لاحقہ بیویوں کا منہ بھر کر چپ کرا دیا جاتا ہے تاکہ اصلی بیوی جسے سابقہ سمجھ کر نئی نویلی بیویوں کیساتھ دادِ عیش دے رہے تھے، منایا جا سکے۔ سابقہ بیوی جو گاڑیوں، بنگلوں، پلاٹوں اور بینک بیلنس میں گم ہو کر شوہر کی کاروائیوں سے لاعلم تھی، اب باخبر ہو کر ایسی خبر لیتی ہے کہ سیاستدان کی ساری سیاست دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ عوام کو اُلو بنانا آسان سہی، بیوی کو اُلو نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ وہ مونث ہوتی

ہے اور اُلو مذکر۔ بہرحال سیاستدانوں کا بہترین مشغلہ عوام کو اُلو بنانا اور بیوی کو مزید بنانا ہے۔ بیوی کو اُلو سے بھی بڑی چیز بنانے کے لئے تعریف کا ہتھیار کافی ہوتا ہے۔ سیاستدان بیوی کو بنانے کے لئے توصیفی کلمات کا سہارا لیتا ہے اور اُس کی توجہ ہٹانے کے لئے میٹنگز کا۔ ایک سیاستدان اقتدار کے اعلیٰ مسند پر متمکن ہوا تو اُسے اپنی بیوی موٹی، بھدی، عمر رسیدہ اور آوٹ آف ڈیٹ محسوس ہونے لگی۔ اُس نے ڈیٹ کھانے کے علاوہ ڈیٹ پر بھی جانا شروع کر دیا۔ ڈیٹس کے نتیجے میں اسے شادی کی ڈیٹ دینا پڑ گئی۔ بارات بھی گئی، ولیمہ بھی ہوا اور حجلۂ عروسی بھی سجا مگر بیچاری پہلی بیوی اور بچوں کو خبر تک نہیں ہوئی۔ عوام کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ راتوں کو پلوں کی نگرانی کرنے والا اور گلیوں میں گشت کرنے والا مامون الرشید جیسا حکمران کیا کام کر رہا ہے۔ اُنھیں کیا معلوم کہ عوام کی خدمت کی آڑ میں ''جنابِ اعلیٰ'' اپنی خدمت کر رہے ہیں۔ راتوں کی دیہاڑیاں رنگ لائیں۔ اُدھر اچانک جناب نے عوام کو مژدہ سنایا کہ شہر بھر کی سڑکیں پیرس کی سڑکوں جیسی بنادی جائیں گی۔ پھر اُنھوں نے ایک زبردست پُل راتوں رات تعمیر کروایا جس سے وہ دو گھنٹے کی مسافت صرف پندرہ منٹوں میں طے کرنے لگا۔ اچانک جنابِ اعلیٰ کا تختہ دھڑن ہوا اور پتہ چلا کہ ایک خاتون گود میں بچہ اُٹھائے ہوئے جنابِ اعلیٰ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں۔ جب پہلی بیوی کو خبر ہوئی تو اُس نے جنابِ اعلیٰ کی وہ خبر لی اور ایسی جھاڑ پونچھ کی کہ جناب کو دوسری بیوی سے تائب ہونا پڑا۔

سرحد کے ایک وفاقی وزیر نے اپنی بیٹی سے چھوٹی عمر کی لڑکی سے ہوٹل میں شادی رچائی۔ غریب لڑکی کو کسی سیاستدان کی بیوی بننے کا ازحد شوق تھا تاکہ وہ بھی بیگم صاحبہ کہلائے اور اپنے صاحبِ اقتدار شوہر کے پہلو میں بل کھا کر، اِترا کر چلے۔ لڑکی غریب گھرانے کی تھی مگر تعلیم یافتہ تھی۔ وزیر صاحب نے پہلی بیوی کو ہوا نہ دی۔ ایک دن نئی بیوی ہمرکاب تھی کہ پرانی بیوی سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ اُنھوں نے نئی والی کو سمجھایا کہ پرانی کو نہ بتانا، جب وزیرِ موصوف نے پرانی والی کا نئی والی سے تعارف کرایا تو نئی والی بڑے تپاک سے بولی ''اچھا تو یہ ہیں آنٹی؟''

پرانی والی جہاندیدہ تھی، اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی ''ہاں میں ہوں تمھاری آنٹی، تمھارے انکل کی چہیتی بیوی، ارے یہ آپ اپنی منہ بولی بیٹی کو کدھر لے جا رہے ہیں؟ اسے تو آپ نے نوکری دینی ہے تو گھر بھجوا دیں، میری صفائی والی گئی ہوئی ہے، یہ جوان اور تگڑی ہے، صفائی کرنا خوب جانتی ہوگی، میں اسے صفائی اور گھوڑوں کی مالش کے لئے رکھ لیتی ہوں۔ یوں کب تک ماری ماری پھرے گی۔ ہمارے باورچی کی ماں بھی اپنے چھوکرے کے لئے جاب والی لڑکی ڈھونڈھ رہی ہے، اس کی باورچی سے شادی کروادوں گی۔ بیچاری کا بھلا ہوجائے گا۔''

وزیر صاحب اپنی پرانی بیوی کی وارننگ بھانپ گئے اور پرانی بیوی سے کہا کہ تم ہی میری پہلی اور آخری بیوی ہو، یہ تو ویسے ہی ذرا۔۔۔''

نئی والی یہ سُن کر آنکھیں دکھانے لگی مگر موصوف وزیر نے کہا کہ یہ میرے پاس نوکری کے لئے آئی تھی، کہتی تھی کہ گاؤں سے آئی ہوں، میں نے ہوٹل میں ٹھہرا لیا کہ جب تک اس کا کام نہیں ہوتا، یہ میرا کام کرتی رہے۔''

لڑکی نے چابکدستی دکھاتے ہوئے پرس سے نکاح نامہ نکالا مگر پتہ چلا کہ وزیرِ موصوف نے کوئی گھاس نہیں چری ہوئی تھی، جس نکاح نامے کے بل پر لڑکی اکڑ رہی تھی، وہ جعلی نکلا۔

سیاستدانوں کے سیاہ کارناموں میں ایسے کئی رنگین کارنامے بھی ہیں جو اِن سیاہیوں کو سرخیوں میں بدلتے رہے اور جب تک برسرِ اقتدار رہے۔ لوگوں کو دفتروں اور گھروں کے آگے کھڑا کر کے ''میٹنگ'' کے نام پر ''چیٹنگ'' کرتے رہے۔ لوگ درخواستیں پکڑے صبح سے شام تک انتظار گاہ میں بیٹھے رہتے اور خوابگاہ میں محوِ استراحت رہتے۔ دھڑن تختہ ہونے پر اکثر بعد میں افشا ہوئے اور بدنامی سے پہلے ان کا خاتمہ بالخیر کردیا گیا۔

سیاستدانوں کے معاشقوں اور شادیوں پر لکھنے کے لئے میر امن، رجب علی بیگ سرور اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسا قلم اور دماغ چاہیے کیونکہ ہر سیاستدان ایک چلتا پھرتا پرزہ۔۔۔ اوہ

معاف کیجئے گا کہ چلتی پھرتی داستانِ امیر حمزہ ہے بلکہ داستانِ الف لیلہ ہے۔ ہر سیاست، ان کسی نہ کسی حسینہ کی زلفوں کا اسیر ضرور ہوتا ہے، خواہ خود بے زلف ہی کیوں نہ ہو۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ گنجے افراد زیادہ حسن پرست ہوتے ہیں اور گنجے یعنی فارغ البال سیاستدان تو بڑے عاشق مزاج واقع ہوئے ہیں۔ وہ حسینوں کی زلفوں میں اپنی ''ٹنڈ'' چھپا لیتے ہیں۔

گنجے خود کو حسینوں کی زلفوں میں چھپا لیتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
سو پردوں میں چھپ کر سب کچھ کیا کرتے ہیں
پول کھلتے ہیں ان کے جب ان کو ہٹا دیتے ہیں

اگر صرف سیاستدانوں کے کارناموں پر کتاب لکھی جائے تو یہ دنیا کی سب سے بڑی اور ضخیم کتاب ہوگی اور یہ واحد کتاب ہوگی جسے اَن پڑھ بھی پڑھنا چاہیں گے۔ اللہ بھلا کرے (ویسے تو اللہ کی مرضی نہیں ہے) ہمارے ایک سدا بہار سیاستدان غلام مصطفیٰ کھر جن کے بارے میں ایک ہزار ایک لطیفے مشہور ہیں اور جن کی سیاست لڑکیوں، بچوں، بیویوں اور شادیوں کے گرد رقص کناں ہے۔ دیکھنے میں وہ اب بھی چالیس سے زیادہ کے نظر نہیں آتے، یہ الگ بات ہے کہ اب وہ اسّی کے ہونے والے ہیں۔ عموماً خواتین اپنی عمر اور خوبصورتی کا راز چھپاتی ہیں لیکن وہ دنیا کے واحد مرد ہیں جو اپنی جوانی اور عمر کا راز افشاء نہیں ہونے دیتے۔ اُنہوں کبھی اپنی عمر صحیح نہیں بتائی اور نہ ہی اپنے بچوں کی تعداد صحیح بتائی بلکہ اُنہوں نے تو کبھی اپنی شادی کی تعداد بھی صحیح نہیں بتائی۔ پاکستان کے ہر صوبے اور ہر ضلع سے ان کی کوئی نہ کوئی سابقہ یا لاحقہ بیوی برآمد ہو جاتی ہے۔ مصطفیٰ کھر بھی ہڑپہ اور موہنجو داڑو کا شہر ہیں کہ جتنی کھدائی کرو، اُتنے ہی نوادرات برآمد ہوتے ہیں۔ میں نے ۱۹۹۰ء میں ان سے انٹرویو کیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ جناب میں نے صرف آٹھ شادیاں کی ہیں جبکہ ایلزبتھ ٹیلر نے تو نو شادیاں کی ہیں مگر لوگ اسے تو کچھ نہیں کہتے، میرے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بچوں کا سکور کیا ہے تو بولے کہ دس بچے ہیں۔

میں نے کہا کہ دس کے بعد بس؟ کیا یہ فائنل سکور ہے؟ بولے ''اللہ کے کاموں میں کیا دخل، ابھی تو شروعات ہیں''۔

بچوں کی ابتدا ہے کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ دل پہ ہے نہ نکاح ہے حساب میں

پنجاب کے سابق گورنر مصطفیٰ کھر یہ انٹرویو فون پر دے رہے تھے اور لاہور ائرپورٹ سے بات کر رہے تھے، ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مصطفیٰ کھر کا اسلام آباد سے فون آیا اور وہ بوکھلائے ہوئے بولے ''معاف کیجئے گا، میں بیویوں اور بچوں کی تعداد غلط لکھوا گیا، مہربانی کر کے ریکارڈ درست کرلیں، ورنہ میری نئی نویلی دلہن ناراض ہو جائے گی۔ میری بیویوں کی تعداد نو ہے، میں نے پچھلے سال شادی کی تھی۔ میری نویں بیوی سے ایک بیٹا ہے۔ اس حساب سے میرے بچے گیارہ ہیں بلکہ وہ دوبارہ ماں بننے والی ہے۔ آپ یوں کریں، دس کے بجائے ''بارہ'' ہی لکھ دیں۔ چند ماہ بعد بارہواں بھی دنیا میں آجائے گا۔''

مصطفیٰ کھر کی بلا کی یادداشت اور نیت کمزور ہو مگر نظر اور دل قطعاً کمزور نہیں ہیں۔ اِن کی چوتھے نمبر کی بیوی تہمینہ درانی (یعنی کہ سابقہ اہلیہ) کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ کھر ایک منجھے ہوئے سیاستدان ہیں۔ وہ اپنی دس بیویوں سے اِتنے ''منجھے'' ہیں کہ اُنہیں ''منجھنے'' کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر اُنہیں شادیوں کا چسکا نہ پڑا ہوتا تو وہ اب تک اِس ملک کے گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں وزیرِ اعظم بن چکے ہوتے یعنی تین بار وزیرِ اعظم بننے کی سعادت حاصل کر کے اس وقت تک کم از کم دو دفعہ صدر بن کر تیسری بار پھر اُمید سے ہوتے۔ افسوس کہ مصطفیٰ کھر نے اپنی سیاسی طاقت کو شادیوں کے شغل میں ضائع کر دیا۔ اُنہوں نے گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں بار (یعنی ذوالفقار علی بھٹو کے بعد) وزیرِ اعظم بننے کے بجائے گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں شادیاں بھی کر ڈالیں۔ ان کے اصل بچوں کی تعداد جاننا تو سمندر میں موتی ڈھونڈنے کے مترادف ہے کیونکہ ان کی ہر بیوی نے کم از کم ہیٹ ٹرک ضرور کیا ہے جبکہ تین بیویوں نے علی الترتیب چار، پانچ اور چھ کا ریکارڈ بھی قائم کیا ہے۔ نادمِ تحریر ان کی ۱۹ سالہ بیوی ''عیونا'' اپنے ۷۹ سالہ

شوہر کے تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہیں۔ مصطفیٰ کھر کے چوتھے نمبر کی سابقہ کا کہنا ہے کہ خدا نے غلام مصطفیٰ کھر کو توانائیوں کا ذخیرہ عنایت کیا ہے۔ اگر وہ کسی بانجھ عورت کو بھی ہاتھ لگا لیں تو وہ حاملہ ہو جائے۔ ان کی سابقہ اہلیہ کا کہنا ہے کہ اگر مصطفیٰ کھر اپنی توانائیوں کا رُخ قومی کاموں کی طرف موڑ دیتے تو بہتوں کا بھلا ہوتا۔

مصطفیٰ کھر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کائیاں صحافی نے کہا کہ شکر ہے، موصوف کی توانائیوں کا رخ شادی بیاہ پر مرکوز رہا۔ خدانخواستہ وہ وزیرِ اعظم یا صدر بن جاتے یا قومی اور سماجی کاموں میں اپنی توانائی بروئے کار لانے لگتے تو مردوں کو اپنی خفت اور عزت چھپانے کے لئے صوبہ بدر یا ملک بدر ہونا پڑتا۔

ایک دل جلا صحافی بولا کہ یہ تو ان کی رجسٹرڈ شادیوں کا ریکارڈ ہے، ہم تو تب جانیں، جب غیر رجسٹرڈ شادیوں کا کوئی کھوج لگا کر دکھائے۔

بہر حال یہ تو صحیح ہے کہ خدا نے غلام مصطفیٰ کھر جیسی بہت کم شخصیات پیدا کی ہیں۔ یہ تو ان کی شخصیت کا ایک رُخ ہے اور وہ بھی ایک جھلک، اگر ان کی ہر ڈیٹ پر روشنی ڈالی جائے اور سوانح حیات مرتب کی جائے تو لکھنے والا بوڑھا ہو جائے گا اور کم از کم اس کی دو نسلیں مل کر پوری کتاب لکھ سکیں گی۔ پنجاب کی اس ہر دلعزیز، سدا بہار، روشن خیال، شادی کے امیدوار سیاستدان کی شخصیت سے کئی سیاستدانوں کے کردار اُجاگر ہوتے ہیں۔

سیاستدانوں کو قدرت نے موقع محل کے مطابق بھیس بدلنے کی زبردست صلاحیت سے نوازا ہے۔ جب وہ حکمران بنتے ہیں تو اس کی صلاحیت کو چار چاند بلکہ چودہ چاند لگ جاتے ہیں۔ ابھی وہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے گردان اکڑائے باہر آ رہے ہیں، ادھر صحافیوں کو دیکھتے ہی شیر و شکر ہو گئے۔ صحافیوں نے ان کا جوس بھی پیا اور جوس بھی نکالا حالانکہ اُنہیں ایک جلوس میں جا کر عوام کا جوس نچوڑنا تھا۔ توانائی بحال کرنے کے لئے سیاستدان نے سیب، انار، مسمی کا جوس پیا۔ ڈکار لی۔ طاقت کا کیپسول لیا اور چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد ایوانِ صدر گئے تو چائے کے لوازمات کے ساتھ "جی جی" کی گردان اور تابعداریوں، چاپلوسیوں اور خوشامد کے وہ وہ مظاہرے کئے کہ صدر نے اُٹھ کر وزیرِ اعظم کو گلے لگا لیا۔ باہر نکلے تو ایک فنکشن میں عوام کی بھاشا بولنے لگے۔ عوام کی بھلائی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کئی ارب کے منصوبے پیش کئے، کئی کروڑ کے اعلانات کئے، کئی لاکھ کے چیک کاٹے اور کئی ہزار ہال میں موجود ضرورتمندوں میں تقسیم کئے۔ منصوبے، اعلانات اور چیک نہ کبھی کیش ہوئے اور نہ پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ایک گھنٹے بعد ایمرجنسی وارڈ میں گئے جہاں بم دھماکے کے زخمی داخل ہیں۔ حکمران کی آنکھیں ڈُبڈبا گئیں۔ اُنہوں نے دہشتگردوں کی اینٹ سے اینٹ بجالانے کے احکامات جاری کئے۔ اسی وقت کئی لاکھ کے چیک بھی تقسیم کروائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے منسٹروں کے ساتھ لنچ کر رہے ہیں اور قہقہوں کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ فرسٹ لیڈی کے ساتھ فون پر اپنے اگلے روز کا پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے یعنی کل صبح وہ امریکہ کے صدر سے ملنے جا رہے ہیں۔ اِتنے میں کچھ بے تکلف دوستوں کا ٹولہ آ گیا، ان کے ساتھ دلچسپ لطیفہ بازی ہوئی۔ حکمران نے تھوڑی دیر بعد تھری پیس کا سوٹ اُتار کر سفید شلوار قمیض زیب تن کیا۔ اب وہ بم دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کے گھر جا رہے ہیں جہاں ان کی نمازِ جنازہ تیار کھڑی ہے۔ حکمران کا چہرہ کرب اور دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ نمازِ جنازہ کے بعد اُنہوں نے جنازے قبرستان جانے سے پہلے ایک مختصر مگر مدلل اور جذباتی تقریر کی کس کا لب لباب یہ ہے کہ دہشت گردوں کو چوبیس گھنٹوں میں پکڑ کر کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے اور یہ کہ معصوم بے گناہ شہریوں کی لاشوں کو دیکھ کر وہ آج صبح سے سخت آزردہ ہیں۔ وہ صبح سے کھانا بھی نہیں کھا سکے ہیں۔ امریکہ کا دورہ ملتوی کرنا چاہتے تھے تاکہ لواحقین کے ساتھ چالیس اموات کا سوگ منا سکیں مگر شومئی قسمت کہ امریکی صدر نہیں مانے اور یہ کہہ کر ضد کرنے لگے کہ اگر وزیرِ اعظم پاکستان نے کل شرفِ ملاقات نہ بخشا تو وہ امداد جاری نہیں کریں گے اور نہ ہی کشمیر پر پاکستان کی حمائت کریں گے۔ امریکی صدر نے کہا ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی، بم دھماکے اور سینکڑوں ہزاروں انسانوں کا مرنا روزمرہ

ہے۔ اگر ''روزمرہ'' کے بجائے ''محاورہ'' ہوتا تو وزیرِ اعظم موصوف دورہ ملتوی کرنے کا ارادہ کرتے لیکن اب دورہ ملتوی کرنے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اس طرح کے دورے ملتوی کرنے سے دل کا دورہ یا دماغی دورہ بھی پڑ سکتا ہے جو پاکستانی معیشت کی موت ثابت ہو گا لہٰذا وزیرِ اعظم پاکستان اُلٹے قدموں حاضر ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد وزیرِ اعظم ایک شام کی تقریب میں شریک ہیں۔ یہ بسنت کے سلسلے مین منعقد کی گئی ہے۔ جب پتنگ اُڑا رہے تھے تو فوراً ہی ایک ریکارڈ بجنے لگا ؎

پتنگ باز سجناں سے
نظر باز سجناں سے

اب حکمران بھی وجد میں آ گئے اور پتنگ جس طرح آسماں پر لہرا رہی تھی، اسی قدر جوش بڑھ رہا تھا۔ وزیرِ اعظم نے ایک پتنگ کاٹی اور ''بوکاٹا'' کے شور میں وہ اپوزیشن لیڈر کے گھر پہنچ گئے جہاں اپوزیشن لیڈر کل ہی پتنگ بازی کے شوق میں چھت سے گر کر ٹانگ تڑوا بیٹھے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے تیمارداری کی اور اپوزیشن کی شوخیوں اور لن ترانیوں پر کچھ نثر اور کچھ اشعار میں توصیف کی۔ مریض کے ساتھ مل کر سوفٹ اور ہارڈ ڈرنک انجوائے کیا۔ پھر گھر آ گئے۔ بیوی کے ساتھ اپنے سالے کے ہاں ان کی ساس کا افسوس کرنے گئے جو دوپہر کو اللہ میاں کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد اپنی بیوی کی سہیلی کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے جہاں بات بات پر قہقہے اُبل رہے تھے۔ اِس نجی محفل میں جناب نے ذاتی پسند کے لطیفے سُنائے جو قارئین کے ذوق اور خوف سے قلمبند نہیں کئے جا رہے ہیں۔ رات کو سوا بارہ بجے گھر واپس آئے اور بستر پر گر کر سو گئے۔ رات کو جناب کی کیا مصروفیات رہیں، یہ خاکسار کا قلم لکھنے سے قاصر ہے۔

جب حکمران یا سیاستدان کسی جلسے میں جاتے ہیں تو ان کی تقریر اور ان کا ہر انداز خالصتاً عوامی ہوتا ہے۔ تقریر اور لباس سے حُب الوطنی ٹپک رہی ہوتی ہے۔ سیاستدان ایسی انہونی باتیں کرتے ہیں کہ مجمع عاشق ہو ہو جاتا ہے اور لاکھوں کا مجمع یہی سمجھتا ہے کہ ہمارا اس صدی میں کوئی نجات دھندہ ہے تو بس یہی ہے، باقی سب سراب ہے۔ سیاستدان لاکھوں کے مجمع کو مٹھی میں کرنا جانتا ہے اور رائی کو پہاڑ اور پہاڑ کو رائی بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

سیاستدان جھوٹ کا ایسا جیتا جاگتا مجسمہ ہے کہ اگر اُنہیں مجسمۂ آزادی کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو وہ اسے مجسمۂ غلامی بنا دیں۔ سیاستدانوں کے منہ سے بیک وقت آگ اور پھول جھڑتے ہیں۔ وہ پینترا بدلنا خوب جانتے ہیں شائد یہی وجہ ہے کہ وہ پارٹیاں بھی خوب بدلتے ہیں۔ پارٹی بدلنے میں اگرچہ سراسر ان کا ذاتی مفاد ہوتا ہے لیکن اسے وہ عوامی بہبود کا درجہ دیتے ہیں۔ اسمبلیوں میں ''ہارس ٹریڈنگ'' کا کھیل سیاستدانوں کی ایجاد ہے۔ سیاستدان بہت بڑے زبان دان بھی ہیں۔ وہ مصلح سے زیادہ ''مصطلح'' یعنی اصطلاح ساز ہیں۔ زبانوں کی گونا گوں ترقی اور ترویج میں جتنا حصہ ادیبوں کا ہے شائد اس سے زیادہ سیاستدانوں کا ہے۔ اُنہوں نے زبان کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالا ہے۔ انواع و اقسام کی اصطلاح سیاستدانوں کا کارنامہ ہے۔ ادیبوں کی زبان صرف اہلِ علم پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں لیکن سیاستدانوں کی زبان ہر آدمی بول سکتا ہے۔

کوئی مانے نہ مانے مگر سیاستدان اپنی ذات میں ہمہ جہت ہوتے ہیں۔ ان میں ایک شاعر، ادیب، نقاد، زبان دان اور ڈرامہ نگار موجود ہوتا ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کی سب سے جامع مثال ہیں، بلکہ سیاستدان ایک بہترین بینکار اور اکانومسٹ ہوتا ہے۔ اس میں فلاسفر، دانشور اور پروفیسر کی جملہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اسی طرح سیاستدان ایک نہائت لائق قسم کا منشی، وکیل اور جج ہوتا ہے۔ وہ اِتنا مجروح نہیں ہوتا جتنا جارح ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاستدان سے بڑا ڈپلومیٹ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ بیوروکریٹ بننے کی بھی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ ایکٹر تو وہ پیدائشی ہوتا ہے جبکہ زمیندار، سرمایہ دار، ساہوکار، جاگیردار، بزنس مین وہ مشیتِ ایزدی سے پہلے ہی ہوتا ہے البتہ مزید لینڈ لارڈ وہ اقتدار میں آ کر ہوتا ہے۔ سیاستدان سب کچھ ہوتا ہے، بس ایماندار مشکل

سے ہوتا ہے اور جو ایماندار ہوتا ہے وہ سیاست میں چلتا نہیں بلکہ سیاست سے چلتا کر دیا جاتا ہے۔

سیاستدان کو سارے کاموں سے زیادہ ایک کام بہت مرغوب ہوتا ہے، وہ ہے بنانے کا کام۔ سیاستدان گھر میں بچے بناتا ہے، بیوی بناتا ہے، جائیداد بناتا ہے، باہر وہ سب کو الو بناتا ہے اور جو بھی جس کی قسمت یا سیاستدان کی صوابدید میں ہو، وہ اُسے وہی بنا کر دم لیتا ہے۔ ویسے بعض سیاستدان پُل، سڑکیں، پلازے، پارک، محل اور عمارتیں بھی بناتے ہیں۔ سیاستدانوں کو ''بنانے'' کے علاوہ ''بگاڑنے'' کا کام بھی بہت پسند ہے۔ وہ اکثر بنے بنائے کام بگاڑنے کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں۔ جب سیاستدان اقتدار میں نہیں ہوتے تو اُن کا کام بگاڑنا ہوتا ہے۔ وہ ہر کام میں نقص نکالتے ہیں، حتیٰ کہ امن میں بھی اور شہرِ خموشاں میں بھی۔ سیاستدانوں کی وجہ سے قبرستان میں رش رہتا ہے اور مردے ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔

دنیا میں ہر آدمی جو نوکری کرتا ہے، بالآخر ایک دن ریٹائر ہو جاتا ہے۔ سیاستدانوں کی ریٹائرمنٹ کی تاحال کوئی عمر مقرر نہیں کی گئی ہے۔ وہ مرتے دم تک ''اِن'' رہتے اور مخالف کو ''آؤٹ'' کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی سیاستدان کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔ سیاست ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ دنیا سے سیاست کرتے رخصت ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ کرتے بہت کم رخصت ہوئے ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ سیاستدانوں کا دوسری دنیا میں مستقل ٹھکانہ جہنم ہوگا کیونکہ دنیا میں اُنہوں نے ہر قسم کی جنت کے مزے لوٹے ہیں۔ کسی نے اللہ میاں سے شکائت کی کہ جنابِ والا، یہ بڑی ناانصافی ہے کہ ہمیں دکھانے کے لئے ضیاء الحق کو جہنم میں بھیج دیا لیکن جہنم میں بھی ضیاء الحق کی تواضع کے لئے ہیما مالنی بھیج دی، یارب یہ کیسا انصاف ہے تیرا؟

اللہ میاں نے جواب دیا کہ میں نے تو ہیما مالنی کو سزا دینے کے لئے ضیاء الحق کے پاس بھیجا ہے۔

لیکن یہ سچ ہے کہ سائل اللہ میاں کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا کیونکہ یہ جواب کسی بھی طرح شافی وکافی نہیں تھا۔

میرا تو خود ذاتی خیال یہی ہے کہ چرب زبان سیاستدان روزِ قیامت اللہ میاں کو اپنی طرف مائل کر لیں گے۔ سارے جہنمی تو پہلے ہی سیاستدانوں کے جلسے میں شریک ہوں گے اور نتیجہ یہی نکلے گا جو دنیا میں نکلتا رہا ہے کہ سارے سیاستدان جنت میں ہوں گے اور تمام نیک لوگ جو دنیا میں محض اس لئے مصیبتیں، تکلیفیں اور دکھ اُٹھا کر آئے کہ اُنہیں مرنے کے بعد جنت میں نہریں اور حوریں ملیں گی، بیچارے جہنم بدر ہو جائیں گے اور سیاستدان جنت میں نہروں کے کنارے حوروں سے دل لگی کر رہے ہوں گے کیونکہ سیاستدان جو ٹھہرے۔

ہمارے ماسٹر صاحب بڑے خونخوار قسم کے آدمی تھے۔ یوں تو وہ بیچلر آف آرٹس تھے' لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ شادی شدہ ہیں اور کئی بچوں کے باپ ہیں۔ وہ ان حضرات میں سے تھے جو آپ سے سوال پوچھیں گے' آپ کی طرف سے خود جواب دیں گے اور پھر آپ کو ڈانٹیں گے بھی کہ جواب غلط تھا ان کے نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ انہیں نیند میں بولنے اور چلنے پھرنے کی بیماری تھی اور وہ سوتے ہوئے پیدل چلا کرتے تھے' حالانکہ ان کے پاس تانگہ تھا اور ایک سائیکل۔ انہیں کھیل کود کا شوق بھی تھا' لیکن فقط اتنا کہ ریفری بن کر خوش ہو لیا کرتے۔ ایک مرتبہ وہ فٹ بال کے میچ میں ریفری تھے کہ یک لخت جوش میں آ گئے اور گیند لے کر خود گول کر دیا۔ روفی کے ابا ہمیشہ ان سے کہا کرتے تھے کہ ماسٹر صاحب آپ اس علاقے میں فٹ بال کے نمبر دو کھلاڑی ہیں۔ ایک روز ماسٹر صاحب نے ان سے پوچھا کہ نمبر ایک کھلاڑی کون ہے؟ وہ بولے پتہ نہیں۔

حماقتیں از ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

عشق میں ایسی ہوئی مارکٹائی اپنی
ہم نے مشکل سے بڑی جان بچائی اپنی
قیس مفلس نہیں رہتا جو "پلاننگ" کرتا
عمر صحرا میں یونہی اُس نے گنوائی اپنی
اُس نے "انکل" جو کہا دل پہ قیامت ٹوٹی
کام کچھ آئی نہ داڑھی کی رنگائی اپنی
سر کے بل کوچۂ محبوب میں جانے کے سبب
سج گئی ماتھے پہ ہی آبلہ پائی میری
رسی لے لی ہے بس اب بکرا ہے لینا باقی
ہم بھی دیکھیں گے کہاں تک ہے رسائی اپنی
بکرے والے نے دکھائی نہ لچک قیمت میں
اور قائم رہی ویسی ہی ڈھٹائی اپنی
میلے کپڑوں سے مرے مالِ غنیمت لوٹا
ہوگئی ساتھ ہی جیبوں کی صفائی میری
مہر طے ہو نہ سکا مہر و محبت نہ رہی
بدلے کھانے کے ہوئی خوب پٹائی اپنی
داغ دُھلنے کے نہیں ہیں یہ کسی سوپ سے بھی
پیش کرتے رہو بیگم کو صفائی اپنی
خاک کچھ اہلِ سیاست تجھے سمجھائیں گے
جن کو خود آپ سمجھ میں نہ ہو آئی اپنی
محفلِ شعر میں گویا تھا اسمبلی کا سماں
بس کسی نے نہ سُنا، سب نے سنائی اپنی
شاعری نے بھی ہمیں بخشی ہے عزت مظہر
ڈاکٹری ہی میں نہیں صرف کمائی اپنی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہا یہ چیٹ پہ ان دیکھی فرینڈ نے مجھ سے
میں عالی ہوں ارے حضرت میں عالیہ نہیں ہوں

اگرچہ پڑتی ہے روزانہ ڈانٹ بیگم سے
یہ حوصلہ ہے مرا منہ بسورتا نہیں ہوں

یہ بات سچ تو ہے لیکن ہے کڑوی کڑوی سی
ملے گی داد مجھے کیوں؟ میں شاعرہ نہیں ہوں!

گلے میں پھندہ مرے ڈالنا نہیں آساں
اصیل فوجی ہوں میں سیاسی رہنما نہیں ہوں

صدا یہ آئی کہ کھائیں سکون سے مجھ کو
حضور بھونکنے والا میں قورمہ نہیں ہوں

بدل کے چہرہ نہ آ جائے زوجہ محترمہ
میں فیس بک اسی ڈر سے تو کھولتا نہیں ہوں

مجھے نہ مار خدارا خطا نہیں میری
ہے بھینگی آنکھ فقط، تجھ کو گھورتا نہیں ہوں

کہا وزیر نے معدہ مرا قوی ہے بہت
کہ ملک کھا کے بھی سارا ڈکارتا نہیں ہوں

ہیں بند کھڑکیاں مظہر تمام حیرت کی
کسی بھی سانحے پر اب میں چونکتا نہیں ہوں

اسانغنی مشتاق رفیقی

شریف آئے، ترے گھر میں، ہو کے خوار چلے
کما کے لائے تھے جو بھی وہ تجھ پہ وار چلے

بہت سے وعدے کئے ، ایک بھی نبھا نہ سکے
تمھاری بزم سے ہم ہو کے شرمسار چلے

ہمیں پتہ ہے بہت دُور ہے ابھی دِلّی
اسی لئے تو ستانے کوئے یار چلے

خدا کرے مرا وشواس توڑنے والو!
تمھارے شہر سے اب روٹھ کر بہار چلے

رفیقی ''آپ'' سلامت رہیں، دعا ہے مری
کسی طرح مرے جھاڑو کا کاروبار چلے

اسانغنی مشتاق رفیقی

گھر میں بچوں کی مارا ماری ہے
پھر سے بیگم کا پاؤں بھاری ہے

ہم نے مشکل سے خود کو سمجھایا
نارِ دوزخ نہیں وہ ناری ہے

انگلیوں پر نچاتی ہے مجھ کو
پھر بھی بیگم مری بیچاری ہے

شہر میں وہ بڑا وزیر سہی
اماں کے آگے اک بھکاری ہے

وہ دکھاتا ہے روز اک کرتب
میرِ حاکم بڑا مداری ہے

بیویاں اُس کی چار ہیں پھر بھی
پانچویں کی تلاش جاری ہے

ٹھاٹ میں کٹتی ہیں مری راتیں
شیخ صاحب کی چوکیداری ہے

چائے پینی ہو مفت میں تو چلو
آج مسجد میں شب گزاری ہے

شوکت جمال

شب وصل بس وہ رہا بولتا
بھلا اُس کے آگے میں کیا بولتا

مرے منھ پہ جو کچھ کہا سو کہا
مناسب نہ تھا جا بجا بولتا

پڑوسی کے گھر کچھ ہوا غالباً
سنا ہم نے خواجہ سرا بولتا

اسمبلی میں اکثر وہ جاتے تو ہیں
کسی نے نہ ان کو سنا بولتا

"میں لگتی ہوں کیسی؟" پہ چپ ہی رہا
میں کھوٹے کو کیسے کھرا بولتا

شوکت جمال

نظر بھر کر اُسے دیکھوں تو ہو ایمان خطرے میں
جھکا لوں میں اگر نظریں تو میری جان خطرے میں

پھنسے چھوٹی کوئی مچھلی تو مل کر تالیاں پیٹو
بڑی مچھلی پکڑنے میں ہے پاکستان خطرے میں

نئے ماڈل کا ٹیلیفون کیا آیا ہے ہاتھوں میں
مری آنکھوں کو خطرہ ہے، مرے دو کان خطرے میں

رقیب رُو سیہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اُن کا
مجھے لگتا ہے جیسے ہوں مرے ارمان خطرے میں

اچانک آگئے مہمان میرے گھر تو رحمت ہیں
نہ جانے کیوں مگر بیگم کے ہیں اوسان خطرے میں

share کرلیں اگر اِک دوسرے سے Password اپنے
نہ ابا جان خطرے میں نہ امّی جان خطرے میں

بیاض اپنی تھمائی ہے اُنھیں اِصلاح کی خاطر
قلم ہے سرخ اُن کے ہاتھ میں، دیوان خطرے میں

تنویر پھولؔ

عدلیہ کا یہ وار کاری ہے
"بے قراری سی بے قراری ہے"
ہائے! کیسے یہ چھن گئی کرسی؟
جس نے مجھ کو گرایا، ناری ہے!
احتساب اُس کا بھی تو ہے لازم
ایک زردار ہے، مداری ہے
غم غلط کرنے کیلئے کیا کیا!
خوب ہیں پائے اور نہاری ہے
بھیک میں مانگتا ہے وہ کرسی
پیٹ فل ہے مگر بھکاری ہے
اُس سے یاری نبھانا کیا مشکل!
واں جو مودی ہے، کاروباری ہے
لوگ مظلومیت کا پیکر ہیں
لیڈروں میں تو مارا ماری ہے
لیڈری کا ہے خبط ان سب کو
کوئی بندر، کوئی چماری ہے
اُس نے مرحب کو کہہ دیا ہیرو
کیا یہودی سے رشتہ داری ہے؟
کس کو اہلِ وطن سے ہے اُلفت؟
ہاں! چچا سام سے تو یاری ہے
پھولؔ! ناچے گی لیڈری ساری
اس غزل کی زبان بھاری ہے

تنویر پھولؔ

وہ دیکھنے میں تو بدھو تھا، منچلا نکلا
بنا شریف تھا، شیطان کا چچا نکلا

لگاتا وہ تھا فقط ایک آنکھ پر عینک
جو دیکھا غور سے اُس کو، وہ کن کٹا نکلا

وہ اپنے شہر میں کہلایا باز کا بچہ
کبھی بنا تھا لفنگا، وہ پارسا نکلا

قصور اس میں تو استاد کا نہیں کچھ بھی
تان سین کا چیلا تھا، بے سُرا نکلا

کچن میں دیکھ کے اس کو اچھل پڑیں بیگم
بڑا جو لائے تھے آلو، وہ پلپلا نکلا

گیا وہ عالمی جنگل میں، گھاس چرتا رہا
میں جس کو شیر سمجھتا تھا، وہ گدھا نکلا

اسے تو کاٹ کے مٹھو میاں نے چھوڑ دیا
بڑا جو سب سے تھا امرود، وہ سڑا نکلا

بلا کے گھر میں اسے، ہو گئے پریشاں ہم
جو یار کا تھا پدر، پیر تسمہ پا نکلا

گلوں کو دیکھ کے اے پھولؔ! بھنبھناتا رہا
سیاہ بھونرا حقیقت میں دل جلا نکلا

عابدؔ محمود عابدؔ

کب کسی یار سے محبت ہے
خوچہ نسوار سے محبت ہے

بچّے اپنے سکول سے بے زار
اُن کو اتوار سے محبت ہے

ان کی سحری کو آنکھ کھلتی نہیں
جن کو افطار سے محبت ہے

وہ مجھے سارا وقت دیتا ہے
ایک بے کار سے محبت ہے

گرچہ مصنوعی چیز ہے لیکن
حسنِ تیّار سے محبت ہے

میری ہم راز ہے یہ بچپن سے
گھر کی دیوار سے محبت ہے

بعض غزلیں کمال غزلیں ہیں
بعض اشعار سے محبت ہے

آپ کی نفرتیں سر آنکھوں پر
آپ کے پیار سے محبت ہے

شادی کے بعد اب ہمیں عابدؔ
صرف دو چار سے محبت ہے

ابنِ منیبؔ

محبت کیا ہے؟ اہلِ علم جانیں!
ہمیں عادت تمہاری ہو گئی ہے
سُنا ہو گا کبھی مجنوں کا قصہ؟
وہی حالت ہماری ہو گئی ہے
ہوَس کا دَور ہے یہ دَورِ حاضر
محبت اختیاری ہو گئی ہے
ہُوا ہے مکر کا قانون رائج
شرافت اشتہاری ہو گئی ہے
کِیا کرتے تھے وہ پہلے بھی گھایل
مگر اب ضرب کاری ہو گئی ہے
سُنا ہے جبر کی جاگیر اُن کی
ہمارے نام ساری ہو گئی ہے
کوئی زخمی کوئی بے دم پڑا ہے
نظر اُن کی شکاری ہو گئی ہے
دل اپنا ہے، نہیں ہے، کیا بتائیں!
عجب بے اختیاری ہو گئی ہے
کہو، حُجاج کو پانی پلا کر
حرم کی پاسداری ہو گئی ہے؟
جو حکمت تھی کبھی مومن کو پیاری
وہ اب اللہ کو پیاری ہو گئی ہے
سفَر کا حکم، بوجھ، اور تازیانے
کمر اپنی، سواری ہو گئی ہے
منیبؔ اب توڑ دو جوشِ جنوں سے
بہت زنجیر بھاری ہو گئی ہے

ہاشم علی خان ہمدم

تیرا مرا ممکن ہی نہ تھا میل یقیناً
اپنوں نے ہی کھیلا ہے کوئی کھیل یقیناً

منڈی میں ابھی تیل کا بھاؤ نہیں بدلا
نکلے گا غریبوں کا ابھی تیل یقیناً

کہتے ہیں کسی شیر کے پنجے میں پھنسی ہے
مل جائے گی گیدڑ کی کبھی ٹیل یقیناً

انگلینڈ میں رہ کر بھی وہ پردے میں رہی ہے
چھاچھی کی ثقافت ہے ابھی چھیل یقیناً

ورنہ کبھی دنیا میں یوں بدنام نہ ہوتا
پپو کو عدالت نے کیا فیل یقیناً

اپ ڈیٹ سٹیٹس کے کوائف سے کھلا ہے
ڈی پی میں چھپا میل تھا شی میل یقیناً

ورنہ کسے معلوم کہ پانامہ کہاں ہے
کھیلا ہے سیاست نے کوئی کھیل یقیناً

یوں ہی تو کوئی بنک سے چوری نہیں کرتا
ہوتی ہے کہیں ریل کہیں پیل یقیناً

جلسے میں دھڑلے سے ملن ہونے لگا ہے
میلے میں ہوا کرتا تھا جو میل یقیناً

ورنہ وہ چڑاتا بھی تجھے فاصلہ رکھ کر
دیکھے نہیں پپو نے ترے نیل یقیناً

جورو کا میاں اور سہی اور سہی اور
ہوگا نہیں سسٹم کبھی ڈی ریل یقیناً

مل جل کے جسے دھکا لگا رکھا ہے ہم نے
سی پیک پہ چل جائے گی یہ ریل یقیناً

یہ کدو کریلے بھی بہت خاص ہیں ہمدم
پھولے گی مرے گھر میں ہری بیل یقیناً

احمد علوی

عروج پر ہیں بد اخلاقیاں سبحان اللہ
وہ کر کے آئے ہیں حج پانچواں سبحان اللہ

نہیں ہے ربط کوئی بھی زمین والوں سے
قدم کے نیچے ہیں ہفت آسماں سبحان اللہ

یہ واقعہ ہے کہ اب مستند ادیبوں کے
ادب نہیں ہے کوئی درمیاں سبحان اللہ

نماز پڑھنے کی ہم کو ہوئی نہیں توفیق
سنی ہیں غور سے پانچوں اذاں سبحان اللہ

تمام خواب ترقی کے جل کے خاک ہوئے
لگی نہ آگ نہ اٹھا دھواں سبحان اللہ

ہماری نسل میں ملتے ہیں ہائی ٹیک عالم
سنا ہے ٹی وی پہ ہم نے قرآں سبحان اللہ

بلیک ہول بنی ہے یہ زندگی میری
مرے نکاح میں ہے کہکشاں سبحان اللہ

سحر ضرور ان لفاظیوں کا ٹوٹے گا
بنے گی سنگ لچیلی زباں سبحان اللہ

سنا ہے شعروں پہ کوئی عمل نہیں کرتا
تمام شاعری ہے رائیگاں سبحان اللہ

اُڑو یا دوڑ لگاؤ تمہاری مرضی ہے
کھلی زمیں ہے کھلا آسماں سبحان اللہ

عرفان قادر

پوری تو مَیں ہر حال میں یہ باری کروں گا
پھر اگلے الیکشن کی بھی تیاری کروں گا

ہے کون جو روکے گا مجھے نیک عمل سے
میں شام سے تا صبح جب افطاری کروں گا

جس کو مرا جی چاہے گا بولوں گا پھپھیچر
اُڑ جاؤں گا پھر اُس پہ نہیں ''ساری'' کروں گا

مجنوں نے کہا، دشت میں آزاد ہُوں آزاد
چاہوں گا جہاں، پان کی پچکاری کروں گا

مل جائے اگر ایک بھی دن کی مجھے شاہی
پھر دام ''افاعیل'' کے ہی جاری کروں گا

کر کر کے سفر ڈوب نہ جائے تُو گھڑے پر
اے سوہنی! بک تیرے لئے لاری کروں گا

آرام سے تا کہ وہ مرے دل کو چُرا لے
بالکل ہی نہیں لاک میں الماری کروں گا

اوروں کی ''زمینوں'' پہ کئے جاؤں گا قبضہ
یہ کام بحیثیتِ پٹواری کروں گا

زلفوں کا اسیر اُس نے کیا اور بتایا
ظاہر کئی دن بعد گرفتاری کروں گا

عرفان قادر

گلوکارہ تھی چیلی ریشماں کی
مگر آواز نکلی پاں پپاں کی

پڑیں بیلن تو چوں تک بھی نہ کرنا
بتاؤ ناں، شرافت ہے کہاں کی؟

ہوا ناکام آخر کار مجنوں
بہت کیں منتیں لیلیٰ کی ماں کی

ہماری شومئ قسمت تو دیکھو
پڑی پلّے ہے بیٹی پہلواں کی

جو ہے ''ففتھئین'' کی خود کو بتاتی
حقیقت میں ہوئی ہے ففٹیاں کی

تری ''گنجِ گراں مایہ'' ہے ڈِھتی
ہو گرچہ آٹھ دس کپڑوں سے ڈھانکی

یہ گھر داماد نے بیگم سے پوچھا
ہے گنجائش کوئی چوں کی، چناں کی؟

چلی ناراض ہو کر ''ہیر'' گھر کو
کسی ہکلے نے جب قسطوں میں ہاں کی

نویدصدیقی

بس اک زن ہی سر پر مسلط رہی
ہمیں عقدِ ثانی کی حسرت رہی

ملا نہ کوئی راہبر پارسا
لٹیروں کے ہاتھوں حکومت رہی

گئے جب بھی ہم کوچۂ یار میں
تسلسل سے بنتی حجامت رہی

محبت نے اندھا اسے کر دیا
بصیرت رہی نہ بصارت رہی

سنتا رہا میں لطائف انھیں
مری جن کی حسِ لطافت رہی

سنا ایک شاعر کا دیوان کل
کہوں کیا جو اس دل کی حالت رہی

غزل مشتمل ہے سو اشعار پر
سخن مر گیا گو طوالت رہی

نویدصدیقی

ملنے کو ہے بے تاب دل و جان وغیرہ
بتلا دو کہ آنے کا ہے امکان وغیرہ؟

یہ ترکِ تعلق کے بہانے ہیں پرانے
یہ بارشیں یہ رستے، یہ طوفان وغیرہ

کچھ درد ہیں کچھ کرب ہیں کچھ آہیں ہماری
ہم باندھ کے آتے ہیں یہ سامان وغیرہ

اک بار رفو چاک کریں دل کا ہمارے
پھر بعد میں ہو لیجے گا حیران وغیرہ

جب نوک پہ تلوار کی آتی ہے شہِ رگ
ایمان سے گھٹ جاتا ہے ایقان وغیرہ

اقبال شانہ

تجھے جب غور سے دیکھا نہیں تھا
ہمارے درمیاں رشتہ نہیں تھا

کنوئیں میں جانے کیسے گر پڑا میں
میں اندھا تھا مگر اتنا نہیں تھا

شب غم بھینس سے ٹکرا گیا ہوں
گلی میں لائیٹ کا کھمبا نہیں تھا

ہوا میں اڑ گئی چھتری ہماری
''ہوا کا رخ کبھی ایسا نہیں تھا''

تھی اس کی جنس ہی مشکوک یارو
وہ تھا محبوب محبوبہ نہیں تھا

غزل کہتا میں کیسے کیا بتاؤں
وہ میرے سامنے بیٹھا نہیں تھا

تری چوکھٹ پہ آخر مر گیا میں
سوا اس کے کوئی چارہ نہیں تھا

مجھے کہتے ہو کب لوٹو گے شانہ
ابھی تو گھر سے میں نکلا نہیں تھا

عتیق الرحمن

نظر میں ایک حسینہ سے جو لڑا بیٹھا
اِدھر اُدھر سے میں اس جسم کو پٹا بیٹھا

گلا خراب تھا انچور بھی میں کھا بیٹھا
اسی لیے تو مسلسل مرا گلا بیٹھا

ہوا ہے جان چھڑانا عذاب میرے لیے
پتا جو بھول کے شاعر کو میں بتا بیٹھا

گراں پڑی ہے پہلوان کی مجھے یاری
کیا مزاق تو بازو ہی میں تڑا بیٹھا

یہ کیوں مزاج شناسی سے آشنا تو نہی
اسے نہ چھیڑ ہے پہلے ہی جو چڑا بیٹھا

لگا رہا جو مسلسل ڈبل کے چکر میں
حریص تھا وہ بہت مال سب لٹا بیٹھا

کٹا کے انگلی شہیدوں میں نام لکھنا تھا
ہوا ہے ظلم یہ میں ہاتھ ہی کٹا بیٹھا

ڈاکٹر منظور احمد

خواہش کا ٹمپریچر پیمائی چاہتا ہے
منڈا پڑا مقدر بھر پائی چاہتا ہے

رکھا ہے فرض اپنا بالائے طاق اس نے
ہر کام کے عوض جو ''مٹھیائی'' چاہتا ہے

اک دوست جو جلن سے کولا سا بن گیا ہے
بے وجہ مجھ سے ہر وقت ٹکرائی چاہتا ہے

نزلہ زکام اپنی شدت پہ شادماں ہے
رومال لمحہ لمحہ سینچائی چاہتا ہے

آئے کہیں نظر اب کھڑکی پہ یا ''ٹیرس'' پر
عاشق گلی میں دن بھر ٹہلائی چاہتا ہے

ایڈمن کہیں پہ لمبے خراٹے لے رہا ہے
میٹھی سی دھن پہ کہنا بائی بائی چاہتا ہے

سورج سے چاہتا ہے کلغی جمائے رکھنا
گرمائی میں جو موسم سرمائی چاہتا ہے

محفل سے نو دو گیارہ منظور وہ ہوا کب
ہر بار اینٹری جو ڈرامائی چاہتا ہے

ڈاکٹر منظور احمد

ہُوا کارگر اک بہانہ یقیناً
مجھے آ گیا سچ چھپانا یقیناً
اُسے چاہے غصہ کسی پر بھی آئے
بنوں گا تو میں ہی نشانہ یقیناً
خوشامد میں گوندھا کرو چاپلوسی
حقیقت بنے گی فسانہ یقیناً
سرِ راہ وہ جو بہت پٹ رہا ہے
نیا ہے ابھی وہ دیوانہ یقیناً
بڑی مشکلوں سے، مگر نبھ رہی ہے
ہر اک گھر کا ہے شاخسانہ یقیناً
عجب دور ہے کوئی اپنا نہیں ہے
کرپشن کا ہے یہ زمانہ یقیناً
مرا پھوٹنے والا تھا سارا بھانڈا
تھی پر عقل اس کی زنانہ یقیناً
کبھی بھی نہ سسرال والوں کے آگے
ببر شیر خود کو بنانا یقیناً
یہ کیا ہوگیا ہے میں خود پھنس گیا ہوں
کوئی اور ہی تھا نشانہ یقیناً
بظاہر کسی مرد کی تھا وہ کاپی
مگر اس کی حرکت زنانہ یقیناً
اگر باس سے ہو نوازش کی حاجت
تو ہر حکم پر سر جھکانا یقیناً
کبھی تیسری جنس گھیرا جو ڈالے
تو آساں نہیں چھوٹ جانا یقیناً
کبھی تو سیاست سے بھی کام لیجے
کہ بے پر کی تھوڑا اڑانا یقیناً

قمر آسی

بگڑا ہے کیوں یہ حلیہ؟ یہ عرض پھر کروں گا
کس کس نے مجھ کو پیٹا، یہ عرض پھر کروں گا

اک دن میں فون اپنا گھر پر تھا بھول آیا
"ٹوٹا تھا گھر میں کیا کیا، یہ عرض پھر کروں گا"

کل رات نازنینوں سے گفتگو کے دوراں
بیگم نے کیوں بلایا، یہ عرض پھر کروں گا

جب اُس سے میں ملا تھا، پورے تھے دانت میرے
آگے کا سارا قصہ؟ یہ عرض پھر کروں گا

تیرا شکم نہیں، یہ ہے کوئی دوسری شئے
مٹکی ہے یا کہ مٹکا، یہ عرض پھر کروں گا

جس کی ردیف ہے یہ، اک بار مجھ کو ملتا
پھر وہ کبھی نہ کہتا، یہ عرض پھر کروں گا

محفل میں یوں تو آسی کافی حسین آئے
کس کس پہ دل پسیجا، یہ عرض پھر کروں گا

قمر آسی

اب چھوڑ دے یہ آم کی سوغات مسلسل
مکھیوں کی ترے گرد ہے بہتات مسلسل

تم کل سے کرو باس کے جوتوں کی صفائی
پھر بڑھتے ہوئے دیکھو گے درجات مسلسل

بازار سے بس ایک اُسے رنگ دِلائی
کرتی ہے وہ اب مجھ سے ملاقات مسلسل

سچ کہتے ہیں بیگم کی بھی خدمت میں ہے عظمت
تم کر کے ذرا دیکھو یہ ہر رات مسلسل

پے در پے نہ شاپنگ کے یہ بل مجھ کو دکھاؤ
ڈھاتی ہو مرے دل پہ کیوں صدمات مسلسل

پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اشعار وہ اپنے
"سنتا ہی نہیں کوئی مری بات مسلسل"

سب تارے کسی اور قمر نے ہیں پھنسائے
اب بیٹھ کے ملتے رہو تم ہاتھ مسلسل

نسیم سحر

سلسلہ چلا تو شاعر ظفر اقبال سے تھا مگر اسے آگے بڑھانے میں بہت سے شاعر شامل ہو گئے ہیں اور اسے اردو لفظیات میں اضافہ قرار دے رہے ہیں۔ شاید ایسا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ بعض سنجیدہ مزاج لوگ اسے لسانی توڑ پھوڑ کہہ رہے ہیں اور اس طرح نئے الفاظ کی ساختیاتی ہیئت کو اُردو زبان کے ساتھ زیادتی قرار دے رہے ہیں۔ یہاں 'خوفِ فسادِ خلق' سے بچنے کی خاطر ایسی ''بریکیں فیل'' شاعری کی مثالیں نہیں دی جا رہیں کہ کہیں کسی ادبی جے آئی ٹی کے روبرو ہمیں بھی پیش نہ ہونا پڑ جائے۔ البتہ اس لسانی توڑ پھوڑ کا نمونہ ہم خود اپنے ''زورِ قلم'' سے وجود میں لا کر یہاں اصحابِ ذوق کی توجہ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ اسے آپ بارہ مسالے کی چاٹ یا پنجابی، اردو اور انگریزی کی کھچڑی کے طور پر بھی ''انجوائے'' کر سکتے ہیں۔ (نسیمِ سحر)

غزل اِن ٹربل

خوب اُن کے ذریعے ''چمکتا'' ہوں
کاغذ پہ جو لفظ ''لیکتا'' ہوں

جتنا وہ مجھے خرابتا ہے
اُتنا ہی مَیں اُس کو ٹھیکتا ہوں

ہجراں کی شراب راس آئی
روز ایک پیالہ ''ڈیکتا'' ہوں

''کاٹو تو لہو نہیں بدن میں''
شاید مَیں کہیں سے ''لیکتا'' ہوں !

وہ چھوڑ گیا ہے شہر میر
میں اب بھی اُسے ''اُڈیکتا'' ہوں

اُردو میں تو لوگ چیختے ہیں
پنجاب کا ہوں، مَیں ''چیکتا'' ہوں

کچھ آپ سے بھی مَیں سیکھ لوں گا
مَیں سب جُہلاء سے سیکھتا ہوں

رہتا ہے وُہ اُتنا دُور مجھ سے
جتنا مَیں اُسے ''شریکتا'' ہوں

تمباکو بھرا جو پان کھاؤں
تا دیر پھر اُس کو ''پیکتا'' ہوں

اُردو میں تو بولتا ہوں کم ہی
انگلش میں بڑا ''سپیکتا'' ہوں

اِک عمر کی فرقتوں کا مارا
اِک لمحۂ وصل ''بھیکتا'' ہوں

ہو جاتا ہے جب نسیمؔ ٹُن وُہ
واعظ کو بڑا 'دھریکتا' ہوں

شاہین فصیح ربانی

کہہ لیجیے بیگم کو کبھی جان وغیرہ
ہوتا نہیں اس سے کوئی نقصان وغیرہ

بکتے نہیں مجموعہ و دیوان وغیرہ
بکتے ہیں فصیح ان میں یہاں پان وغیرہ

دیدارِ مسلسل کے لیے اس کی گلی میں
رکھ لیتے ہیں چھوٹی سی ہی دوکان وغیرہ

لائیں گے ترے واسطے ''توشیبا'' کا ٹی وی
چاہے ہمیں جانا پڑے جاپان وغیرہ

کاغان وزٹ کرنے کو انگریز تھے آئے
ایجنٹ نے دکھلا دیئے مردان وغیرہ

پاگل ہیں، گدھے لیتے ہیں کیوں چائنا والے
جب ملتے ہیں دو کوڑی میں انسان وغیرہ

اب ''مار نہیں، پیار'' کا قانون ہے لاگو
کھنچتے نہیں اسکول میں اب کان وغیرہ

محمد خلیل الرحمٰن

مرنے کے بعد ہم کو بھی رُسوا نہ کیجیو!
کہیو غزل نہ کوئی ہماری زمین میں

اپنی زمین ہم نے رجسٹر کرائی تھی
احباب اس کو لے گئے ایران و چین میں

یاروں نے قافیے بھی اچھوتے ہی گھڑ لیے
اور ہم پھنسے ہوئے ہیں اُسی قاف وشین میں

سُسرا! غزل ہماری ہمیں کو سُنا گیا
پالا ہے ہم نے کیسا یہ مار آستین میں

اِک نظم کا خیال سمایا ہے دِل میں آج
کچھ قافیے بھی چاہئیں اِس کی زمین میں

کوشش کے باوجود نہ دیوان بن سکا
عمرِ دراز کٹ گئی اِس کی تزئین میں

ریاض احمد قادری

مری بیوی ہی گر جلاد ہو گی
کسی سے کب مری امداد ہو گی

سنے گا کون پھر میری صدا کو
مرے ہونٹوں پہ جب فریاد ہوگی

اضافہ ہر برس بچوں میں ہو گا
یونہی جنت مری آباد ہو گی

قفس میں آپ ہی وہ پھنس چکا ہے
بری یوں حالتِ صیاد ہوگی

جو خود لیتی ہے امریکہ سے قرضہ
بھلا وہ قوم کیا آزاد ہو گی

جو رکھی جائے گی پانی کے اوپر
بہت کمزور وہ بنیاد ہو گی

جو بدکردار ہیں ماں باپ جگ میں
بری ان کی بہت اولاد ہو گی

سید فہیم الدین

پرانی چاہت کا سوچ کر تم جو آہ بھرنا، پکوڑے تلنا
جو بچ بچا کر بھی شرم آئے تو ڈوب مرنا، پکوڑے تلنا

ہمارے پلے یہ کیسی بیوی کو باندھا ہے تم نے اے عزیزو!
کہ جس کو آتا نہیں ہے کوئی بھی کام کرنا، پکوڑے تلنا

فضول گوئی ہمارے جیون کا ایک حصہ بنی ہوئی ہے
تمام جیون عجیب لوگوں پہ شعر لکھنا، پکوڑے تلنا

میں سخت عاجز ہوں اُس بلا سے کہ ساس کہتی ہے جس کو دنیا
وہ جب بھی آئے ہماری بیگم کا پھر مچلنا، پکوڑے تلنا

بتا دیا ہے ہمارے بزنس میں فضلِ ربّی بھی جا بجا ہے
تو کام یہ ہے ہمارا ''آپاں'' بہت اکڑنا، پکوڑے تلنا

ساؔز دہلوی

پہلے ہی سے بارش میں تھا بھیگا ہوا بکرا
بیگم نے رکھا ہاتھ خمیدہ ہوا بکرا

دیکھو جو ذرا غور سے کچھ فرق نہیں ہے
شوہر بھی تو لگتا ہے سدھایا ہوا بکرا

دیکھا جو مجھے کہنے لگیں ماہ جبینیں
شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا

میڈم نے کہا ٹھیک تمھاری ہی طرح ہو
لگتا ہے بھلا سر کو جھکایا ہوا بکرا

تھی اپنے تعلق کی بچارے کو خبر کیا
بیگم نے مجھے ڈانٹا تو سیدھا ہوا بکرا

نکلا ذرا سج دھج کے تو بولی یہ پڑوسن
اے بھائی یہ تم ہو کہ سجایا ہوا بکرا

قربان کرو جان سے بھی پیاری کوئی چیز
شوہر ہے مرا پیار سے پالا ہوا بکرا

اُستاد بہت بھد پٹی فن کی گلی میں
چوری ہوا چوروں سے چرایا ہوا بکرا

سب راز عیاں ہو گئے کل بزمِ سخن میں
ہے ساؔز کیا بکری کا ستایا ہوا بکرا

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی

رقیبوں نے دیدی مجھے مات رے، باپ رے باپ رے باپ
کروں کس سے میں دل کی اب بات رے، باپ رے باپ رے باپ

مُسلّط ہیں جیسے ہوں جنّات رے، باپ رے باپ رے باپ
لگائے ہیں وہ راہ میں گھات رے، رے، باپ رے باپ رے باپ

کیا اُس نے ترکِ ملاقات رے، رے، باپ رے باپ رے باپ
ملی عشق کی ایسی سوغات رے، رے، باپ رے باپ رے باپ

نہیں اب ہیں قابو میں جذبات رے، رے، باپ رے باپ رے باپ
مجھے کاٹتی ہے یہ اب رات رے، باپ رے باپ رے باپ

وہ کرتا ہے مُجھ سے حجابات رے، باپ رے باپ رے باپ
ہیں غیروں پہ اُس کی عنایات رے، باپ رے باپ رے باپ

بتادی مجھے اپنی اوقات رے، باپ رے باپ رے باپ
مری دشمنِ جاں ہے برسات رے، باپ رے باپ رے باپ

دئے اُس نے ایسے بیانات رے، باپ رے باپ رے باپ
ہوا شہر نذرِ فسادات رے، باپ رے باپ رے باپ

بہت سے ہیں برقیؔ سوالات رے، باپ رے باپ رے باپ
کہاں تک دوں اُن کے جوابات رے، باپ رے باپ رے باپ

محسن اسلم

آتے رہے جناب ہماری گلی میں کیوں
ہوتے رہے خراب ہماری گلی میں کیوں

ہونا ہی تھا خراب ہر اک نوجوان نے
آئے تھے بے نقاب ہماری گلی میں کیوں

ہوتا تھا گولا گنڈا کبھی اُن کے ہاتھ میں
پیتے ہیں اب شراب ہماری گلی میں کیوں

اٹھکیلیاں جو ہم سے کئے جا رہی ہے خود
مانگے گی پھر حساب ہماری گلی میں کیوں

شادی شدہ بھی تاڑ میں ہیں ہم چھڑوں کیساتھ
گھورے پھرے جناب ہماری گلی میں کیوں

ہم کو ہی آ کے دُور گلی والوں نے بھلا
چھینتا ہے بے حساب ہماری گلی میں کیوں

سب نیناں جھیل جیسے ہیں ہر چہرہ چاند سا
ہر کوئی لاجواب ہماری گلی میں کیوں

کل کس کے ساتھ آپ قدم رنجا کر گئے
مٹی ہیں سب کے خواب ہماری گلی میں کیوں

آشم پیرزادہ

کس نے کہا چُرا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں
اُستاد سے منگا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

لہجے سے میرے طنز کی تلخی نہیں گئی
حالانکہ شہد کھا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

اِس کا کوئی جواب نہیں ہند و پاک میں
ایران سے منگا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

بیٹھے ہوئے ہیں سامنے اُستادِ محترم
سر اس لئے جھکا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

اِس دور کا جگر مجھے کہنے لگے ہیں لوگ
پیگ اس لئے لگا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

مجھ کو کوئی خوشی نہ ملی اس لئے جناب
بنیادِ غم ہلا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

ہمت اگر ہے تجھ میں مجھے روک کر دکھا
مقطع ترا ہٹا کے غزل پڑھ رہا ہوں میں

روبینہ شاہین بیناؔ

جو زن مرید میاں ہیں وہ مستند کیے جائیں
خلاف ان کے کبھی ووٹ مسترد کیے جائیں

پھلانگتے ہیں، چھلانگیں کبھی لگاتے ہیں
یہ آدمی ہیں کہ بندر جو اونچا قد کیے جائیں

نہ جعلی ڈگری کا جھگڑا، نہ کچھ اپوزیشن
انگوٹھا چھاپ ہی ایوان میں سند کیے جائیں

کبھی خیال نہ آئے انہیں الیکشن کا
شریف لوگ سیاست میں ایسے رد کیے جائیں

چھپا چھپا کے بھی چھپتا نہیں ہے ان کا دھن
مگر یہ لوگ کرپشن میں پھر بھی حد کیے جائیں

امیرِ شہر نے میرٹ بنا دیا ہے یہی
کہ اپنے کام کے بندے ہی نامزد کیے جائیں

عروضیوں سے فقط اتنی سی گزارش ہے
سبب خفیف بڑھا کر نہ یوں وتد کیے جائیں

سرائے اہل ادب کا یہ حال ہے بیناؔ
کہ کام کچھ نہ کریں اور بس حسد کیے جائیں

روبینہ شاہین بیناؔ

گل خان کر رہا تھا کسی سے ثنائے گل
نسوار کا نشہ ہے مجھے بس ادائے گل

سینڈل کی مار جھیلنے والے تھے ہوشیار
کانٹوں سے بچ بچا کے جو ٹکتے تھے پائے گل

محفوظ فیصلے سے مہکتے ہوئے ملیں
فارن میں جا کے جس نے بھی جتنے کھلائے گل

گلشن کو لوٹنے میں سبھی پیش پیش تھے
کانٹے ملے کسی کو کسی نے اٹھائے گل

گوبھی کا پھول سر پہ اسے زور سے لگا
بیگم کے سامنے جو کہا اس نے ہائے گل

رستے میں گل جبین کا ابا بھی ساتھ تھا
گل چیں نے دور ہی سے کہا بائے بائے گل

گوبھی کا پھول ہے کبھی سرسوں کا پھول ہے
کھائے گا اور کیا جو میاں یہ نہ کھائے گل

تتلی کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ہڑپ لیا
سرسبز بیل بھی ہے کوئی اژدہائے گل

کب سے کھڑی ہوئی ہے سمٹ کر وہ لان میں
سیلفی میں کھینچ کھانچ کے کوئی تو لائے گل

ہاتھوں میں آ گئے ہیں مرے کاکروچ کیوں؟
اپنی طرف سے میں نے تو بیناؔ اُٹھائے گل

نوید ظفر کیانی

رقیب ہوں گے تو اُن سے عناد تو ہو گا
اِک آپریشنِ رد الفساد تو ہو گا

بس ایک میں سرِ محفل فساد کی جڑ تھا
سکونِ قلب تجھے میرے بعد تو ہو گا

ابھی کھٹکتا ہے آنکھوں میں خار کی صورت
کبھی یہ فدوی بھی تیرا داماد تو ہو گا

وہ کب تلک ہمیں اُلو بنائے رکھے گا
جو زندہ باد ہے وہ مردہ باد تو ہو گا

ہڑپ کرو نہ یوں اکلِ حرام، ’’انبے وا‘‘
’’گریڈی ڈاگ‘‘ کا انجام یاد تو ہو گا

کراچی ہو گیا کڑوی کسیلی زوجہ سا
کبھی یہ شہر عروس البلاد تو ہو گا

جو لینے دیتا نہیں مجھ کو اطمینان کی سانس
وہ آشنائے حقوق العباد تو ہو گا

یہ ’’نون لیگی‘‘ حسینہ سے واگذار ہوا
ہمارے دل میں بھی کارِ خراد تو ہو گا

یہ کام کرتے ہیں بیچارے کتنی محنت سے
وہ اپنے تاڑنے والوں سے شاد تو ہو گا

اب اپنے آپ سے لڑنا بھی فرض ہے مجھ پر
غنیم ہو گا تو اُس سے جہاد تو ہو گا

تجھے سنائے گا غزلیں نہ چاہتے ہوئے بھی
ترا ظفر تیرے سر بہرِ داد تو ہو گا

نوید ظفر کیانی

مارے پتھر تو سدا بم سے سواگت کرنا
جو بُرا تم سے کرے اُس سے بھلامت کرنا

زور گوئی کی مہارت ہے ترے بیٹے میں
اُس سے کہنا کہ بڑا ہو کے وکالت کرنا

اک ذرا دل کی عدالت میں اُسے لے آنا
حُسن کے کیس کی روزانہ سماعت کرنا

کارنامۂ عدو ہے وہی دہشت گردی
اور اپنا ہے وہی کام مذمت کرنا

راگ دربار کے گاتا ہے اگر تو دِن بھر
راگ درباری کی شب کو بھی ریاضت کرنا

جیسا دل لیتے ہیں ویسا کہاں لوٹاتے ہیں
ہے خوئے حُسن امانت میں خیانت کرنا

جانے اس دور کے لیڈر کو سکھائی کس نے
اس طرح ساس بہو والی سیاست کرنا

چھوٹ دینا کبھی سچ بات بھی منہ سے ظالم
زندگانی میں ہمیشہ نہ صحافت کرنا

بزمِ جاناں سے رقیبوں کا صفایا ہو جائے
اپنے حصے کا یہی کارِ طہارت کرنا

جاگتے میں جو کُڑوک مرغی بنا پھرتا ہو
اُس کا خراٹے بھی لینا ہے عبادت کرنا

لیڈرِ قوم کے ذمے ہے فریضہ کب سے
بیوقوفانِ ریاست کی قیادت کرنا

باندھ کر آنا بصد نازو مسرت سہرہ
اپنی بربادی کی تقریب میں شرکت کرنا

مجھ کو مجبور کیا رنگِ زمانہ نے ظفر
نغز گوئی میں فقط طنز و ظرافت کرنا

ڈاکٹر امواج الساحل

محبت نامہ

بنیادی طور پر تو میں ایک معمولی سا کاغذ ہوں، مجھے دوسری کلاس کے بچے کی رف کاپی سے پھاڑا گیا ہے، مگر جس نے اسے پھاڑا ہے اس نے میری قیمت بہت بڑھا دی ہے، اب میں ایک نوجوان دوشیزہ کے پیار بھرے ارمانوں کا آئینہ ہوں، جس کے ہاتھوں کے لمس میں چاشنی ہی چاشنی ہے، گاؤں کی یہ الہڑ ان پڑھ مٹیار لکھنا پڑھنا تو نہیں جانتی، لیکن اس کے حنائی لمس سے ہی سارے جذبے مجھ میں منتقل ہوگئے ہیں۔

اور کوئی سمجھتا یا نہ سمجھتا، مجھے تو اس لمس کے خفیہ پیغام کی سمجھ آگئی تھی، مگر میں بولنے سے قاصر تھا، مجھ پر لکھی گئی تحریر نے ہی ان لامحدود جذبات کو اس کے محبوب پر عیاں کرنا تھا، وہ بھی میری مجبوری جانتی تھی، سو مجھے ایک لفافے میں ڈال کر ایک لڑکی کے گھر آگئی، آج پہلی دفعہ وہ اس بچی کے پاس آئی تھی، اس سے پہلے اوروں سے خط لکھواتی رہی تھی، وہ پختہ عمر کی لڑکیاں اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتی تھیں، تو وہ لجا جاتی، اس لئے اس دفعہ اس معصوم سی بچی کے پاس آگئی، بچی اپنا اسکول کا کام لکھ رہی تھی، اس نے کہا ”میرا خط لکھ دو!“

بچی نے کہا ”انتظار کرو پہلے کام مکمل کرلوں۔“

اسے بیٹھنا پڑا، آخر بچی کو اس پر ترس آگیا، مجھے پکڑا اور اُس سے پوچھا ”کس کو لکھنا ہے؟“

”میرے شوہر کو۔“

”نام کیا ہے؟؟“

”بس تم خط لکھ دو، نام کو چھوڑو۔“

”مگر کیوں، ہمیں بتایا گیا ہے کہ القاب ضروری ہیں۔“

جب تکرار بڑھی تو ماں نے آکر صلح کروائی، اس کے شوہر کا نام بتایا، اور بچی کو سمجھایا کہ ان کے ہاں شوہر کا نام لینا بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔

اب اس نے القاب میری پیشانی پر لکھ کر پوچھا۔

''کیا لکھوں؟''
''مجھ سے کیا پوچھتی ہو خود ہی لکھ دو نا۔''
''یہ کیا بات ہوئی؟''
''خود ہی کیا لکھوں؟؟؟''
''بس مجھے نہیں پتہ، اور ہاں شعر ضرور لکھنا۔''
''کون سا شعر؟''
''کوئی بھی جو تمہیں آتا ہو۔''
''مجھے تو کوئی بھی نہیں آتا۔''
''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسکول میں پڑھتی ہو اور کوئی شعر بھی نہیں آتا؟''
''اچھا، مجھے وہ آتا ہے۔۔۔لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔''
''ارے کیا کر رہی ہو؟؟؟ آپا، آنا ذرا۔۔۔''
اس کی امی کو پھر مداخلت کرنا پڑی، اور بتانا پڑا کہ لکھو کہ میں بہت اداس ہوں، بس تم ایک مرتبہ آجاؤ، پھر میں اپنے ماں باپ کو منا لوں گی۔
لڑکی پھر بپھر گئی ''اس کا کیا مطلب ہے؟''
ماں نے سمجھایا ''بیٹا یہ ان کے گھر کی باتیں ہیں، چھوڑو تم، اور خبردار جو کسی کو بتایا تو، وہ مار لگاؤں گی کہ سالوں یاد رکھو گی۔''
''چلو اب شعر لکھ دو۔''
''کونسا؟''
''شیشی بھری عطر کی پتھر پہ توڑ دوں گی۔''
''مگر وہ کیوں توڑو گی؟''
''یا اللہ، تم لکھو تو سہی۔۔۔خط کا جواب نہ آیا تو خط لکھنا بھی چھوڑ دوں گی۔''
''کیا مطلب، اب وہ خود آئے یا خط لکھے؟''
''ایک تو تم ہر بات کا مطلب پوچھتی ہو۔''
''تو کیوں توڑو گی عطر کی شیشی؟ نہیں چاہیئے تو مجھے دے دو۔''
ماں سے پھر ڈانٹ پڑ گئی بے چاری کو۔
''چلو شاباش اب ایڈریس لکھ دو۔''
''بتاؤ۔''
''رشید بن حمید، گاؤں نمبر ۲۶۵ گ ب، تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ، ضلع لائلپور میں بشیر صاحب کو ملے۔''
''شروع میں کوئی اور نام لکھوا رہی ہو آخر میں کوئی اور، یہ کیسے پہنچے گا؟''
''پہنچ جائے گا، تم لکھو ورنہ آپا کو بلاؤں؟'' اب وہ اس کی کمزوری سے واقف ہو گئی تھی۔
''نہیں میں لکھ دیتی ہوں، مگر یہ کوئی نہیں پہنچنا، میں بتائے دے رہی ہوں۔ ڈاکخانہ کون سا ہے اس گاؤں کا؟''
''وہ بیچ میں ہی ہے۔''
''ہائیں؟''
''ڈاکخانہ بیچ میں ہی ہے۔''
''کیا؟''
''ڈاکخانہ بیچ میں ہی ہے۔''
''کیا لکھوں؟''
''ڈاکخانہ بیچ میں ہی ہے، بس یہی پتہ ہے مجھے۔''
اب کے بچی نے ماں کو پکارا۔۔۔
ماں نے آکر بتایا کہ لکھو۔۔۔''ڈاکخانہ خاص۔''
''اور کچھ؟؟؟''
''نہیں، بہت شکریہ۔۔۔''
پھر اسے کچھ یاد آ گیا، ''آپا اس پر کوئی پھول ہی بنوا دو، میری بات تو یہ ماننے والی نہیں۔''
آپا کو پتہ تھا اس کی بیٹی کتنی قابل ہے، اس نے کہا یہ کیا بنائے گی، میں بنا دیتی ہوں۔۔۔اب دستخط کا مسئلہ آ گیا، تو اس مٹیار نے کہا کہ تم اپنا نام لکھ دو، لڑکی بے چاری اُصولوں کی ماری، پھر معترض ہو گئی، میں کیوں دستخط کروں، خود ہی کرو، ماں نے سمجھایا کہ یہ دستخط نہیں ہیں صرف نام لکھنا ہے، خدا خدا کر کے یہ مراحل طے ہوئے، اس طرح تینوں نے مل کر مجھ پر جذبات کی مینا کاری کی اور مجھ کورے کاغذ کو محبت نامے میں تبدیل کیا۔۔۔اب میں اپنے سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔

اقبال حسن آزاد

بات کوئی پینتیس سال پُرانی ہے۔ اُس وقت زندگی قدرے سیدھی اور سرل تھی۔ ٹی وی تھا نہ موبائیل اور نہ ہی انٹرنیٹ۔۔۔فون بھی بس سرکاری دفتروں تک محدود تھا یا پھر کسی صاحب ثروت یا باحیثیت شخص کے گھر پر۔۔۔اور وہ بھی زیادہ تر خراب ہی رہا کرتا تھا۔لوگوں کا رابطہ صرف خطوں کے ذریعہ ہوا کرتا تھا۔

بھائی جمیل اختر پٹنہ کے رہنے والے تھے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے نوکری حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔آخر کافی تگ و دو کے بعد انہیں بھاگلپور کلکٹریٹ میں کلرک کی نوکری مل گئی۔انہوں نے ایک لاج میں کمرہ لیا اور مزے کی گزر بسر ہونے لگی۔اس وقت تک موصوف کنوارے یعنی چھٹے سانڈ تھے۔صبح تیار ہو کر آفس جاتے۔دن بھر وہاں دل لگا کر کام کرتے۔کینٹین میں لنچ لیتے۔شام کو دوستوں کے ساتھ بازار میں ٹہلتے۔ رات گئے ہوٹل میں کھانا کھا کر سو رہتے۔آدمی کافی خوش مزاج اور خوش اخلاق تھے لہذا جلد ہی ان کے دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔آفس میں بھی وہ ایک ہر دل عزیز شخصیت کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔اچھا خاصا ادبی ذوق رکھتے تھے اور ہلکی پھلکی شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ان کی ان خصوصیتوں کی وجہ سے ان کے باس بھی ان سے خوش رہا کرتے تھے۔

پرانے ڈی ایم صاحب کا تبادلہ ہوا اور نئے ڈی ایم صاحب نے چارج سنبھالا۔سوئے اتفاق سے یہ بھی پٹنہ ہی کے رہنے والے تھے۔انہیں جب معلوم ہوا کہ بھائی جمیل اختر کا گھر بھی پٹنہ ہی ہے تو بہت خوش ہوئے اور انہیں عزیز رکھنے لگے اور جب بھی فرصت میں ہوتے تو ان سے اشعار سنانے کی فرمائش کرتے۔

جمیل بھائی ہر سنیچر کو ٹرین پکڑ کر پٹنہ چلے جاتے اور اتوار اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار کر سوموار کی سویرے والی گاڑی پکڑ کر آفس کے وقت تک بھاگلپور پہنچ جاتے۔کبھی کبھی ٹرین لیٹ بھی ہو جایا کرتی تھی لیکن اس کے لئے ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔

ایک سنیچر کو ڈی ایم صاحب نے انہیں بلایا اور ایک دستی خط انہیں تھما کر بولے کہ اسے ان کی بیگم تک پہنچا دیں اور اگر وہ کوئی

جواب دیں تو اسے لے آئیں۔ ڈی ایم صاحب نے اپنا پتا لفافہ پر لکھ دیا تھا اور انہیں اپنے گھر کا راستہ بھی سمجھا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سوموار کا ایک اہم میٹنگ ہے اس لئے وہ کل ہی واپس آ جائیں۔ جمیل بھائی پٹنہ پہنچے اور اسی وقت خط ڈی ایم صاحب کی بیگم کو پہنچا آئے۔ بیگم صاحبہ نے کھڑے کھڑے خط پڑھا اور پوچھا کہ وہ واپس کب جائیں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کل دوپہر والی گاڑی سے۔ بیگم صاحبہ نے ان سے کہا کہ وہ صبح دس بجے تک آ کر ان سے مل لیں۔ چنانچہ دوسرے روز صبح دس بجے وہ ایک بار پھر بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک لفافہ انہیں تھمایا اور ساتھ ہی ایک ٹفن بھی دیا کہ ان چیزوں کو صاحب تک پہنچا دیں۔ جمیل بھائی نے خط اور ٹفن سنبھالا اور گھر لوٹ گئے۔ گھر آ کر خط تو انہوں نے اپنی جیب میں ڈالا اور ٹفن کو اپنے بیگ کے پاس رکھ دیا۔ ٹرین کا وقت ہوا تو نکل پڑے۔

شام سات بجے تک وہ بھاگلپور پہنچ چکے تھے۔ برسات کا موسم تھا لیکن کئی دنوں سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ اُمس بھری گرمی نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ انہوں نے سامان ایک طرف رکھا اور باہر نکل پڑے۔ بازار میں دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بھوک لگی تو ہوٹل میں کھانا کھایا اور لاج میں آ کر سو رہے۔

صبح کچھ تاخیر سے اُٹھے۔ طبیعت پر کسلمندی سی طاری تھی۔ نہا دھو کر تیار ہوئے اور آفس کے لئے نکل پڑے اور وہاں پہنچ کر کام میں مشغول ہو گئے۔ میٹنگ شروع ہوئی تو یہ ضروری کاغذات لے کر صاحب کے چیمبر میں گئے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد وہ کینٹین میں کھانا کھانے چلے گئے اور جب پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو بیگم صاحبہ کا خط بھی نکل آیا۔ خط دیکھ کر انہیں ٹفن کی یاد آئی جسے وہ لاج میں چھوڑ آئے تھے۔ اب تو وہ یہ سوچ کر گھبرائے کہ صاحب اگر پوچھیں گے کہ خط اور ٹفن اتنی تاخیر سے کیوں پہونچایا تو وہ کیا جواب دیں گے۔ لیکن یہ سب سوچنے کا ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ تیر کی طرح آفس سے نکلے، ایک رکشہ

میاں والی کے میاں ہیں، ایسے گھر میں پیدا ہوئے جہاں بندہ ایک رات بسر کر لے تو یہی سمجھتا ہے رات مسجد میں ٹھہرا تھا، وہ تو تب بھی مولانا تھے، جب ابھی ان کی داڑھی نہ تھی، مولیوں کی طرح سوچتے مگر کہتے نیازیوں کی طرح ہیں، یعنی زبان سے سوچتے اور ہاتھ سے کہتے ہیں، بچپن میں اسکول میں مانیٹر تھے اور ساری کلاس کے لڑکوں کو نماز پڑھانے لے کر جاتے اور خود ڈنڈا پکڑ کر دیکھتے رہتے کہ کوئی آدھی نماز میں پڑھ کر کھسک تو نہیں رہا ہے۔

مولانا دستار نیازی از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

پکڑا، سیدھے لاج پہنچے، صاحب کا ٹفن اُٹھایا اور پھر اسی رکشے پر لوٹ پڑے۔ صاحب اپنے چیمبر میں اس وقت تنہا تھے۔ جمیل بھائی اجازت لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور ادب کے ساتھ دونوں چیزیں ان کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ لیکن ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ چپراسی نے آ کر صاحب کا سلام دیا۔ یہ اُٹھے اور پھر صاحب کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ صاحب نے ان سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ لنچ لے چکے ہیں کیا؟''

''جی۔۔۔ جی ہاں!'' انہوں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی سمجھ میں صاحب کا یہ سوال نہیں آیا تھا۔ صاحب بدستور مسکرا رہے تھے۔ پھر انہوں نے ٹفن جمیل بھائی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''لیجئے، کچھ اور کھایئے۔'' اتنا کہتے ہوئے صاحب نے ٹفن کا ڈھکن اُٹھا دیا۔ بدبو کا ایک بھبکا اُٹھا اور جمیل بھائی کی طبیعت متلا گئی۔ ٹفن میں رکھی چکن بریانی کب کی خراب ہو چکی تھی۔ انہوں نے بے بسی کے ساتھ صاحب کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ اگر بیگم صاحبہ نے انہیں بتا دیا ہوتا کہ ٹفن میں کیا ہے تو وہ اسے رات ہی کے وقت صاحب کے پاس پہنچا دیتے مگر اب پچھتاوے کیا ہوت؟

ارشاد العصر جعفری

مزاحیہ

شاعر صاحب

ہمارا محلہ ماشاء اللہ بہت زرخیز ہے۔ ہر قسم کے کردار ہمارے محلے میں مل جاتے ہیں۔ شاعر، سیاست دان۔ ریڑھی لگانے والے، ٹیچرز، وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب کردار اپنی اپنی بیوی سے عاجز ہیں۔ چونکہ ہم بھی شاعری کرتے ہیں اور قیس چلبلائی ہمارا ادبی نام ہے اس لئے شاعر صاحب سے ہماری اچھی خاصی علیک سلیک ہے۔ ایک دن ہم ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم نے کہا۔

''بیگم کی تعریف تو کیجئے''۔

بولے۔ ''لاحول والا قوت۔ بھلا بیگم بھی کوئی ایسی چیز ہے جس کی تعریف کی جائے''۔

''ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بیگم کی اچھائیاں بیان کریں۔ بلکہ ہم تو یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بیگم کیا ہوتی ہے، کیسے ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے''......ہم نے کہا۔

''بھئی ہم تو اور کچھ نہیں جانتے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ بیگم سترہ برس کی ہو یا ستر برس کی، دونوں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بالکل فضول سی۔ بور سی''......شاعر صاحب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''جناب۔ آپ بھی تو محبوبہ کے قصیدے لکھتے ہیں۔ کبھی کسی شاعر نے بیوی پر قصیدہ نہیں لکھا''......ہم نے بیویوں کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''لکھے گا بھی نہیں۔ بیگم شوہر کو اس قابل کہاں چھوڑتی ہے کہ وہ اس پر قصیدہ لکھتے''......شاعر صاحب نے کہا۔

''ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اچھی بیگمات بھی ہوتی ہیں''...... ہم نے اپنے دوست شاعر سے کہا۔

''ہم نے تو کبھی کوئی اچھی بیگم نہیں دیکھی۔ اب اسے ہی دیکھ لو جو ہمارے گھر میں ہے۔ شادی سے پہلے فرماتی تھیں کہ میں تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیا کروں گی اور اب......اب ہمیں اس کے پاؤں دھونے پڑتے ہیں۔ شادی سے پہلے انہیں ہماری شاعری سے والہانہ محبت تھی اور اب انہیں ہماری شاعری سوکن دکھائی دیتی ہے''......شاعر صاحب نے غمگین لہجے میں کہا۔

''اے اے......میں نے بہت باتیں سن لیں۔ ہاں تم بھی تو شادی سے پہلے کہتے تھے کہ نجمہ! میں تمہارے لئے تارے توڑ لاؤں گا۔ تارے تو کیا تم تو گھر میں سو روپے نہیں لا سکتے کہ میں

ہانڈی پکالوں'' شاعر صاحب کی بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بیگم۔ ہم نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ یوں چوروں کی طرح ہماری باتیں نہ سنا کرو مگر تم باز نہیں آتیں۔ اپنی اس جاسوسی سے'' شاعر صاحب بیگم سے بگڑ کر بولے۔

''ارے جاؤ۔ کیا بگاڑلو گے تم میرا اور ہاں مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہاری باتیں سننے کا۔ میں تو پیسے لینے آئی ہوں۔ پیسے نکالو میں سبزی لینے جارہی ہوں'' بیگم شاعر نے منہ بنا کر کہا۔

''پیسے تو نہیں ہیں میرے پاس۔ تم یوں کرو کہ میرا دماغ پکالو'' شاعر صاحب نے بھی منہ بنا کر کہا۔

''تا کہ میں اور میرے بچے پاگل ہو جائیں۔ میں پہلے پاگل تھی کہ تم سے شادی کر بیٹھی۔ مگر اب نہیں ہوں سیدھی طرح سے پیسے نکالو۔ ورنہ مجھے انگلی ٹیڑھی کرنی بھی آتی ہے'' بیگم صاحبہ نے شاعر صاحب کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم سے شادی کر کے تو میں عذاب میں پھنس گیا ہوں ہر وقت پیسوں کا تقاضا'' شاعر نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا تو بیگم صاحبہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''یا اللہ۔ یا اللہ۔ میرے ابا کو اچھے خاصے رگڑے لگا نا کہ اس نے مجھے اس شاعر کے پلے باندھ دیا'' بیگم صاحبہ نے اوپر دیکھتے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں بے چارے شریف آدمی کو بددعائیں دیتی ہو۔ حالانکہ مجھ سے شادی کی ضد تم نے کی تھی'' شاعر نے کہا۔

''ہاں میں تو اس وقت بچی تھی، نادان تھی۔ ناسمجھ تھی۔ وہ مجھے سمجھا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ایک شاعر کے حوالے کر دیا اور یہ تو مجھے بعد میں احساس ہوا کہ انہوں نے مجھے نافرمانی کی سزا دی ہے'' بیگم صاحبہ کے لفظوں سے پشیمانی عیاں ہو رہی تھی۔

''سزا تو میں بھگت رہا ہوں تم سے شادی کر کے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں عمر قید کاٹ رہا ہوں'' شاعر صاحب نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خدا کسی کو بھی شاعر، ادیب کی بیوی نہ بنائے مگر۔۔۔ مگر یہ بھولی بھالی لڑکیاں اور ان کے والدین کسی نہ کسی طرح ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مجھے کچھ کرنا پڑے گا'' شاعر صاحب کی بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے زور سے چٹکی بجائی۔

''ترکیب آ گئی۔ میں کل کے اخبارات میں اشتہارات شائع کراتی ہوں جس میں ان شاعروں اور ادیبوں کے پول کھولوں گی اور لڑکیوں کے والدین کو نصیحت کروں گی کہ وہ ہرگز ہرگز اپنی معصوم اور لاڈوں پلی بیٹی کی شادی کسی شاعر، ادیب سے نہ کریں کیونکہ مفلس شاعر اور کنگال ادیب ان کی بیٹی کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ میرے اشتہارات کے بعد انشاء اللہ کسی شاعر، ادیب کی شادی نہیں ہوگی'' شاعر کی بیگم صاحبہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر ہمارا دم خشک ہو گیا۔ ہمیں اپنی دنیا اندھیروں میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ارے۔ ارے۔۔۔ ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ ہمارا کیا بنے گا۔ ہم بھی تو شاعر ہیں'' ہم نے گھبرا کر کہا۔

''تم۔۔۔ سارے شاعر، ادیب جاؤ جہنم میں۔ کم از کم لڑکیاں تو سکھ کا سانس لیں گی اور کیا کہا تم نے۔۔۔ تم بھی شاعر ہو'' بیگم صاحبہ نے بات کرتے کرتے چونک کر پوچھا۔

''دنیا تو نہیں مانتی مگر ہم خود کو ملک کا بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں'' ہم نے اکڑ کر کہا۔

''اٹھو'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''کک۔۔۔ کک۔ کیا مطلب'' ہم حیران رہ گئے۔

''تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں شاعروں، ادیبوں اور گدھوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اب اٹھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ'' بیگم صاحبہ کے تیور کافی خطرناک نظر آرہے تھے لہٰذا ہم اٹھنے لگے۔

''میں جا رہا ہوں مگر دیکھئے وہ اشتہار مت دیجئے گا اخبار میں'' ہم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اشتہار تو ضرور چھپے گا اخبار میں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے'' بیگم صاحبہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اونہہ۔ پانچ دس روپے تو ہیں نہیں جیب میں۔ پان کھانے کے لئے اور چلی ہیں اخبار میں اشتہار چھپوانے کے لئے۔ یہ منہ اور مسور کی دال'' شاعر صاحب نے طنزاً کہا تو ہمیں اطمینان محسوس ہوا ورنہ ہم تو اپنے مستقبل کو تاریک سمجھ بیٹھے تھے۔

''منہ اور مسور کی دال نہیں، یہ منہ اور دیوان خاص'' بیگم صاحبہ نے کہا اور دیوان اٹھا کر شاعر کے منہ پر دے مارا۔ شاعر صاحب تو وہیں لم لیٹ ہو گئے جبکہ ہم نے باہر بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔

صداقت حسین ساجد

میں نہ مانوں!

سو فیصد غیر سیاسی تحریر

اُن دنوں کی بات ہے جب لوگ زیادہ تر پیدل سفر کرتے تھے۔

نازو شہر گیا اور واپسی پر ایک بڑا سا رات تربوز لے لیا۔ تھیلا تو اس کے پاس تھا نہیں، اس لیے سر پر دھر لیا۔ پھر گاؤں جانے والے راستے پر ہولیا۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچا تھا کہ اسے فضلو ملا۔ فضلو اس کا پڑوسی تھا۔ اس نے پوچھا ''نازو! یہ تربوز کتنے کا لیا ہے؟''

''تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے!''

''غلط فہمی؟۔۔۔مگر کس بارے میں؟؟''

''یہ تربوز نہیں ہے!!''

''پھر کیا ہے؟''

''یہ پیٹھا ہے۔''

''ہا ہا ہا ہا۔۔۔نازو! ایک میں ہی تجھے ملا ہے بے وقوف بنانے کو۔۔۔وہ کوئی بے وقوف ہی ہوگا، جو تربوز اور پیٹھے میں فرق محسوس نہ کرسکے، تم چول کسی اور کو بنانا، دس بندوں میں بات کرو گے، تو وہ بھی تمھارا ہی مذاق اڑائیں گے۔''

''اگر یہ بات ہے، تو سن فضلو! کل شام کو لمبردار کے ڈیرے پر آجانا۔۔۔وہیں فیصلہ ہوجائے گا۔''

یہ سن کر فضلو نے رضامندی ظاہر کردی۔ نازو آگے بڑھ گیا۔ راستے میں اور بھی لوگ ملے۔ ان سے بھی یہی بحث ہوتی رہی۔ نازو انھیں بھی لمبردار کے ڈیرے پر کل ہونے والی پنچایت کے بارے میں دعوت دیتا گیا۔ سب نے آنے کا وعدہ کرلیا، کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ نازو جھوٹا ہی ثابت ہوگا۔

نازو بہت خوش تھا۔ اسے اپنے پر بھروسا تھا کہ وہ ان لوگوں کو جھوٹا ثابت کردے گا۔

وہ خوش خوش گھر میں داخل ہوا۔ بیٹے کی نظر جوں ہی تربوز پر پڑی، وہ خوشی سے چلا اٹھا۔

''آہا۔۔۔آج تو ابا تربوز لے کر آیا ہے۔۔۔مزا آئے گا۔''

''مزے کے بچے! میں نے سب کو جھوٹا بنا دیا ہے اور تو مجھے جھوٹا بنا رہا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ تربوز نہیں، پیٹھا ہے۔۔۔پیٹھا۔''

''ابا! یہ کیا کہہ رہے ہو!''

''راستے میں کافی لوگوں سے میری بحث ہوئی ہے۔۔۔انھیں میں نے کل لمبردار کے ڈیرے پر بلایا ہے۔۔۔وہاں میں یہ ثابت کردوں گا کہ یہ پیٹھا ہے۔۔۔''

''لیکن کیسے؟ تو جھوٹا ہوجائے گا۔''

''جب میں مانوں گا ہی نہیں، تو کوئی کیسے منائے گا؟''

بیٹا منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔

حافظ مظفر محسن

پانچ کروڑ لے لو!

تیسری قسط

''تم مجھ سے راحت کے بارے میں تو پوچھنا نہیں چاہتے؟''

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا ''اصل میں میرے دل میں وہ بات ابھی تک محفوظ ہے اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں تو مجھے شدید پریشانی ہونے لگتی ہے کیونکہ راحت کے قتل کے بعد آپ نے مجھے اس حوالے سے کوئی بھی تفصیل میرے شدید اصرار کے باوجود نہیں بتائی حالانکہ جب راحت اسلام آباد کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مردہ پایا گیا تو پولیس رپورٹ کے مطابق اُسے قتل کیا گیا تو میں اُس وقت بھی آپ کا سب سے گہرا دوست تھا آپ نے صرف روتے ہوئے مجھے یہ بتایا تھا کہ راحت نے چند ماہ پہلے مجھ سے خفیہ طور پر نکاح کیا تھا اور وہ میرے ساتھ کئی مہینے لاہور جوہر ٹاؤن والے گھر میں میرے ساتھ بھی رہا تھا اور جب وہ اسلام آباد کے فائیو اسٹار ہوٹل میں مردہ پایا گیا تو اُس وقت اُس کے سامان سے تیرہ لاکھ پچاس ہزار روپے بھی نکلے تھے جو آپ نے اسلام آباد جا کر ہوٹل انتظامیہ سے راحت کی بیوی کے طور پر وصول کیے تھے۔''

اس دوران ہم لوگ ''سروس ایریا'' میں پہنچ چکے تھے اور پریشانی میں اُس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ہم یہاں کس لیے رُکے ہیں۔

لیکن میں نے جلدی سے اتر کر اُس کا دروازہ کھلا اور مجبوراً اُسے گاڑی سے نیچے اترنا پڑا جونہی ہم نیچے اترے سامنے ایک پچاس سال کا مرد ہمیں گھور رہا تھا، جیسے پہچان رہا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ ہمارے قریب آتا چلا گیا اُس نے آتے ہی میرے ساتھ ''شیک ہینڈ'' کیا اور اُس کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولا ''کیسی ہو فیمی؟''

''میں نے پہچانا نہیں!'' اُس نے بے اعتنائی سے کہا اور غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا ''مجھے بھوک لگی ہے جلدی چلیں۔۔۔''

اس دوران وہ شخص وہیں کھڑا رہا اُس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ اُس کو کوئی غلط فہمی نہیں اور نہ ہی اُس نے یونہی ہم لوگوں سے سلام دعا کی ہے۔

اس دوران ہم جا کر ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ میں نے مینو کارڈ اُس

کی طرف بڑھایا اور خود اُسی کے ساتھ ٹیک لگا کر اُس آدمی کے بارے میں سوچنے لگا وہ بھی پریشان تھی پریشانی میں میں نے دیکھا اُس نے مینو کارڈ الٹا پکڑا ہوا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''کیا کھائیں گے؟'' ویٹر نے پوچھا

''ابھی تھوڑی دیر میں بتاؤں گی!!''

اس دوران میری دائیں طرف نکر پر نظر پڑی تو وہ اجنبی وہاں بیٹھا تھا عجیب طرح کی پریشانی تھی اُس کے چہرے پر، اُس کی آنکھوں میں مجھے ایک خوف سا دکھائی دیا لیکن میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اس Odd ٹائم میں یہاں کیسے پہنچا، کیا اُسے پتہ تھا کہ ہم رات کے پچھلے پہر بلکہ صبح ہونے کو ہے اور ہم یہاں آئیں گے لیکن فہمی کا خوف اور تذبذب بتا رہا تھا کہ اُسے پہلے سے اس بات کا علم نہ تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ جرائم پیشہ لوگ یا ٹیریک سے ہٹی ہوئی عورتیں اتنی خوفناک بلکہ اذیت ناک منصوبہ بندی کرتی ہیں یا ان کا وار اس انداز کا ہوتا ہے کہ عام آدمی کی سوچ وہاں تک نہیں پہنچ پاتی۔ مجھے بارہ سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا جب میں اور فہمی اسی طرح رات گئے اسلام آباد سے واپس لاہور آ رہے تھے

تو وہ صبح سات بجے جب ہم فیمی کے گھر کے باہر پہنچے ابھی ہم نے گاڑی کی بریک لگائی ہی تھی کہ پولیس کی ایک بڑی سی گاڑی اچانک نہایت تیزی کے ساتھ میری گاڑی کے پیچھے اچانک آ کر رکی، اُس گاڑی میں سے چار مسلح پولیس والے چھلانگیں مار کر سامنے آ گئے میری پریشانی کی انتہا نہ رہی لیکن جب میں نے پولیس کی اُس گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایک سینئر آفیسر کو مسکراتے دیکھا تو ادھر سے فیمی کو ہنستے ہوئے اُس کی جانب بڑھتا دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق واسطہ ہے، اس دوران اُس آفیسر نے گاڑی سے نکل کر مجھ سے بھی ہاتھ ملایا، فیمی نے گھر کا مین گیٹ کھولا اور ایک ہی وقت میں ہم دونوں کو اندر آنے کو کہا
۔

میں گاڑی لاک کیے بغیر گھر کے مین گیٹ سے اندر جانے لگا تو اُس نے کہا ''نہیں نہیں، تمہیں یاد نہیں لیکن آج چودہ فروری ہے۔۔۔ویلنٹائن ڈے۔۔۔ میں تمہیں پھول اور تحفے پیش کرنے آیا ہوں۔'' اُس نے اپنی گاڑی سے پھولوں کے دو تین بڑے گلدستے اور دو تین مٹھائی کے پیکٹ منگوائے اور فیمی کو جھک کر نہایت ادب اور محبت سے پیش کیے ''آیئے نہ ناشتہ کریں ہمارے ساتھ۔۔۔ہم بھی تھکے ہوئے اسلام آباد سے آئے ہیں!
''

وہ پھر پیچھے کو مڑی، اُس نے میرا تعارف کرواتے ہوئے اُس پولیس آفیسر کو بتایا کہ یہ میجر الطاف ہیں میرے شوہر کے بھائی۔۔۔ اس دوران وہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی دکھاتے ہوئے واپس مڑا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ چاروں پولیس والے بھی چھلانگیں لگا کر گاڑی میں بیٹھے اور دھول اُڑاتی ہوئی گاڑی تیزی سے گلی سے نکل گئی۔ میں اندر جانے لگا تو اُس نے مجھے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا'' بدر صاحب آپ گاڑی تو لاک کر دیں، پریشانی میں مجھے پتہ ہے آپ گاڑی لاک کرنا بھول گئے تھے لیکن یہ میں جانتی ہوں کہ آپ ایک بہادر انسان ہیں اور جہاں میں پریشان ہو جاتی ہوں وہاں آپ کے پاؤں کبھی بھی میں نے لڑکھڑاتے نہیں دیکھے۔''

اس دوران میں تیزی سے جب ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا فیمی کا آٹھ نو سال کا بچہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا مگر اُس کی آنکھیں کھلی تھیں گویا وہ رات سے جاگ ہی رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو اچانک اُٹھ کھڑا ہوا ''انکل مجھے بھوک لگی ہے میں نے حلوہ پوڑی کھانا ہے!''

میں نے اُس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور اُسے کہا ''میں واش روم سے ہو کر آتا ہوں پھر ہم دونوں شہر چلیں گے، وہاں سے بٹ سویٹس سے حلوہ پوڑی لے کے آئیں گے!!''

اُس نے میرے پاس آ کے میرے کان میں آہستہ سے کہا ''انکل! کیا آپ بھی پانچ کروڑ لینے آئے ہیں؟''

میں اچانک اتنی بڑی رقم کا سن کے پریشان ہو گیا اور بچوں کی آنکھوں میں دیکھنے لگا مجھے وہ ایک خوفناک مرد دکھائی دیا

''چلو چلو ناشتہ کرتے ہیں۔۔۔'' اچانک وہ اندر آ گئی۔

''نہیں ہم آپ کا بنایا ہوا ناشتہ نہیں کریں گے، ہم نے ناشتہ کرنے شہر جانا ہے۔''

''میں سمجھ گئی اتنی جلدی آپ دونوں کے درمیان انڈر سٹینڈنگ بھی ہو گئی اور کمٹمنٹ بھی۔''

میں واش روم میں چلا گیا پانچ منٹ بعد جب میں باہر نکلا تو وہ بچہ اپنی آنکھیں ٹشو پیپر سے پونچھ رہا تھا اور اُس کی آواز میں گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔

گویا صرف پانچ منٹ میں فیمی نے بچے کے کان مروڑ لیے، اُسے ڈرا دھمکا کے بلکہ رُلا کے کچھ نصیحت کی ہو گئی یا شاید اُسے خوفزدہ کیا ہو گا۔ میں سوچنے لگا آخر کیا وجہ ہے کہیں اس بات پر بچے کی کھینچائی تو نہیں ہوئی کہ اُس نے میرے ساتھ کہیں جانے کا وعدہ کیا ہے یا ناشتہ کرنے کا اور وہ بھی شہر جا کے پروگرام بنایا ہے۔

اس دوران اچانک میرے ذہن میں آیا کہیں فیمی نے بچے کا وہ فقرہ تو نہیں سن لیا جس میں اُس نے مجھے نہایت محبت سے اور پریشان ہوتے ہوئے مجھے چند منٹ پہلے اچانک پوچھا تھا ''انکل آپ بھی پانچ کروڑ لینے آئے ہیں؟''

(باقی آئندہ)

ارمان یوسف

باب پنجم

لندن ایکسپریس

پاکستان انٹرنیشنل ائر لائن کا جہاز بھرا بھرا سا تھا۔ کچھ مسافر ابھی سوار ہو کر سامان بھی ٹھونس رہے تھے۔ عجیب بے ترتیبی اور ہنگامی سی صورتِ حال برپا تھی۔ کچھ ہی دیر میں جہاز نے اڑان بھری اور لاہور کو پیچھے چھوڑ کر ہوا کے کاندھے پہ سوار ہوئے عازمِ سفر ہوا۔ سیٹ کے سامنے لگی سکرین پر ہم نے اپنی پسند کی موسیقی ڈھونڈ نکالی اور سننے لگے۔ اِتنے میں سفید وردی میں ملبوس ایک کالا سا فضائی میزبان چند قسم کے مشروبات کے ساتھ آ وارد ہوا۔ شکریہ کے ساتھ ہم نے پانی قبول کیا، سوچا کہ جب تک کھانے کا وقت ہوگا بھوک بھی خوب چمک اٹھے گی۔ پیٹ بھر کے کھانا کھا کر ٹکٹ کے پیسے بھی تو پورے کرنے ہیں آخر۔ مگر باکمال لوگوں نے مڑ کے پوچھا تک نہیں۔ ٹھیک پانچ گھنٹے بعد ایک چھوٹا سا ٹرے سامنے رکھ دیا گیا۔ ایک حصے میں چند چمچ چاول اور آلو کے دو عدد ٹکڑے جبکہ دوسرے حصے میں پالک اور مرغی کی بوٹی۔ کمال مہربانی سے ٹکٹ پہ لکھے ملٹی میل کا وعدہ پورا کر دیا گیا تھا اور کھانا بھی ایسا کہ چھپر ہوٹل کے چار دن کے باسی کھانے کو بھی مات دے دے۔ سوچ رہے تھے کہ کیا پی آئی اے شروع سے ہی لاجواب تھا کہ بعد میں باکمال ہوا۔

بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کی خواہش پر ۱۹۴۶ء میں

مرزا احمد اصفہانی اور آدم جی نے ''اورینٹ ائرویز'' کی بنیاد ڈالی جو تقسیم کے بعد کراچی ہوائی اڈے کو ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین پروازوں کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں میں بھی اپنی سروس کا آغاز کیا۔ یوں ۱۹۵۵ء میں یہ ہوائی سروس ''پاکستان انٹرنیشنل ائرلائن'' کے نام سے ابھر کر سامنے آئی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ائر مارشل نور خان کی قیادت میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ جدید مسافر طیاروں کے ساتھ ساتھ کارگو سروس بھی شروع کی گئی۔ کئی عالمی ریکارڈ پی آئی اے کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ جن میں دور دراز کی منزلوں کے لئے ''بوئنگ ۷۷۷'' کا استعمال کرنے والی دنیا کی پہلی فضائی کمپنی، باقاعدہ ہیلی کاپٹر سروس مہیا کرنے والی، عوامی جمہوریہ چین سمیت آزاد ازبکستان کے شہر تاشقند میں اترنے والی دنیا کی پہلی فضائی کمپنی کے ساتھ ساتھ سروس، معیار اور کارکردگی کے کئی ایشیائی ریکارڈ بھی اس کی تجوری میں پڑے پڑے زنگ آلود ہو رہے ہیں۔ مگر اب یہ عالم ہے کہ غیر تسلی بخش حفاظتی اقدامات کی بنا پر کبھی یورپ میں پابندی لگی ہوتی ہے اور کبھی یو کے میں۔ کبھی پائلٹ خود ''جہاز'' بنے جہاز اڑانے کی کوشش میں بریڈ فورڈ ائر پورٹ پر مقامی پولیس کے ہاتھوں دھر لئے جاتے ہیں اور کبھی مانچسٹر کے ہوٹلوں سے صابن اور تولیے چراتے پکڑے جاتے ہیں۔ بیشتر عملہ بھی ہیروئن اور چرس کی سمگلنگ میں ملوث پایا جاتا ہے۔ خیر چھوڑیئے، اتنی خوبیاں ہیں کہ گنوائی نہیں جاسکتیں۔ ابھی سر دُکھ رہا ہے آرام کرنے دیں، لندن میں ملاقات ہوگی۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈینٹل سرجن

ڈینٹل سرجن اور عام ڈاکٹر میں یہ بھی ایک نمایاں فرق ہے کہ اول الذکر کو بیٹھے بٹھائے ۳۲ ممکنہ مریض یکجا مل سکتے ہیں۔ پڑھائی میں کمزور ایک طالب علم اپنے والد صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ بتایئے بابا میں دل کا سرجن بنوں یا دانتوں کا۔ باپ اپنے بیٹے کی لیاقت اور ذہانت و فطانت سے بہت اچھی طرح باخبر تھا کہنے لگا کہ بیٹا دل تو صرف ایک ہوتا ہے دانتوں کی خیر ہے ۳۲ ہوتے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں ڈاکٹر حضرات ڈینٹل سرجنوں کی پریکٹس پہ نظر ڈالتے ہیں تو بقول ڈاکٹر مظہر عباس:

ماہرِ دنداں سے بولے ماہرِ امراضِ قلب
ایک فی صد سے بھی کم ہوں گے مرے سارے مریض
سوچتا ہوں کس قدر ہیں آپ خوش قسمت جناب
ایک منہ میں ہیں پڑے بتیس بیچارے مریض

اسپشلائیزین کے اس دور میں ڈینٹل سرجری کا شعبہ بھی کسی سے پیچھے نہیں اور اب ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو سادہ ڈاکٹر کہنے والے دانتوں کے ڈاکٹروں سے بھی ان کے شعبے کے اختصاص کے مطابق کام لیتے ہیں۔

دانتوں کے اور ماہرِ لب ہیں جدا جدا
ہے لفظ ایک اس کے ہیں مطلب الگ الگ
لگتا ہے جلد ایسا بھی ہوگا کہ ماہرین
ہوں دائیں بائیں بازو کے صاحب الگ الگ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فیس فیس ڈاکٹر کی ہو یا ڈینٹل سرجن کی مریض کو دانت کے درد سے زیادہ درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔ سنا ہے کہ ایک کنجوس مریض دانتوں کے ڈاکٹر صاحب سے لڑ جھگڑ رہا تھا کہ کمال ہے ایک تو ہمارے دانت نکال رہے ہیں اوپر سے انہیں

سے زیادہ درد میں مبتلا کردیتی ہے۔ سنا ہے کہ ایک کنجوس مریض دانتوں کے ڈاکٹر صاحب سے لڑ جھگڑ رہا تھا کہ کمال ہے ایک تو ہمارے دانت نکال رہے ہیں اوپر سے انہیں نکالنے کے پیسے بھی لے رہے ہیں۔ مرزا عاصی اختر کو بھی دانتوں کے ڈاکٹروں سے کچھ اسی قسم کا گلہ ہے ۔

کاش ہوتا نہ یہ کم بخت دہن میں میرے
پانچ سو میرے نکلوائے تو دنداں نکلا

کبھی کبھی ڈاکٹر کی ہوش ربا فیسیں مریض کو بہت پریشان کردیتی ہیں کہ اتنا سادہ سا کام اور اتنے زیادہ پیسے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ جب کسی مریضہ کو دانت نکلوانے کی ضرورت پڑی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے اس کام کی فیس پوچھنے لگی ۔ڈاکٹر نے اپنی فیس دو ہزار روپے بتائی۔

مریضہ حیرت سے کہنے لگی ''کیا؟ یعنی صرف چند منٹ کا کام اور اِتنے زیادہ پیسے!''

اس پر ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے ''محترمہ اگر آپ چاہتی ہیں تو میں یہی کام آہستہ آہستہ آدھے گھنٹے میں بھی کرسکتا ہوں۔''

مول تول اور بھاؤ تاؤ خواتین کا طرہ امتیاز ہے۔ لہذا جہاں اور دکان داروں سے قیمتوں پر جھگڑا ہوتا ہے وہاں ڈاکٹر اور ڈینٹل سرجن بھی نہیں بچتے۔ منقول ہے کہ کوئی مریضہ ڈینٹل سرجن سے ٹیڑھے دانتوں کو سیدھا کرنے کا معاوضہ پوچھ رہی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کی منہ مانگی فیس سن کر مریضہ تیزی سے کلینک سے باہر نکلنے لگی تو ڈینٹل سرجن نے بیتابی سے پوچھا کہ آپ کہاں جارہی ہیں ۔ مریضہ بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بولی'' بس ذرا پلاسٹک سرجن کے پاس جارہی ہوں، منہ ٹیڑھا کروانے کیلئے!''

ڈاکٹر کی فیس ایک طرف مریض کے لئے جان لیوا ہوتی ہے تو یہی فیس دوسری طرف ڈاکٹر کے لئے زندگی بخش اور فرحت آمیز ہوتی ہے ۔دانتوں کے ایک ڈاکٹر صاحب سے ایک مریض پوچھنے لگا کہ یہ جو آپ ہروقت دوسروں کے منہ میں ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ کام گندا نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب خوش ہوتے ہوئے بولے'' نہیں نہیں مجھے تو اس وقت یوں لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے مریض کے بٹوے میں ہاتھ ڈال رہا ہوں۔''

اور فیس لینے کے لئے تو بیچارے ڈاکٹر کو اکثر اوقات اپنی بہت سی خواہشات بھی ترک کرنی پڑجاتی ہیں۔ کسی کلینک میں ایک ماہر دندان حسرت سے اپنی عشق کی داستانیں سنا رہے تھے کہ میری زندگی کے لئے وہ ایک بہترین عورت ہے میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں۔ دوست نے کہا تو بھئی تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک گہری سانس لے کر بولے'' ارے تمہیں کیا بتاؤں میں یہ کام میرے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ میری بہترین مریضہ بھی ہے!''

ہاتھی کے دانت کھانے کے اور مگر دکھانے کے اور ہوتے ہیں مگر حضرتِ انسان کو یہ سہولت حاصل نہیں (صرف عمر کے پہلے چھ سالوں میں دودھ کے دانت ملتے ہیں جو بارہ سال تک قسطوں میں داغ مفارقت بھی دیتے رہتے ہیں) لہٰذا انسان کو بارہ سال کے بعد یہ دونوں کام اپنے بتیس دانتوں کے ایک ہی سیٹ سے کرنے پڑتے ہیں ۔البتہ شوکت جمال اس رائے سے اتفاق کرتے نظر نہیں آتے۔

ہیں ان کے مسکرا کے لبھانے کے دانت اور
بگڑے مزاج تو ہیں گڑانے کے دانت اور
پھل اس بہار کے مری قسمت میں یوں نہیں
پچھلی خزاں میں جھڑ گئے کھانے کے دانت اور
بکرے کے دانت دو ہی دکھائے قصائی نے
جانے کہاں گئے وہ دہانے کے دانت اور
ہاتھی کی آدمی میں بھی پائی گئی صفت
کھانے کے دانت اور دکھانے کے دانت اور
منہ کیا دکھاؤں تجھ کو میں دندان ساز اب
باقی نہیں ٹھکانے لگانے کے دانت اور
شوکت کی عقل داڑھ تو نکلی نہیں مگر
کافی ہیں جو اُگے ہیں سیانے کے دانت اور

شوکت جمال

دانتوں کی صفائی

دانتوں کی صفائی صرف مضبوطی کے لئے ہی نہیں بلکہ نمائش کے لئے بھی ضروری ہے۔ایک مرتبہ ایک مریض دانتوں کے ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس ان کے کلینک پہنچا اور پوچھنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب میرے دانت پیلے ہوگئے ہیں، کیا کروں۔ڈاکٹر صاحب مریضوں کا انتظار کرتے کرتے اکتائے بیٹھے تھے اب مفت مشورہ لینے پر سیخ پا ہوگئے اور بولے۔''جناب پیلے دانتوں کے ساتھ براؤن ٹائی لگائیں بہت میچ کرے گی۔''

دانتوں کی مسلسل صفائی نہ ہوتو دانت نہ صرف پیلے ہوجاتے ہیں بلکہ ان کو متعدد امراض بھی گھیرے میں لے لیتے ہیں۔دانتوں کو کیڑا بھی لگ سکتا ہے جسے طبی اصطلاح میں Dental caries کہتے ہیں:

منہ کو''میٹ'' کے بیٹھا بہت ہی''سوبر'' لگتا تھا
اک دن اس نے منہ جو کھولا اندر''بیڑا'' تھا
وہ کہتا تھا داڑھ کا درد بھی دل سے اٹھتا ہے
ڈاکٹر نے جب ڈاڑھ نکالی اندر کیڑا تھا

خالد مسعود خان

ڈینٹسٹ نے پلائی ہے دانتوں کو وہ دوا
دندان تو وہی رہے کیڑا بدل گیا

ڈاکٹر عزیز فیصل

کینسر

معروف مزاحیہ شاعر جناب عنائت علی خان کے والد ہدایت علی خان ناظر ٹانکی نہ صرف بہت اچھے شاعر تھے بلکہ مزاحیہ شاعری بھی خوب کرتے تھے۔عمر کے آخری حصے میں وہ جب ناک کے کینسر کا شکار ہوئے تب بھی ان کی حسِ مزاح کم نہ ہوئی۔کینسر پھیل کر جب جبڑے تک پہنچا اور ڈاکٹروں کو سرجری کی ضرورت پڑھی تو ضبط کا یارانہ رہا، لکھتے ہیں ؎

جبڑے کو کاٹ کر بھی لگائے ہوئے ہے دانت
کیا جان لے کے چھوڑے گا یہ ڈاکٹر مجھے

ہدایت علی خان ناظر ٹانکی

دانت کا درد

یوں تو ہر درد مری جان برا ہوتا ہے
دانت کا درد مگر سب سے جدا ہوتا ہے
تجھ کو تو درد محبت ہے تجھے کیا معلوم
دانت کا درد جو بڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے

اسد جعفری

درد کہیں بھی ہو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے مگر دانت کے درد سے بڑے بڑے سورما پناہ مانگتے ہیں۔دانتوں میں کیڑا لگا ہو یا کوئی اور مسئلہ ہو دانت کے درد کا جب الارم بجنا شروع ہوجائے تو پھر خیریت نہیں رہتی۔لیکن کبھی کبھی آپ کو ایسی دلیر خاتون بھی مل سکتی ہیں جو اس درد کی ذرا بھی پروہ نہیں کرتی۔ایک ڈینٹل سرجن کے پاس ایسی ہی ایک خاتون آئی اور کہنے لگی''ڈاکٹر صاحب، ایک دانت فوری نکلوانا ہے اور میں بہت جلدی میں ہوں۔چین کلر ٹیکہ لگوا کر وقت بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی۔''

ڈینٹل سرجن عورت کی دلیری سے بہت متاثر ہوا کہنے لگا ''آپ بہت باہمت خاتون ہیں جلدی سے بتایئے آپ نے کون سا دانت نکلوانا ہے؟''

خاتون اپنے شوہر کی طرف مڑ بولی''جلدی سے اپنا دانت دکھائیں کونسا نکلوانا ہے؟؟''

اخراجِ دنداں

مثل مشہور ہے علاجِ دنداں، اخراجِ دنداں۔اکثر اوقات اخراج دنداں کا سبب امراض دنداں کے بجائے کچھ اور بیرونی عوامل بھی بن سکتے ہیں ڈاکٹر مظہر عباس اور ممتاز راشد اپنے اپنے انداز میں اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں

ہاتھوں میں دانتوں کو اُن کے دیکھ کے مظہر نے پوچھا
کہاں گئی وہ آپ کی صاحب اصلی نسلی بتیسی
وہ بولے گندم میں ملاوٹ نے یہ دن دکھلائے ہیں
روٹی جبڑا توڑ جو کھائی، دانت لگے سب مصنوعی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دانت کیوں کر کریں نہ آہ و فغاں
پتھروں کے چنے چبانے سے

محمد ممتاز راشد لاہوری

ڈینٹل سرجن کے علاوہ ظریف شاعر بھی دانت نکلوانے کا اعلیٰ انتظام کرسکتا ہے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مشاعرے بشمول مشاہرے کا معقول بندوبست ہو اور ہنسنے کے لئے سامعین بھی موجود ہوں۔ ہنسی جہاں روح میں خوشی و انبساط کی لہر دوڑا دیتی ہے وہیں چہرے پہ بشاشت اور تروتازگی بھی پھیلا دیتی ہے ۔سائنسدان کہتے ہیں کہ رونے میں زیادہ اور ہنسنے میں چہرے کے بہت کم عضلات کام کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مظہر عباس ع

ہنسنے میں مشقت ذرا کم ہوتی ہے

ہنستے ہوئے بتیسی کا نکلنا ایک عام سی بات ہے۔ مگر انور مسعود بزم یار میں بیٹھ کر بہت ہی محتاط ہو جاتے ہیں۔

بزم میں بیٹھ کے مت دانت نکالو انور
یوں نہ ہو دانت کی مانند نکالے جاؤ

انور مسعود

اس کے سامنے جاؤ گے تو ہنسنا مت
دانت دکھاؤ گے تو فیس دھرا لے گا
مطلب یہ کہ شکل تمہاری دیکھتے ہی
ڈینٹل سرجن فورا دانت نکالے گا

انعام الحق جاوید

نسبت کچھ اس قدر ہمیں گل اور شجر سے ہے
اب کے خزاں میں دانت ہمارے بھی دو جھڑے

شوکت جمال

دانت ہلتے ہیں جو نکلوا دو
ورنہ ان سے چباؤ گے کیا کیا

محمد ممتاز راشد لاہوری

نقلی دانت

دانت اگر مجبوراً نکلوانے پڑ جائیں تو پھر ان کی جگہ چہرے کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے نقلی دانت بھی لگانے پڑ جاتے ہیں۔ یہ نقلی دانت مریض کی جیب کے مطابق سادہ بھی ہو سکتے ہیں اور بہت مہنگے بھی۔ کبھی ان کو ضرورتاً لگوایا جاتا ہے اور کبھی فیشن کے طور پر ۔اور کبھی کبھی یہ فیشن مریض کو بہت مہنگا پڑ جاتا ہے۔

ایک دن بیگم یہ بولیں اپنی نظریں موڑ کے
دانت سونے کے لگاؤ سارے خرچے چھوڑ کے
عرض کی بیگم سے ہم نے ہاتھ اپنے جوڑ کے
لے گئے ڈاکو کئی کے دانت جبڑے توڑ کے
پڑھ کے کل اخبار میں بیگم حیا سے گڑ گیا
ایک نیتا جی کے منہ میں رات ڈاکہ پڑ گیا

ساغر خیامی

کچھ عمرِ گزشتہ کو چھپانے کے لئے ہیں
کچھ رعب حسینوں پہ جمانے کے لئے ہیں
کھانے کے لئے ہیں نہ چبانے کے لئے ہیں
یہ دانت تو نقلی ہیں دکھانے کے لئے ہیں

امیرالاسلام ہاشمی

بتیسی جب اتار کے رکھ دی دراز میں
دلہن بڑے میاں کے دہانے سے ڈر گئی

محمد ممتاز راشد لاہوری

کہا میں نے تمہارے دانت کتنے خوبصورت ہیں
بتاؤں کیسے اپنے بولیں ان کے ناپ لے لیجئے
کہا میں نے کہ پھر بھی آپ جیسے بن نہ پائیں گے
تو بتیسی نکالی اور کہا یہ آپ لے لیجئے

معین اختر نقوی

اب تو ایک ایک کر کے ہر دانت مصنوئی لگ سکتا ہے مگر پچاس سال پہلے بڑھاپے کی نشانی نقلی بتیسی ہوتی تھی جب مریض کے سارے دانت رفتہ رفتہ جبڑوں سے نکل کر ڈینٹل سرجن کی جیب کو بھاری کرتے چلے جاتے تھے۔ تب ڈینٹل سرجن پورے بتیس دانتوں کا مکمل سیٹ مریض کی آسانی اور اپنی شادمانی کے لئے پیش کرتا تھا۔ اس نقلی بتیسی کی رام کہانی ہندوستان کے ممتاز مزاحیہ شاعر جناب مسرور شاہ جہان پوری کی زبانی پیش خدمت

ہے:

دل والو سنو آج مری رام کہانی
ہے بات کچھ ایسی کہ نئی ہے نہ پرانی
دن رات کے نزلے نے مجھے خوب ستایا
گن گن کے نشانہ مرے دانتوں کو بنایا
ہر وقت کی سڑ سڑ نے بری طرح جھنجھوڑا
افسوس کوئی دانت مرے منہ میں نہ چھوڑا
قصہ یہ ہوا گر گئے سب دانت اور بجنل
بتیسی لگانے کا ملا غیب سے سگنل
جس روز سے ڈینٹسٹ نے بتیسی لگائی
بے ضابطہ ہونے لگی بیگم سے لڑائی
اب یاد نہیں کس نے ستم مجھ پہ کیا تھا
یا مشورہ مجھ کو کسی دشمن نے دیا تھا
معلوم نہ تھا یوں کبھی آئیں گے برے دن
مجھ کو مری قسمت پہ رلائیں گے برے دن
جبڑے ہیں کہ کمبخت ہلائے نہیں ہلتے
کھل جائیں بہ وقت تو ملائے نہیں ملتے
بتیسی نے حلیہ میرا اس درجہ بگاڑا
گویا کہ دبا رکھا ہے گالوں میں سنگھاڑا
بجلی کے چمکنے سے چمکتے ہیں مرے دانت
بادل جو گرجتا ہے تو بجتے ہیں مرے دانت
باتیں جو کریں آتی ہیں چوں چوں کی صدائیں
اک ڈھول سا بجتا ہے اگر پان چبائیں
احباب تو چھیڑیں ہیں کہ یہ ساز تو دیکھو
''شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو''
جس بات پہ ہنستے ہیں نکلتے ہیں مرے دانت
اس بات کا مفہوم بدلتے ہیں مرے دانت
روتا ہوں تو ہنستا سا سمجھتے ہیں مجھے لوگ
ہنستا ہوں تو روتا ہوا کہتے ہیں مجھے لوگ
بچے مرے حالات پہ حیران الگ ہیں
بیگم بھی مرے غم میں پریشان الگ ہیں
بتیسی کو جس روز سے منہ میں نے لگایا
سالی نے انگوٹھا مجھے ہنس ہنس کے دکھایا
جب بھی ہوئی بوسے کی کبھی مجھ کو ضرورت
بن ہی نہ سکی کوئی بھی آسان سی صورت
اب دیکھئے کب آتی ہے وہ شبھ مہورت
اس وقت تو دونوں کے دلوں میں ہے کدورت
منہ پھیر کے ہنستے ہیں مجھے دیکھنے والے
اللہ مجھے اور خجالت سے بچا لے
زائل میں کروں کس طرح چہرے سے یتیمی
مجھ کو بھی کوئی راہ دکھا رب کریمی
منہ دھونے کی حاجت میں جو بتیسی نکالی
کوّے نے اسی وقت جھپٹ کر وہ اٹھا لی
اب کھانے کی ہر چیز کو پیتا ہوں مزے سے
آرام کے دن آ گیا جیتا ہوں مزے سے
مسرور ہوں مسرور ہی رہتا ہوں ہمیشہ
بتیسی سے اب دور ہی رہتا ہوں ہمیشہ

دانت اور بڑھاپا

یہ دردنداں جو چوکیدار ہیں جھڑ جائیں گے
پوپلے منہ کا یہ دروازہ کھلا رہ جائے گا

عنایت علی خان

بجا خدا سے شکایت یہ بیویوں کی ہے
کبھی ضعیف نہ ہو وہ جواں نہیں ملتا
کسی کی آنت نہیں ہے کسی کے دانت نہیں
یہاں کسی کو مکمل میاں نہیں ملتا

انور علوی میرٹھی

رخصت میرے اصلی دانتو
اصلی وصلی نسلی دانتو

اے میری سابق بتیسی
ساٹھ برس تک چکی پیسی
کلیجے تکے آلو چھولے
گنے گنڈے سخت اور پولے
موٹھ مرنڈے مرغی دانے
لڈو پیڑے مٹر مکھانے
پان پروسے چاٹ کھلائی
ہر موسم کی چوگ چگائی
روٹی بوٹی مرغ پلاؤ
سر بکرے کا دیچہ گاؤ
رسے کاٹے ڈنٹھل توڑے
دانت درانتی دانت ہتھوڑے
لوہا پتھر سخت نوالہ
کٹ کٹ کترا منہ میں ڈالا
قصر شکم کی ڈیوٹی کرنا
خالی کرنا اور پھر بھرنا
بند دراڑیں تیز کٹاری
منہ پھاٹک کی چوکیداری
دائیں بائیں ہلنے والی
دو اک داڑھیں تھیں ہڑتالی
ظاہر سالم باطن خالی
جیسے جادو گر کی تھالی
وائے غفلت اف نادانی
کارگروں کی قدر نہ جانی
اٹھے بیٹھے جاگے سوئے
داڑھ نہ مانجھی دانت نہ ہوئے
دانتوں سے تھی شوبھا بھاری
بجھ گئی چہرے کی پھلواری
لوگ کرے ہیں کانا پھوسی
دیکھو آم کی گٹھلی چوسی

شکل ہوئی جاپانی اپنی
ہنسی لگے کھسیانی اپنی
کڑیاں کیا پختہ ٹنیاریں
ہاہا ہاہا کہہ کہہ پکاریں
بول ہوئے بے تال ہمارے
کون اب بیٹھے ''کول'' ہمارے
''چ'' بولو تو چوک بہت ہو
''تھ'' میں ''تھا'' کم تھوک بہت ہو
''ب'' میں کوئی بندوق چلے ہے
''ک'' میں لمبی ہوک چلے ہے
مسند شعر پہ آ تو براجے
دانت بنا اب تانت نہ باجے
گیا ترنم کا وہ افسوں
شعر پڑھوں تو شوں شوں شوں شوں
پیاس لگی تو شاعر بولا
کو کو ،کو کو، کو کا کولا
ہم یہ بولے چائے بیگم
بیگم بولی ہائے بیگم
ہم نے کہا رومال اٹھاؤ
بیگم بولی دال پکاؤ
کچھ اعضا منہ زور بہت تھے
جسم کے اندر چور بہت تھے

الوداع دندان ما ازسید ضمیر جعفری

مضمون کے اختتام پر راقم الحروف کی دانتوں سے بھرپور غزل پیش خدمت ہے:

کھانے کو ''روسٹ'' تھے تو بہت بے قرار دانت
منہ میں مگر تھے سارے نحیف و نزار دانت
تھے جب چنے نہ پاس تو سالم تھے دانت سب
جب مل گئے چنے تو بچے صرف چار دانت

سستی نہیں ہے بھائی کوئی ’’آرتھوڈانکس‘‘
تارے دکھائیں گے جو لگائیں گے تار دانت
کہنے لگے یہ دانتوں کے سرجن، ہے سچ یہ بات
ڈینٹسٹ ہیں شکاری اور ان کے شکار دانت
ایسا نہ ہو کہ شادی کے کھانے میں گر پڑیں
دولہا بوقتِ عقد نہ لے مستعار دانت
وقت طعام کوئی شرارت سے لے نہ جائے
بھائی تو دیکھ بھال کے اپنے اتار دانت
اک وہ کہ قند گھول کے پی جائیں ناز سے
اک ہم چبا کے گنے کریں اپنے خوار دانت
اے شائقانِ ساز و صدا غور سے سنو
سردی سے اب بجانے لگے ہیں ستار دانت
اس دورِ زر میں ہوتی ہے چاندی اسی کی بھائی
رشوت کے جو بھی رکھتا ہے کچھ تیز دھار دانت
ڈھونڈیں حضور پھر کوئی دانتوں کا مستری
اک دوسرے پہ ہونے لگے ہیں سوار دانت
ڈینٹسٹ آ نہ جائے کہیں ہوشیار باش
مظہر نہ اب دکھائیے یوں بار بار دانت

نوابزادے کا شکوہ

نوید ظفر کیانی

گلہ ہے تجھے میں ہوں سِکھ مار کہ
بڑے اُلٹے سیدھے ہیں میرے سخن
گلہ ہے مجھے بھی کہ اس دور میں
بناتے ہو مجھ کو محبِ وطن

نواسا ہوں خانِ بہادر کا میں
مگر مجھ کو تکریم ملتی نہیں
میں تشریف لے جاتا ہوں جب کہیں
مجھے خاص تعظیم ملتی نہیں

جو اعزاز ہے میرا آبائی حق
میں محروم اُس سے رہوں کب تلک
مراعات، میں جن کا حقدار ہوں
مجھے کیوں نہیں دی گئیں اب تک

حکومت کرے لوڈ شیڈنگ بھلے
مجھے بھی ہے ادراکِ حالِ زبوں
مگر اور ٹٹ پونجیوں کی طرح
مرے گھر کی بجلی بھی جاتی ہے کیوں

مرے دل میں ہے دردِ جمہوریت
بیاں دیتے پایا نہیں ہے مجھے؟؟
مگر قومِ بدبخت کو دیکھئے
منسٹر بنایا نہیں ہے مجھے

حکومت بھی ہے نامبارک بہت
نہیں رکھتی عرفان مطلق مرا
تجاویز دیتا ہوں ہر آئے دن
نہیں سُنتی فرمان مطلق مرا

قدم رنجا ہوتا ہوں میں جس جگہ
وہاں خیر مقدم کو کوئی نہیں
مرے نام کا کوئی نعرہ نہیں
مری ذات پر نغز گوئی نہیں

صحافت کا معیار تو دیکھئے
چھپے کتنے بیکار انٹرویو
میں دینے کو تیار رہتا ہوں پر
نہیں لیتے اخبار انٹرویو

کسی ایرے غیرے کی بخشش نہیں
میں ناحق نہیں لگتا شو مارنے
جو خانِ بہادر کا اعزاز ہے
دیا ہے یہ انگریز سرکار نے

یہ لکھ لو کہ جو کہہ رہا ہوں تمھیں
ہر اک بات یاد آئے گی ایک دن
رہی ناسپاسی کی جو مرتکب
مری قوم پچھتائے گی ایک دن

عتیق الرحمٰن صفی

ہو آڑی کہ ترچھی کہ ہموار ٹوپی
نہیں کوئی دنیا میں بیکار ٹوپی

میں جب جب ملا ہوں اُسے ڈیٹ پر تو
وہ پہنا گئی مجھ کو ہر بار ٹوپی

بھروسہ کسی پر میں کیسے کروں اب
لیے پھر رہے ہیں سبھی یار ٹوپی

ہو پولیس افواج رینجر کا شعبہ
سبھی کو ہے پہناتی سرکار ٹوپی

محبت سے گر اُن کو پہناؤ گے تم
بصد شوق پہنیں گے دلدار ٹوپی

جونہی دھوپ میں ٹنڈ چمکی کسی کی
میں سمجھا ہے سر پر چمکدار ٹوپی

کسی نام سے بھی اسے تم پکارو
ہے پی کیپ یا ہیٹ، دستار ٹوپی

وہی اُس کو اک روز ملتی ہے آخر
ہو جس جس کو جیسی بھی درکار ٹوپی

کہاں تک میں اس کی حقیقت بتاؤں
سمجھتے ہیں سارے سمجھدار ٹوپی

وہ فوراً ہی سر سے اُڑا لے گا اُس کو
نہ پہنو کسی کی خبردار ٹوپی

اسے لاج رکھنا بھی آتی ہے یارو
جہاں میں ہے سب کی مددگار ٹوپی

رضوان ساحرؔ

وہ لڑکی

عجب لڑکی تھی جو رہتی تھی بس میرے خیالوں میں
وہ اکثر ضرب کرتی تھی پلس کے بھی سوالوں میں

جماعت میں وہ پنسل ہی تلاشا کرتی تھی ہر دم
ہمیشہ بھول جاتی تھی لگا کر اُس کو بالوں میں

وہ پڑھتی رہتی تھی ہردم کتابی کیڑے کی صورت
کھڑی ہوتی تھی لیکن پھر بھی رُولر کھانے والوں میں

کریش چھوٹوں پہ رہتی تھی، بڑوں کی کرتی تھی عزت
نہ میں بچوں میں آ پایا نہ وڈی عمر والوں میں

جو پوچھا عشق کی بابت تو وہ کہنے لگی مجھ سے
نہیں ہے "انٹرسٹ" ہرگز مجھے ایسے سوالوں میں

اگر ساحرؔ نہ پڑھ پایا ہے چہرے حُسن والوں کے
تو پھر کیا سیکھا تو نے یونیورسٹی اِتنے سالوں میں

سریا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہیں در میں سریا، کہیں گھر میں سریا
بھرا اب تو گاؤں کے منظر میں سریا

نہ ہریالے کھیت اور نہ سرسبز جنگل
ملوں سے ہے پھیلا جہاں بھر میں سریا

کہیں بھاری بھرکم پلر میٹرو بس کے
زمیں کے بھرا جسمِ لاغر میں سریا

ہیں ہر سو یہاں کلبلاتے پلازے
ہے مسجد میں محراب و منبر میں سریا

ترقی کی سیڑھی میں ہے کنکریٹ اب
نہیں پر تعلق کے پیکر میں سریا

اگر کاروبار اُن کا ہے تو بھلے ہو
مگر ہو نہ اک ماشہ رہبر میں سریا

الیکشن سے پہلے جو گردن میں تھا وہ
نکالا الیکشن نے پل بھر میں سریا

ہوئی گم کہیں سوندھی خوشبو زمیں کی
بھرا جب سے اس بطنِ مادر میں سریا

کہا رو کے عاشق نے سر کیسے پھوڑوں
قسم تیرے سر کی نہیں سر میں سریا

وہی کیمیائی عناصر ہیں لیکن
ہے عاشق میں کیوں موم، شوہر میں سریا

ہوا نرم دل ڈاکٹری شاعری سے
کہاں سے بھلا آئے مظہر میں سریا

آم

شاہ ظفر کو عشق ہے غالب کو پیار ہے
آموں کے ذائقے پہ زمانہ نثار ہے

کھٹا بھی پر وقار ہے میٹھا بھی شاندار
ہر آم میں بسی ہوئی خوشبوئے یار ہے

چھوٹے سے آم میں بھی ہے جنت کا ذائقہ
تربوز موٹی توند لئے شرمسار ہے

سارے پھلوں کا بادشا یونہی نہیں ہے آم
معصومیت بھی اس کی وجہ افتخار ہے

دلی میں ایک پیڑ نہیں آم کا مگر
دلی تمام آموں سے باغ و بہار ہے

معشوق اپنا صرف دسہری ہی نہیں ہے
لنگڑے کے عاشقوں کی بھی لمبی قطار ہے

دیسی کی نسل ہو یا وہ قلمی کی نسل ہو
ہر آم کا شجرۂ نسب شاندار ہے

گٹھلی کو چوسنا بھی ہے ہونٹوں کو چوسنا
چاقو سے کھانا آم طبیعت پہ بار ہے

آموں کو کھا کے ہوتی ہے غالب سی شاعری
کھائے نہ آم اس کا گدھوں میں شمار ہے

احمد علوی

احمد علوی

بیت کدے

ہو گیا ہے ملک میں نافذ نیا قانون اب
کر نہیں سکتا کوئی بھی جانور کا خون اب

ہو گیا ہے خواب بریانی نہاری قورمہ
کھایئے اروی کے پتوں کا ملائی کوفتہ

کرنی ہے اب زندگی بھر دال روٹی پر گذر
اب تو کھانے ہی پڑیں گے آلو بینگن اور مٹر

لکھنؤ میں ہو گئے ہیں بند ٹنڈے کے کباب
پیاز آلو کے پکوڑے کھاتے ہیں عزت مآب

کھاٹ کے پایوں کو کیسے کھائیں گے عالی مقام
کھا کے پائے بھینس کے کہتے تھے پائے کا کلام

ختم ہو جائے بڑھاپے میں اگر گھٹنوں کی رال
دیکھ پاؤ گے نہیں اب آپ پاییوں کا کمال

ہو گئیں پیلی اگر آنکھیں کبھی یرقان سے
لیکے آئیں گے کلیجی لوگ پاکستان سے

کس طرح قائم رہے گا ساٹھ برسوں تک شباب
خواب میں بھی کھا نہ پاؤ گے کبھی شامی کباب

گوشت کے بن ہو گئی ہیں ڈش ہماری سب یتیم
چاہے آلو گوشت ہو وہ چاہے اسٹو یا حلیم

انتڑیوں کے بل نہیں پائیں گے جب دھاگے جناب
کس طرح ٹانکے لگیں گے آپریشن کے جناب

تو تلے ہکلے ملیں گے اب سبھی شعلہ بیان
کھا نہ پائیں گے زبانیں اب کبھی اہل زبان

مار ڈالے گا یقیناً گوشت نہ ملنے کا غم
انشاء اللہ مولوی کی توند ہوجائے گی کم

پٹ ملے گی آپ کو اور اب نہ سینے کی کڑی
کھا کے پالک اور بھنڈی کیسے مارو گے تڑی

کھاؤ آلو کے سموسے اور چٹنی ساتھ میں
کیسے قیمے کی کچوری کھاؤ گے برسات میں

گوشت کھانے کی خطا میں ہتھکڑی لگ جائیں گی
بیویاں شوہر کا بھیجا کس طرح اب کھائیں گی

اب یہی بہتر ہے کر لیں اکتفا کدو پہ آپ
دیکھنے سے گوشت کی فوٹو بھی لگ سکتا ہے پاپ

گوشت کے اس بین نے پھیلائے ایسے راستے
بن گئے دلی کے سب نعمت کدے بیت کدے

برسات آرہی ہے

اقبال شانہ

کچھ قرض یار لینا، برسات آ رہی ہے
چھتری سدھار لینا، برسات آ رہی ہے

خوش آمدید کہنا بارانِ سالِ نو کو
پھولوں کے ہار لینا، برسات آرہی ہے

برسات کی پھواریں گھر میں چلی نہ آئیں
چھپّر سدھار لینا، برسات آ رہی ہے

کیچڑ میں پھنس نہ جائیں جاناں یہ پائے نازک
جوتی اُتار لینا، برسات آ رہی ہے

بارش میں بھیگنے کا کچھ اور ہی مزا ہے
ٹھنڈی پھوار لینا، برسات آ رہی ہے

پانی میں بھیگ کر تم لگتی ہو بھیگی بلّی
چھتری ادھار لینا، برسات آ رہی ہے

ڈھل جائے گا یقیناً پانی میں منہ تمہارا
میک اَپ اتار لینا، برسات آ رہی ہے

ہر سال چھت ٹپک کر پیغام دے گئی ہے
شانہؔ گزار لینا، برسات آ رہی ہے

نظر آتے ہیں ہم ہی گھر سے مل کر جب نکلتے ہیں
اُدھر بیگم اِدھر ہم، کیا کریں بچے پھدکتے ہیں

چھڑانا جان مشکل ہے مجھے بچوں کی پلٹن سے
چمٹ جاتے ہیں مجھ سے جب تو مشکل سے وہ ٹلتے ہیں

تماشہ دیکھتی ہے اہلیہ خوش ہو کے بچوں کا
وہ چوہا بن کے میری پیاری غزلیں جب کترتے ہیں

وہ مجھ پر چھوڑ کر بچے چلی جاتی ہے شاپنگ کو
ذرا سوچو فقط فیڈر سے بچے کب بہلتے ہیں

بڑا ہے شوق بچوں کو سلائیڈ پہ پھسلنے کا
میں جب بھی لیٹ جاؤں توند پر میری پھسلتے ہیں

بچوں میں کس طرح بچوں سے، جو روبوٹ لگتے ہیں
اشارے پر یہ بیگم کے مری جیبیں پلٹتے ہیں

جو سادہ لوح ہیں وہ جال میں شادی کے پھنستے ہیں
خرد والے ہمیشہ نام سے شادی کے ڈرتے ہیں

عتیق الرحمٰن

"دوست فہرست" پاک کرتی ہے
مفت خورے ہلاک کرتی ہے

ڈیڈی کی عمر کے لفنگوں سے
فیس بُک پر وہ ٹاک کرتی ہے

خوب اپلوڈ سیلفیاں بھی کرے
زیبِ تن جب فراک کرتی ہے

چند اسکرین شارٹ لے کر وہ
بڈھے کا پردہ چاک کرتی ہے

نت نئے عاشقوں کو کثرت سے
فیس بک پر "سٹاک" کرتی ہے

دو بجے رات سونے سے پہلے
فیس بُک کو وہ لاک کرتی ہے

صبح اُٹھتے سے نزاکت سے
"وال" پر خوب واک کرتی ہے

ہر نئے دوست کا وہ "بے بی ڈول"
"ویل کم" پُر تپاک کرتی ہے

وہ حسینہ جلال میں آ کر
"آن لائن" ہلاک کرتی ہے

اصل میں نام اس کا عابدؔ ہے
عابدہ بن کے ٹاک کرتی ہے

عابد محمود عابد

چوری

میں جب بھی
تمھاری آنکھوں کے نیلگوں لینزوں والی جھیل میں
محبت کا نعرہ مستانہ لگا کر غوطہ زن ہوتا ہوں
تو عین اسی لمحے
ایک وڈیو کلپ
میرے تخیل کی سکرین پر آن ہو جاتی ہے
میں چشم تصور سے دیکھتا ہوں
کہ کتنی صفائی سے
اِن قیمتی لینزوں کو
تم نے دکان سے اس وقت چرایا تھا
جب
دکاندار نماز ادا کر رہا تھا

ڈاکٹر عزیز فیصل

شاعرہ کا شوہر

ہے شاعرہ میری بیگم نئے زمانے کی
میں کوئی چیز ہوں گویا کباڑ خانے کی

اسے یہ مان کہ شہرت ہے، نام ہے میرا
سنبھالنا پڑیں بچے تو کام ہے میرا

یہ کیسا فرض ہے جو وہ نبھائے جاتی ہے
کہ منھی جان مُسلسل رُلائے جاتی ہے

ذرا خیال نہیں طفلِ شیر خوار کا بھی
لگائیے ذرا اندازہ ماں کے پیار کا بھی

گھڑی فضول نہ جائے غزل کی آمد ہے
زبان بھول نہ جائے غزل کی آمد ہے

لکھے جو ہاتھ میں آئے بہ وقتِ شعر و ہنر
وہ ردی ہو کہ سرہانہ یا پھر ٹشو پیپر

عذابِ جان ہے آمد بھی اس فسانے میں
لگا دی دیر ہے اِتنی جو غسل خانے میں

مشاعرے میں اُنہیں صبح صبح جانا ہے
لو آج شام بھی کھانا مجھے پکانا ہے

جو کام اس کے ہیں، میں کر رہا ہوں سب کے سب
کہ شاعرہ نہ ہو بیوی کسی کی بھی یارب

کاشف ظریف

مری زندگی!

روبینہ شاہین بینا

کسی حادثے نے یوں مضمحل تھا کیا ہوا
مری زندگی میں عجیب بے سمتی بھر گیا
اے متاعِ جاں
یہ نہ پوچھ تو!
ہوئے کس طرح سے بسر مرے
ترے بن پہاڑ سے روز و شب
نہ تھا دن کو چین، نہ رات کو
میں ترس گئی تری بات کو
کوئی غمگسار نہیں رہا
کوئی ایسا پل نہیں گزرا تھا کہ مجھے بخار نہیں رہا
مرا غم تھا سب پہ عیاں مگر
نہ مجھے ملا کوئی چارہ گر
یونہی ایک دن
میں بنی پڑی تھی مزارِ غم
کہ اِک پارسل ملا بھانجے کا
بڑے پیار سے اس نے بھیجا تھا
اسے میں نے کھول کے دیکھا تو
نہ خوشی کی کوئی رہی اِنتہا
میرے ہاتھ میں تھا سجا ہوا
وہی پہلے ورژن کا ''آئی فون''
میرے بھانجے نے مجھے بھیج کر
کیا اپنی چاہت کا حق ادا
اُسے آن کر کے شتابی سے
دیے جوڑ پھر وہی سلسلے
جو تھے جانے کب سے رکے ہوئے
ہوئیں ختم یوں سبھی مشکلیں
وہی ایک فائل
مرے پیار کی
اے مرے موبائل
میری زندگی!

کالم گلوچ

چھٹتی نہیں ہے---

اِس معاشرے میں لوگ جس ذوق وشوق سے تمباکو نوشی کرتے ہیں انسداد تمباکو نوشی کیلئے قائم سرکاری ادارے اس زور وشور سے اپنا کام نہیں کرتے شاید ان اداروں نے محکمہ فیملی پلاننگ کا سٹاف ڈیپوٹیشن پر تعینات کر رکھا ہے، سرکاری اور نجی ادارے سارا سال بھنگ پی کر سوئے رہتے ہیں اور صرف انسداد تمباکو نوشی کے عالمی دن پر سیمینار اور واکس کروا کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا سرکاری فریضہ پورا کر دیا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ اس روز سرکاری اور پرائیویٹ ہسپتالوں میں فری میڈیکل کیمپ لگا کر مریضوں کو سینے کے ایکسرے، منہ، گلے وپھیپھڑوں کے ٹیسٹ اور بلڈ پریشر چیک اپ کی سہولت کے ساتھ مفت ادویات فراہم کر دیتے ہیں۔ مشاہدے کے مطابق انسانی جسم کو تمباکو شراب سے بھی زیادہ نقصان پہنچاتا ہے، منہ، گلے اور پھیپھڑوں کا سرطان، دل کے دورے اور فالج کے حملے کی سب سے بڑی وجوہات تمباکو نوشی ہیں، شاعر نے تو یہ مصرع غالباً شراب کے بارے میں کہا تھا لیکن یہ سگریٹ پر بھی صادق آتا ہے---

چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی

شراب نوشی پر تو برسوں سے پابندی عائد ہے، لوگ چھپ چھپا کر پیتے ہیں اور پی کر دوسروں کے سامنے نہیں آتے لیکن سگریٹ پینے والے تو سرعام ڈنکے کی چوٹ پر سگریٹ کے سوٹے لگاتے ہیں اور دخانی انجن بنے ہر جگہ بلکہ جگہ جگہ دندناتے نظر آتے ہیں صرف ہسپتال ان سے محفوظ دکھائی دیتے ہیں، شراب تو زیادہ تر پختہ عمر کے لوگ پیتے ہیں اور وہ نشہ اترنے کے بعد اس فعل پر شرمندگی بھی محسوس کرتے ہیں مگر سگریٹ بوڑھے، معمر، جوان اور نوجوان لڑکے سبھی پیتے ہیں اور اس پر بڑی ڈھٹائی سے فخر کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، شراب کے مقابلے میں سگریٹ زیادہ استعمال کی جاتی ہے جس کا اندازہ اس رپورٹ سے بخوبی ہو جاتا

شراب نوشی پر تو برسوں سے پابندی عائد ہے ،لوگ چھپ چھپا کر پیتے ہیں اور پی کر دوسروں کے سامنے نہیں آتے لیکن سگریٹ پینے والے تو سرعام ڈنکے کی چوٹ پر سگریٹ کے سوٹے لگاتے ہیں اور دخانی انجن بنے ہر جگہ بلکہ جگہ جگہ دندناتے نظر آتے ہیں۔

ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایف بی آر نے مالی سال کے دوران سگریٹ وتمباکو پر فیڈرل ایکسائز ڈیوٹی کی مد میں ۸۲ ارب ۹۵ کروڑ، ۹۰ لاکھ روپے وصول کئے ہیں۔

تمباکو نوشی کی وبا نوجوانوں میں بہت زیادہ عام ہو چکی ہے اور اس میں ان پڑھ یا پڑھے لکھے کی تخصیص نہیں رہی، سکول کے بچے تو عموماً اس لعنت سے محفوظ رہتے ہیں لیکن کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر یہ طالب علم شوقیہ تمباکو نوشی شروع کر دیتے ہیں یا عشق کے روگ میں مبتلا ہو کر سگریٹ کے دھوئیں میں غرق ہو جاتے ہیں، انسداد تمباکو نوشی کے اداروں کو تعلیمی اداروں میں جا کر طلباء کو

آگاہی دینی چاہیے ،انسداد منشیات کے کنسلٹنٹ سید ذوالفقار حسین یہ کام کرتے رہتے ہیں تاہم ان کا ٹارگٹ صرف زنانہ تعلیمی ادارے ہوتے ہیں حالانکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طالبات بہت کم سگریٹ پیتی ہیں اور جولڑکیاں تمباکونوشی کرتی ہیں وہ بھی محض فیشن کے طور پر کبھی کبھار سگریٹ کے کش لگاتی ہیں۔

امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹرز کی تنظیم ’’اپنا‘‘ نے کچھ عرصہ قبل تمباکونوشی کے خلاف تعلیمی اداروں میں انسدادی سرگرمیاں شروع کرنے کا اعلان کیا تھا اوراس سلسلے میں دانش سکولز اور کیئرز سکولز کا انتخاب کیا تھا ہمیں یاد ہے ’’اپنا‘‘ کے ڈاکٹر مقبول ارشد نے پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کے دوران کہا تھا کہ دانش اور کیئرز سکولز میں تعلیمی سرگرمی شروع کرنے سے باقی سکولز کی بھی حوصلہ افزائی ہوگی کہ وہ صحت کی تعلیم کو اپنے نصاب کا لازمی حصہ بنائیں گے اس کے بعد ’’اپنا‘‘ کے ڈاکٹر مقبول ارشد نے اپنی سرگرمیوں بارے پیشرفت کے حوالے سے غالباً کبھی دوبارہ پریس کانفرنس نہیں کی تھی اور نہ اس حوالے سے ’’اپنا‘‘ کی جانب سے جاری کردہ کوئی پریس ریلیز ہماری نظر سے گزری تھی۔

پریس کانفرنس سے یاد آیا ہمارے پریس کلب میں صرف دو گوشے تمباکونوشوں سے محفوظ ہیں ان میں کیفے ٹیریا اور رپورٹنگ روم شامل ہیں ،کلب کی لائبریری کی فضا میں بھی تمباکو کا دھواں پھیلا رہتا ہے ،ہم تو پھر بھی سانس اکھڑنے پر وہاں سے اٹھ کر باہر آ جاتے ہیں مگر سگریٹ کے دھوئیں سے الماریوں میں سجی ہوئی بیچاری کتابوں کا دم گھٹتا رہتا ہوگا ، پریس کلب کے انٹرنیٹ روم میں تو اس قدر زیادہ سگریٹ نوشی ہوتی ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری اور ایم اے او کالج کے استاد اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر امجد طفیل اگر وہاں بیٹھنے والے صحافیوں کو دیکھ لیں تو حیران پریشان ہوجائیں ،کلب انٹرنیٹ روم میں رات کے وقت مستقل ڈیرہ جمانے والے چند سینئر تمباکونوش صحافی آج کل خود جونیئرز تمباکونوشوں کے ہاتھوں تنگ رہتے ہیں جو ان سے مانگ مانگ کر اُن کے سگریٹ ختم کر دیتے ہیں اور رات کے آخری پہر پریس کلب کے قرب وجوار میں کوئی دکان بھی کھلی نہیں ہوتی اب غالباً ان سینئر تمباکونوش صحافیوں کی بددعاؤں کے باعث ہی سگریٹ مانگنے والے ایک عادی تمباکونوش صحافی سے انہیں نجات مل گئی ہے۔

پریس کانفرنس سے یاد آیا ہمارے پریس کلب میں صرف دو گوشے تمباکونوشوں سے محفوظ ہیں ان میں کیفے ٹیریا اور رپورٹنگ روم شامل ہیں ،کلب کی لائبریری کی فضا میں بھی تمباکو کا دھواں پھیلا رہتا ہے، ہم تو پھر بھی سانس اکھڑنے پر وہاں سے اٹھ کر باہر آ جاتے ہیں مگر سگریٹ کے دھوئیں سے الماریوں میں سجی ہوئی بیچاری کتابوں کا دم گھٹتا رہتا ہوگا۔

لاہور پریس کلب کے بہت سے ممبرز صحافی سگریٹ نوش نہیں بلکہ صحافیوں کی زیادہ تر تعداد تمباکونوشی نہیں کرتی صرف اقلیت نے اکثریت کا ناطقہ بند کر رکھا ہوتا ہے ،سینئر پریس فوٹوگرافر نفیس احمد قادری بھی ہماری طرح تمباکونوشی کے سخت خلاف ہیں ایک بار یہ کسی دوست کے ساتھ تقریب کی کوریج کیلئے جا رہے تھے ان کے دوست راستے میں موٹر سائیکل روک کر سگریٹ خریدنے لگا تو نفیس قادری نے اس سے نوٹ اور ماچس کی ڈبیا لے کر دیا سلائی جلائی اور نوٹ کو آگ دکھادی ان کا دوست زور سے چیخا کہ یہ کیا کر دیا؟ نفیس احمد قادری نے اطمینان سے جواب دیا کہ تم نے بھی تو یہی کام کرنا تھا، میں نے اپنی اور تمہاری صحت کو نقصان پہنچنے سے بھی بچالیا ہے! نفیس احمد قادری کا کہنا ہے کہ سگریٹ پینے پر صحافی ماہانہ ہزاروں روپے پھونک ڈالتے ہیں لیکن اگر کوئی دوست انہیں چائے پلانے کیلئے کہہ دے تو بہانہ کر دیں گے کہ جیب خالی ہے یہ لوگ اگر دس روز سگریٹ نہ پئیں اور بچت کی اس رقم سے کسی کی مدد کر دیں تو کتنا اچھا ہو!‘‘

کالم گلوچ

ضربِ قلم اور مضروب ادیب و دانشور

میٹھی مرچیں
نسیم سحر
naseemesehar@gmail.com

اکادمی ادبیات کی چار روزہ عالمی ادبی کانفرنس ختم ہو چکی، اس کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں بہت سے کالم لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ ہمیں اگر منتظمین سے کچھ شکایات ہیں بھی تو اِن کالموں میں نہیں لکھیں گے، جب کبھی جناب قاسم بھگیو صاحب سے ملاقات ہوئی، براہِ راست عرض کریں گے۔ یہاں افتتاحی اجلاس میں ادیبوں کو ''ضربِ قلم'' آپریشن کا جو مفید اور قومی حوالے سے نہایت اہم مشورہ دیا گیا تھا اس کا ذکر البتہ ضرور کریں گے کہ واقعی اب جب جنرل راحیل شریف کی ریٹائرمنٹ کے بعد ''ضربِ عضب'' کے غلغلے کو کسی حد تک کم کیا جا رہا ہے، ضربِ قلم کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں ہمارے ادیب، کالم نگار اور دانشور ضربِ قلم کا آغاز کب اور کس طریقے سے کرتے ہیں جس سے دہشت گردی، سیکیورٹی اور ہمارے دیگر مسائل کی شدت کا اگر مکمل سدِ باب نہیں بھی ہوتا تو کم از کم اس کی شِدّت میں تو کچھ کمی آئے۔

> جب جنرل راحیل شریف کی ریٹائرمنٹ کے بعد ''ضربِ عضب'' کے غلغلے کو کسی حد تک کم کیا جا رہا ہے، ضربِ قلم کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ دیکھتے ہیں ہمارے ادیب، کالم نگار اور دانشور ضربِ قلم کا آغاز کب اور کس طریقے سے کرتے ہیں جس سے دہشت گردی، سیکیورٹی اور ہمارے دیگر مسائل کی شدت کا اگر مکمل سدِ باب نہیں بھی ہوتا تو کم از کم اس کی شِدّت میں تو کچھ کمی آئے۔

مگر آج ہمارا اصل موضوع وہ ضربِ قلم ہے جو خود ادیب اور صحافی ہی لگاتے ہیں اور جس کا ''ہدف'' بھی ادیب اور صحافی ہی بنتے ہیں۔ کچھ ادبی اور صحافتی جرائد میں گاہے گاہے مختلف ادیبوں کی باہمی چشمک کے بڑے ''لذیذ'' نمونے نظر سے گزرتے ہیں جنہیں ''قندِ مکرّر'' کے طور پر بیان کرنے کا مقصد ''مضروب'' ادیبوں سے اُن الزامات (سچے یا جھوٹے) پر اُن کا ردِ عمل معلوم کرنا ہے۔ یاد رہے کہ انہیں دُہرانے کا مقصد کالم کا پیٹ بھرنا نہیں کہ اس کام کے لئے تو بیشمار موضوعات نوکِ قلم پر رہتے ہیں۔ آج اس ضربِ قلم کی زد میں مختلف ادبی کانفرنسوں پر ایک جریدے کے مدیر

کے مضمون کے کچھ اقتباسات آئیں گے، دیگر موضوعات اسی سلسلے کے آئندہ کالموں میں لائے جائیں گے۔

مذکورہ مدیر لاہور کے لٹریری فیسٹیول کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں انگریزی طلبہ وطالبات اور ایلیٹ کلاس نے ادب کے نام پر اپنا رانجھا راضی کیا۔ (اب یہ معلوم نہیں کہ ہیر بھی راضی ہوئی کہ نہیں!)۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ۲۰۱۶ء میں اسلام آباد میں ہونے والے کتاب میلہ پر ان کا تبصرہ ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی احباب اور خاص طور پر صحافی اہلِ قلم کو دعوت دی تاکہ ان کے حق میں پرنٹ میڈیا آواز اٹھاتا رہے۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کی دسمبر ۲۰۱۶ء میں ہونے والی نویں عالمی اردو کانفرنس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس بار یہ کانفرنس نئے سال کی انتخابی مہم کا حصہ تھی، اور اس میں پنجاب سے انہی چند لکھاریوں کو مدعو کیا گیا جو تقریباً ہر کانفرنس کا حصہ ہوتے ہیں۔ آرٹس کونسل کے صدر احمد شاہ اور ان کے قریبی احباب اس کانفرنس کے مالی ثمرات سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے بلکہ اگلے برس کے لئے بھی کامران ٹھہرے۔ یہاں کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک ادیب اور کالم نگار جناب خرم سہیل کا مضمون بھی قابلِ ذکر ہے جس کا عنوان ''نویں عالمی اردو کانفرنس اور اکبر بادشاہ کے نورتن'' ہے جو

آج ہمارا اصل موضوع وہ ضربِ قلم ہے جو خود ادیب اور صحافی ہی لگاتے ہیں اور جس کا ''ہدف'' بھی ادیب اور صحافی ہی بنتے ہیں۔ کچھ ادبی اور صحافتی جرائد میں گاہے گاہے مختلف ادیبوں کی باہمی چشمک کے بڑے ''لذیذ'' نمونے نظر سے گزرتے ہیں جنہیں ''قندِ مکرّر'' کے طور پر بیان کرنے کا مقصد ''مضروب'' ادیبوں سے اُن الزامات (سچے یا جھوٹے) پر اُن کا ردِ عمل معلوم کرنا ہے۔

تمام کا تمام جناب احمد شاہ اور ان کے ''نورتنوں'' کے بارے میں ہے، مگر یہ مضمون ایک الگ کالم کا متقاضی ہے، چنانچہ ہم واپس ''بجنگ آمد'' کے مدیر جناب الف شین یعنی اختر شمار کے مضمون کی طرف آتے ہیں جس میں انہوں نے ڈاکٹر تحسین فراقی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سالِ گذشتہ میں سب سے زیادہ ادبی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی کانفرنسوں میں مدعو کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو آزمایا اور کامیاب رہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دنوں لاہور میں ادبی دنیا کے کئی چھوٹے چھوٹے تحسین فراقی بیگ اٹھائے ایک کال کے فاصلے پر قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے لئے دستیاب ہیں۔

ان کانفرنسوں کے حوالے سے مدیرِ مذکور نے اسلام آباد میں مقیم سینیئر ترین ادیبہ اور شاعرہ محترمہ کشور ناہید کی کالم نگاری پر بھی یوں تبصرہ کیا ہے: ''جنگ میں کشور ناہید کا کالم کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے وگرنہ زیادہ تر اگرچہ وہ ادبی لکھتی ہیں مگر صرف ادبی کانفرنسوں کے حوالے سے، تاکہ آنا جانا لگا رہے،۔ اب تو وہ ہر کانفرنس میں تواتر سے موجود ہوتی ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔''

صاحبو، میرا خیال ہے کہ آج کے لئے اتنی ہی ''ضربِ قلم'' کافی ہے ورنہ یہ خطرہ بھی ہے کہ جن ادیبوں کو ''ضربِ قلم'' کے ذریعے ''مضروب'' کیا گیا ہے ان کے علاوہ کہیں اس کالم کو پڑھنے والے بھی اپنے آپ کو مضروب نہ سمجھنے لگیں!

ڈاکٹر تحسین فراقی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سالِ گذشتہ میں سب سے زیادہ ادبی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے اپنے ساتھ اپنے شاگردوں کو بھی کانفرنسوں میں مدعو کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو آزمایا اور کامیاب رہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دنوں لاہور میں ادبی دنیا کے کئی چھوٹے چھوٹے تحسین فراقی بیگ اٹھائے ایک کال کے فاصلے پر قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے لئے دستیاب ہیں۔

سیّد بدر سعید

گلِ نوخیز اختر کے بارے میں ایک عرصہ تک ہمارا خیال تھا کہ یہ لڑکی ہے بعد میں معلوم ہوا ''ٹھرکی'' ہے۔ ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب کا گل نوخیز کے بارے میں کہنا ہے ''نام لڑکیوں جیسا، کام ''ٹھرکیوں'' جیسا۔'' لڑکیوں کے بارے میں نوخیز کے وہی خیالات ہیں جو مرزا غالب کے آم کے بارے میں۔

ہماری نوخیز سے پہلی ملاقات ادبی بیٹھک میں ہوئی جہاں ایک خوبصورت لڑکی بار بار قہقہے لگاتی ہوئی نوخیز کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے ٹانگ کو ہاتھ سمجھ لیا تو ہم چپکے سے وہاں سے چلے آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ نوخیز بھی بھاگ آیا تھا۔

موصوف خواتین کی بہت عزت کرتے ہیں ایک دن کہنے لگے اگر کوئی خاتون صرف دو پیگ کے بعد ''پینا'' بند کردے تو سمجھ جاؤ کہ وہ شریف ہے بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ جو مرد چار پیگ کے بعد کہے دنیا بہت حسین ہے تو سمجھ جائیں وہ شوہر ہے۔

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ نوخیز مرد کی زبان ہے۔ بچپن میں بہت شرارتی تھا، جوانی بھی ایسے ہی گزار دی اور اب جب کہ بڑھاپے کی شاہراہ پر گامزن ہے تو بھی پہلے جیسا ہے۔

جب اسے نیا نیا یہ احساس ہوا کہ یہ جوان ہوگیا ہے تو اس نے ایک لڑکی کو ''لو لیٹر'' دیا، وہ پڑھ کے شرمائی اور کہنے لگی ''آپ بہت شرارتی ہیں'' دو ماہ بعد جب اس کی شادی کا کارڈ ملا تو نوخیز نے کہا ''تم بھی بہت شرارتی نکلیں۔۔۔''

اس کی شرارتوں کا اکثر دوستوں میں چرچا رہتا ہے۔ نوخیز کی شرارتوں کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اس کی ایک کتاب بھی ''شرارتی'' ہے۔

گل نوخیز اختر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت محنت کی تب کہیں جا کر اسے یہ مقام ملا، شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے گرد بیٹھی حسیناؤں کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ اس نے بہت محنت کی ہوگی۔

اس کی شکل وصورت ایسی ہے کہ پشاور جانے سے احتیاط کرتا ہے۔شاید ڈرتا ہے کہ وہاں راستہ بھول گیا یا اغوا ہو گیا تو بعد میں شاید گھر والوں کو پہچاننے میں مشکل ہو۔

نوخیز ورسٹائل بندہ ہے یہ کوٹ پہنے تو بزنس مین لگتا ہے جبکہ پھٹی ہوئی بنیان اور ٹوٹی ہوئی چپل پہن لے تو پٹھانوں کے ہوٹل کا ''چھوٹا'' لگتا ہے، لیکن شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ نہ تو بزنس مین ہے اور نہ ہی چھوٹا، یہ ''میسنا'' ہے۔

نوخیز کی شرارتیں اور حرکتیں اپنی جگہ لیکن اس کا کبھی سکینڈل نہیں بنا۔شاہ صاحب کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ سکینڈل بھی تب بنتا ہے جب ایسی کوئی بات پہلے چھپائی جائے اور پھر بعد میں نہ چاہتے ہوئے ظاہر ہو۔

گل نوخیز اختر بہت اچھا مزاح نگار ہے، اتنا اچھا کہ شاہ صاحب کے مطابق ''اگر یہ لکھاری نہ ہوتا تو ''مراثی'' ہوتا۔'' اپنی تحریروں میں جتنا بڑا جملہ باز ہے عام زندگی میں اس سے بھی کہیں آگے ہے، اس حد تک کہ سہیل احمد بھی اس کی جملہ بازی سے تنگ ہیں۔ویسے تنگ تو وہ اپنی پرانی پتلون سے بھی ہیں۔

نوخیز نے اپنی ڈارلنگ کے ذریعے بہت کمایا، یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے ''نوخیز ڈارلنگ کی کمائی کھاتا ہے۔'' شاہ صاحب کہتے ہیں نوخیز اگر ڈارلنگ کی کمائی نہیں کھاتا تو ڈارلنگ لکھنا بند کر دیتا کیونکہ وہ اس معاملے میں بہت سخت اصولوں کا مالک ہے۔ نوخیز ایک ہفتے میں ۶ اقساط لکھتا ہے اور ساتویں دن گاڑی کی اقساط ادا کرتا ہے۔میڈیا میں اسے پرانے اور گھاگ لکھاریوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن کہلاتا پھر بھی نوخیز ہی ہے۔

نوخیز کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا ہے جو اپنے کام سے مخلص ہوتے ہیں۔یہ اپنا کام بہت توجہ سے اور دل لگا کر کرتا ہے۔کام عشق سمجھ کر کرتا ہے جبکہ عشق کام سمجھ کر کرتا ہے۔زمانہ شناس بندہ ہے اس لیے اگر کسی کو اس سے کام ہو تو سگریٹ مانگ کر پیتا ہے اگر اسے کام ہو تو منگوا کر پلاتا ہے۔پولیس والوں کی طرح اس کی بھی دوستی اور دشمنی دونوں ہی خطرناک ہیں۔اگر یہ دوستی کی آڑ میں جگتیں لگانا شروع کر دے تو انسان دشمنی پر آمادہ نظر آنے لگتا ہے لیکن یاد رہے دشمنی کے بعد اسے آپ کی ہجو کا اخلاقی جواز مل جائے گا ویسے بھی اس کے اکثر اخلاقی جواز اس کے خودساختہ ہیں جنہیں آپ کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے۔

کوئی لڑکی اس کے پاس بیٹھی ہو تو لڑکے خود بخود دور چلے جاتے ہیں کیونکہ اس وقت پاس بیٹھنے کا مطلب ہے کہ آپ اس کی دُم پر پاؤں رکھنے لگے ہیں۔دم پر پاؤں سے آپ نے جس جاندار کا سوچا ہمارا مطلب وہ ہرگز نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ زخمی شیر بن جاتا ہے۔ایک ایسا شیر جو جنگل میں ہو تو جانور اس کی جگتوں سے ہی مر جائیں۔ایسا کوئی موقع ہو یہ ۹۰ سال کے بابوں کو بھی لڑکا ہی شمار کرتا ہے اس لیے محتاط رہیے نوخیز لاعلاج ہے!

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نوخیز ایک اچھا انسان ہے۔فیلڈ میں آنے والے نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، انہیں چائے پلاتا ہے، فیلڈ اور میڈیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر بھگا دیتا ہے کہ ہر سال یونیورسٹیوں سے ہزاروں لوگ ڈائریکٹر بننے کے لیے آتے ہیں وہ سب کہاں جائیں گے؟ سومیاں! تم css کے پیپر دو اللہ ترقی دے گا۔

نوخیز نے بہت سے لوگوں کا خاکہ لکھا بلکہ خاکہ اُڑایا اور خاکہ بھی ایسا ایسا لکھا کہ وہ خود کہتا ہے کہ لوگوں نے مجھے اِتنے عدالتی سمن بھیجے کہ میرا کمرہ سمن آباد ہو گیا۔بعد میں پتا لگا کہ ان دنوں اس کا کمرہ سمن آباد ہوا تھا لیکن وہ سمن عدالتی نہیں تھی۔ہم نے اس کا خاکہ اس لیے بھی لکھ ڈالا کہ چلو سمن نام کی کسی چیز کے دیدار تو ہوں، چاہے وہ عدالتی ہی ہو ویسے ہمیں امید ہے نوخیز عدالتی سمن سے پرہیز کرے گا اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ وہ خود مزاح نگار ہے، دوسری اور اہم وجہ یہ کہ اسے علم ہے کہ اس سمن پر اسے کوئی منافع نہیں ہوگا کیونکہ ہم زیادہ سے زیادہ ہرجانے کے طور پر اپنی پھٹی بنیان ہی دے پائیں گے اور ہم سے زیادہ موٹا ہونے کی بنا پر وہ اس کے لیے بیکار ہوگی۔ویسے اگر نوخیز نے ہمیں کوئی سمن بھیج دیا تو اس کی ایک ہی وجہ ہوگی وہ یہ کہ گاڑی صاف کرنے والا کپڑا اس سے کہیں کھو گیا ہوگا!!

کے ایم خالد

ناں۔۔۔سر ادیب!

اُسے گاؤں کا بابا بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اکثر اس ڈبہ نما سنیما گھر کی ایک ہی فلم کو گندم کے دانوں کے عوض دیکھتا تھا۔اُسے سکرین پر رنگ برنگی تصویریں اور ساتھ ساتھ بابے کی کمنٹری ''دیکھو جی دیکھو داتا کی نگری دیکھو ،دیکھو جی دیکھو۔۔'' بہت بھاتی ۔ایک دن اس نے بابے سے فلم دیکھ کر انکشاف کیا ''میں بھی بڑا ہو کر فلموں کی کہانیاں لکھوں گا۔''

''پھر تمہاری فلمیں چلیں گی کہاں۔۔؟'' بابے نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

''میری فلمیں بھی بند ہوں گی رنگ برنگے ڈبے میں اسے دیکھنے والے بہت ہوں گے۔''

اُس نے اپنی پہلی کہانی استاد کی فرمائش پر ساتویں کلاس میں پوری کلاس کو سنائی تھی۔ پہلے پیریڈ میں شروع ہونے والی کہانی کا

آٹھویں پیریڈ تک انٹرول نہیں ہوا تھا۔ اس کی کہانی کے درمیان ہی استاد سمیت تقریباً تمام طلبا اپنی، اپنی حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہو آئے تھے لیکن وہ آنکھیں بند کئے ''گھوڑے پہ گھوڑے'' دوڑاتا، ظالم جاگیردار کا تعاقب کرتا رہا۔

اُس کا کہانی کا شوق اس کے ساتھ ہی جوان ہوا وہ اپنی ساتھی طالب علموں میں ایک کہانی کار کے نام سے مشہور تھا۔ کالج کے دور میں اس کی کہانیوں میں ظالم جاگیردار کے ساتھ، ساتھ ایک مُیار کا اضافہ ہو گیا تھا، جس کی خوبصورتی بیان کرنے کے لئے وہ اپنی شاعری کا بھی اضافہ کرتا، جسے سننا بڑے حوصلے کا کام تھا۔

وہ فلم انڈسٹری کے گیٹ سے اندر داخل ہو چکا تھا عشق و محبت کی پیار بھری فلمیں عروج پر تھیں سلطان راہی جیسے فنکار نستعلیق اُردو میں بات کرتے نظر آتے تھے لیکن وہ سب اس کے لئے کتھارسس کا ذریعہ نہیں تھے۔ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا تھا، وہ اس سلور سکرین پر نہیں تھا۔

اُس کی ''بشیرا'' ہٹ ہوئی تو ہر طرف اس کے نام کا توتی بولنے لگا۔ ہر فلم ساز کی ڈیمانڈ اب اس کی کہانیاں تھیں۔ وہ کہانیاں جو وہ بچپن سے اکٹھی کرتا چلا آ رہا تھا، جو اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں تھیں۔ وحشی جٹ، مولا جٹ جیسی فلموں نے اسے قتل و غارت، قانون شکنی اور جبر و تشدد کا سمبل بنا دیا۔ سینما ہال سلطان راہی کی بڑھکوں کے جواب میں سینما بین کی بڑھکوں اور پان کی پچکاریوں سے گونجتے رہے۔ اس نے بہت کہا کہ میرے پاس ''یہ آدم'' جیسی کہانیاں بھی ہیں لیکن فلم سازوں نے اس کے اندر کے فنکار کو لاٹھیوں، کلہاڑیوں، گنڈاسوں اور بندوقوں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ مولا جٹ مجموعی طور پر ۳۱۰ ہفتوں تک چلی اس کے بعد بھی یہ اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی لیکن انسانی ٹانگ کاٹنے کے ایک پر تشدد منظر پر اعتراض کے باعث چلتی ہوئی فلم کو بین کر دیا گیا۔ یہ منظر ۳۱۰ ہفتوں کے بعد فلم سنسر بورڈ کو نظر آیا کہ انسانی ٹانگ کو کاٹنا ایک پر تشدد منظر ہے۔ اس فلم میں گنڈاسے سے ہلاکت کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا، جو چائنا کی فلموں کی طرح ہوا میں بھی لہراتا ہوا بھی اپنے ٹارگٹ کو ہٹ کرتا ہے۔

بعید از کار

رگڑ کے بولے یہ مظہر چراغ کے جن سے
رہوں میں ٹھاٹ سے ایسا بنا دے مجھ کو گھر
سنی یہ بات تو تھرا کے جن یہ کہنے لگا
حضور آپ کا ہر حکم ہے سر آنکھوں پر
مگر یہ سوچئے ہوتا جو کام یہ آساں
تو کیا میں خود یونہی رہتا چراغ کے اندر

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

سلور سکرین جہاں کسی دور میں پیار کے نغمے تھے وہاں اب گولیوں کی تڑتڑاہٹ تھی۔ اگر کوئی نغمہ فلم شامل بھی کیا جاتا تو بھی ہیرو ''وچوائی'' کے عالم میں ہی ہوتا تھا کیونکہ نغمے کے فوراً بعد لڑائی کا سین شروع ہو جاتا تھا، یوں ہیرو نغمے کے دوران بھی لڑائی کی تیاری شروع ہی رکھتا۔

سلطان راہی کی بے وقت موت کے بعد فلم انڈسٹری کے فنکار اس ذمہ داری کو بہ احسن طریقے سے نہیں نبھا پائے۔ سلطان راہی جیسی بڑھک کوئی نہیں لگا پایا اور نہ ہی سلور سکرین پر چھائی ہوئی بارود کی بو کو کوئی پیار کی خوشبو میں بدل پایا ہے۔ اس نے ایک بیان میں نے کل کے نہیں آج کے فلمساز کو فلم انڈسٹری کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو رائٹر کی بجائے سپر سٹار کو زیادہ معاوضہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

وہ ایک مرتبہ پھر مختلف فورم پر فلم پڑھا رہا ہے یہ بتائے بغیر کہ دیوہیکل ''ڈائنا سارز'' کیسے ختم ہوئے۔۔؟ فلم انڈسٹری کی تباہی کا اصل ذمہ دار کون ہے۔۔؟ یہ شائد فلم سٹوڈیوز میں لگے ہوئے جالوں کی مکڑیوں کو بھی اچھی طرح پتہ ہے، ایک فلم نہیں بلکہ پوری فلم انڈسٹری ڈبے میں بند ہے، بس ایک بابے کی ضرورت ہے جو اسے کندھے پر اٹھائے ہوئے کیمرے میں دکھاتے ہوئے کمنٹری کرے ''دیکھو جی دیکھو پاکستان فلم انڈسٹری کا عروج و زوال دیکھو، دیکھو شاہ نور سٹوڈیو کی مکڑیاں کیا کہہ رہی ہیں، دیکھو، جی دیکھو۔۔۔''

فرخ ندیم

نادر خان سرگروہ

زندگی نام ہے ہنس ہنس کے مرے جانے کا

انسانی اِرتقا میں وہ لمحہ کتنا خوشگوار ہوگا جب کسی انسان نے کچھ دیکھا، محسوس کیا اور مسکرا دیا۔ ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ جب اُس نے مسکرانا چاہا ہوگا تو اُس کے چہرے کی شکل کیسی بنی ہوگی۔ اِسی طرح ہمیں چٹکی کاٹنے یا گدگدی کرنے کی تاریخ کا بھی علم نہیں۔ لیکن ایک خیال ضرور ذہن میں آتا ہے کہ انسان کو چوٹ لگی تو اُس کی آنکھوں سے نمکین سا پانی جاری ہوا جسے اُس نے آنسو، اشک یا کسی بھی نام سے پکارا ہوگا۔ اِسی طرح اُس نے کسی کو بارش میں گیلی مٹی پہ پھسلتے دیکھا یا درخت کی ٹہنیوں سے الجھتے، گرتے دیکھا تو بھی مسکرایا ہوگا۔ یا شاید کسی کے چہرے سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس کے نقوش روح کے پاتال میں اتر گئے اور جب بھی وہ صورت اُس کے سامنے آئی وہ مسکرا دیا / مسکرادی۔ لیکن یہ ضروری بھی نہیں کہ انسان سے مراد...... مَرد ہی ہو، اگرچہ اُس کا صیغہ مذکر ہی ہے۔ یوں تو لفظ مذکر کے ذہن میں آتے ہی ایک طرف تو صنفی امتیاز کی لسانی سیاست ذہن میں آتی ہے تو دوسری طرف قہقہہ بھی بلند ہوتا ہے کہ اس لفظ کا اپنی مقامی زبان میں ترجمہ کیسے کریں۔ یعنی ابتدائی انسان جسے قدیم انسان بھی لکھا سمجھا جاتا ہے نے verbal اور non-verbal دونوں طرح کے ماحول میں مسکرانا اور قہقہے لگانا سیکھا۔ پھر یہ روایت چل نکلی ہوگی۔ وہ کیسے؟ کسی ایک فرد نے دوسرے کو یہ کہانی سنائی ہوگی اور اُس کہانی میں کسی حد تک تخیل کی کارفرمائی بھی شامل ہوگی، تاکہ سننے والے کی دلچسپی برقرار رہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے دوسروں کی نقل اتاری جو باقاعدہ ایک صنف سوانگ کی شکل اختیار کرگئی، جسے یونانی ڈرامہ کے ضمن میں ممکری کہا جاتا ہے۔ اس نقل میں طنز کا پہلو بھی خارج از امکان نہیں، کیا خبر! کھسیانی ہنسی بھی اُس میں شامل ہو یا کوئی شخص اُس طنزیہ مسکراہٹ

کا شکار ہوا ہو۔ ویسے تو اشرف المخلوقات نے ماحول سے وہ کچھ بھی سیکھ لیا جو اُس کے سیکھنے کے عمل پر خود سوالیہ نشان ہے، لیکن کامیڈی کی رُو سے دیکھا جائے تو انسان نے کچھ ایسا بھی سیکھا جو یا تو بے ضرر تھا یا خوشگوار۔ خوشگواریت ایک طرز زندگی ہے جو قدیم انسان سے لے کر آج کے عہد کے انسان تک ایک خوبصورت روایت و ثقافت کی شکل میں رواں دواں ہے۔ علم بیانیات Narratology کے مطابق تو افلاطون اور ارسطو نے بیانیہ میں Telling / Diegesis اور Mimesis/Showing کی کھوج لگائی اور ممک آرٹ (Mimic Art) میں انسانی زندگی میں نشیب و فراز کا احاطہ کیا۔ جو زندگی کسی المیہ پر اختتام پذیر ہوئی اُسے ٹریجڈی کہا گیا اور جس کہانی کا انجام خوشگوار ہوا اُسے کامیڈی کہا گیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ٹیلنگ اور شوئنگ کے اِس بیانوی عمل میں انسانی زندگی کی نقل ہی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اُس میں المیہ ہی زندگی کی کلیت نہیں۔ زندگی اگر "نام ہے مر مر کے جیے جانے کا" تو زندگی نام بھی ہے ہنس ہنس کے مرے جانے کا۔ زندگی کا تو جو ہر ہی تغیر ہے اور اُس تغیر میں بلاشبہ کامک انٹرلوڈز Interludes اور کئی دوسری اقسام کے کھیل تماشے بھی شامل ہیں جو انسانوں نے سکھ کا سانس لینے کی خاطر وضع کیے ہیں۔ اِس طرح کامیڈی اُس صنف کو سمجھا جا سکتا ہے جس میں انسانی زندگی کے خوشگوار تجربات شامل کیے جاتے ہیں جو ہمارے یا مزاح نگار کے لغوی اور غیر لغوی ابلاغ کا حصہ ہوتے ہیں۔

جب ہم طنز و مزاح کی بات کرتے ہیں تو اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ طنز۔۔۔ مزاح سے بالکل ہی الگ ہوتا ہے۔ گو کہ طنز کی لسانی ساختیں مزاح کی ساختوں سے مختلف ہوتی ہیں لیکن مزاح نگار اِس بات کا اہتمام رکھتے ہیں کہ طنز۔۔۔ مزاح سے آہنگ کر کے پیش کیا جائے۔ یہاں طنز کا مطلب وہ طنزیہ جملے بھی نہیں جو اپنے جوہر میں تضحیکی ہوتے ہیں اور کسی "کاٹ" پہ دال کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد وہ Irony ہے جو کسی فقیر کو بادشاہ یا بادشاہ کو فقیر کا لباس پہنا کر استعاراتی اور مجازی طور پر کرداروں کو ظرافت پہنائی جاتی ہے۔ طنز کاٹ دار ہو تو طنز نگاری اکثر ذاتیاتی نفسیات کا کثیف عکس ٹھہرتی ہے اور مزاح بوجھل ہوتا ہے، تمسخر اور تضحیک اساس ارادی متن کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مسکراہٹ، تبسم، ہنسی، پھر ہنسی میں کھلکھلاہٹ اور قہقہہ سب انسانی، ثقافتی اور سماجی زندگی میں عمل اور ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح ایک المیہ نگار، یا مرثیہ گو، یا کوئی افسانہ نگار اپنے متن میں شعوری یا لاشعوری طور پر قاری یا سامع کے ردعمل کو کشید کرنے کے لیے ایک خواہش رکھتا ہے اِسی طرح مزاح نگار کے متون میں بھی یہ تقاضا موجود ہوتا ہے اور یہ ردعمل یقیناً اُس ردعمل سے مختلف ہوتا ہے جو ایک طنز نگار کا متنی تقاضا ہے۔ اب مزاح نگار بھی مختلف تناظری اور متنی مزاج رکھتے ہیں اِس لیے اُن کے تقاضے بھی کثیر الجہت ہیں۔ کسی کی ترجیح شدید کاٹ دار طنز ہے تو کوئی اردوے معلیٰ کا لسانی پیراہن زیب تن کر کے خود طنزیہ ماسک پہن کر عام آدمی یا سماجی رویوں پر طنز کرتا رہتا ہے۔ یہ اشرافیائی لسانی ساختیں طنز و مزاح کے باوجود لسانی سیاست سے ماورا نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مزاح نگاری کچھ لوگوں کی دوسری بری عادت ہے۔ پہلی عادت، خود اُن کا اشرافیہ اساس ہونا ہے۔ یہاں طنز کے معنی مختلف ہیں۔ مغربی ادب میں Irony اور Satire دونوں ہی اردو زبان میں طنز کہلاتے ہیں۔ لیکن Irony ایک اہم حصہ ہے Satire کا۔ اِس سیٹائر یعنی طنز کے دو حصے ہیں۔ شدید طنز کو مغربی ادب میں Juvenal طنز کہا جاتا ہے جبکہ ہلکے پھلکے کو Horatian satire کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو برصغیر میں اِسی لطیف طنز ہی کی روایت رہی ہے۔ اِس کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں مزاحیہ مزاحمت نہ ہونے کے برابر ہے۔ زیادہ تر مزاح نگار اخلاق پسند ٹھہرتے ہوئے طنز و مزاح کا رخ اخلاقی گراوٹ کی طرف موڑے رکھتے ہیں۔ سوال یہ بھی اہم ہے کہ مزاح کے لیے کس قسم کی صورت حال درکار ہے، اِس سوال کے جواب کے لیے ہم نے نادر خان سرگروہ کی کتاب "باادب با محاورہ ہوشیار" کا رخ کیا تو ہمیں بار بار اپنی ہنسی روک کر اُس ظریفانہ متن کو سمجھنا پڑا۔

اِس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ نادر قاری کی ہنسی کا امتحان لے رہا ہے، کبھی Telling سے، یعنی بیانیہ سے اور کبھی Showing یعنی کسی ڈرامائی کیفیت سے۔ نادر چونکہ ادب کا سنجیدہ طالب علم ہے اِس لیے اُس کے متون میں تمثیل و تجسیم اور استعارہ و مجاز بڑی مزاحیہ سنجیدگی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ بات بھی چونکا دیتی ہے کہ نادر کرداروں کو افسانوی رنگ میں رنگ کر بیانیہ میں ڈھالتا ہے۔ ان بیانیوں سے کرداروں کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سامنے آتی ہیں، جن میں نادر کے عہد کی ثقافت اور ثقافتی رویے موجود ہیں۔ نادر کی دلچسپی کا مرکز اِنھی کہانیوں سے مزاح کشید کرنا ہے۔ مثال کے طور پر مضمون ''نٹ کھٹ روزہ دار'' دیکھ لیں یا کوئی اور مضمون، تقریباً اِن سب مضامین میں چھوٹی بڑی کہانیاں اختراع کی گئی ہیں، جن سے قاری نہ صرف لطف لیتا ہے بلکہ گردوپیش، حالات حاضرہ اور عالمگیریت میں ماحولیاتی مسکراہٹ کا شعور حاصل کرتا ہے۔

نادر کی حس مزاح کی رو سے کوئی عورت، بیوی، ساس، بہو کے خواہ مخواہ کے جھگڑے متنوں کے مراکز نہیں بنتے، (شاید اس لیے کہ نادر یہ سب سن سن کے تنگ آ چکا ہے) بلکہ ایک مسکراتی ہوئی عصریت پینٹ کی گئی ہے جس میں سب خاص و عام شامل ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ نادر لوکیل سے کردار الگ کر کے دیکھتا ہے۔ اس لیے کہ ایک لکھاری سماجی و ثقافتی نفسیات کے ادراک کے بغیر نہ تو المیہ تخلیق کرسکتا ہے نہ طربیہ۔ مزاح نگار وہی کامیاب ہوتا ہے جو کسی المیہ کو بھی ''ہلکا پھلکا'' کر مانوس بنا کر پیش کرتا ہے اِس کے لیے اُسے اپنا جارگن یا ڈسکورس استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں دیکھا جائے تو نادری ڈسکورس بڑی مہارت سے سینچا گیا ہے۔ نادر کا تصورِ مزاح، سماجی نفسیات سے جڑتے ہوئے ہی واضح ہوتا ہے۔ کوئی بھی مضمون اٹھالیں، نادر معاشرت سے لسانیات تک کا سفر (پیدل) طے کرتا نظر آتا ہے۔ اِس لیے کہ اُس نے زندگی کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ سڑکوں پر گھوم رہا ہوتا ہے لیکن " کھلی آنکھوں " سے۔ سب راستے واستے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایسے مشاہدہ کی نظر سے گزرتے ہیں جیسے اُن کی ای سی جی ہو رہی ہو۔ اُس کی نظر میں "راستہ پار کرنا بھی ایک فن ہے"۔ میری نظر میں اِس جملے میں بھی ایک پن ہے۔ یہاں نادر کے لاشعور کو اُس کی ثقافتی روایت سے جوڑے بغیر تفہیم مشکل ہے۔ سارے مضامین میں کہیں علامت، کہیں Implicature اور کہیں استعارہ معنی کی مسکراہٹ کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اُس مسکراہٹ کو آرٹ میں ڈھالنے کے لیے نادر Irony کا استعمال بھی کرتا ہے۔

> ''کسی بھی مین ہول کا ہمہ وقت کھلا رہنا اشد ضروری ہے، تاکہ کسی آنکھ والے کی آنکھ چوکے اور وہ اُس میں جا اُترے تو بے چارے کا دم نہ گھٹے۔ اِس لیے کچھ خیر اندیش ایک ایک کر کے شہر کے تمام مین ہولز کے ڈھکن، دن دہاڑے اڑا لے جاتے ہیں۔ اِتنے بھیڑ بھڑکے میں ایسے ایسے بھاری بھرکم ڈھکن اٹھا کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب کر دینا کوئی شریف بچوں کا کھیل نہیں۔''

نادر کا کوئی بھی مضمون پڑھ لیں، اُس میں جنرل نالج بہت ملے گا، شاید نادر کو یہ احساس بری طرح جھنجھوڑتا ہے کہ ہماری قوم کا جنرل نالج بہت کمزور ہے۔ یا پھر یہ کہ مقابلے کے امتحان میں اکثر طلبا و طالبات جنرل نالج میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں نادر نے پوری کوشش کی ہے کہ طلبا و طالبات ہنستے مسکراتے اپنے سماج اور اطراف کی جان کاری کر جائیں اور کچھ بوجھل بھی نہ محسوس ہو۔ اِس لیے اُس نے جگہ جگہ یہ اہتمام رکھا ہے۔

> ''دنیا میں سب سے زیادہ پُل جاپان میں دیکھنے کو ملتے ہیں، وہاں ہر پل ایک نیا پُل نظر آتا ہے۔ جاپان کی ترقی میں اِن ہی پلوں کا ہاتھ ہے۔ جب کہ ہمارے ملک کی ترقی میں اِن پلوں کی ٹانگ ہے ! یہ ایسی جگہ بنائے جاتے ہیں کہ لگتا ہے حکومت ترقی کی راہ میں ٹانگ اُڑا رہی ہے۔ جاپان کی نوے فیصد آبادی ملک کے بیس فی صد رقبے پر آباد ہے، اِس لیے وہاں کا ہر شہر بھیڑ سے لبریز ہے۔ لیکن کیا مجال کہ چھلک جائے۔

بھیڑ میں رہنا اور چلنا پھرنا شاید جاپانیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ بھیڑ کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے وہاں سومو پہلوان تیار کیے جاتے ہیں۔ اُن کی ترقی کا راز بھی اسی میں ہے کہ فاصلے کم سے کم ہوں اور وقت کا استعمال زیادہ سے زیادہ ہو۔ جاپان کے زیادہ تر شہر سمندر کے ساحل پر بسائے گئے ہیں تاکہ بحری راستے سے بھی شہروں کو آپس میں جوڑا جائے۔"

نادر محاورے کا آدمی ہے۔ لسانی تراکیب اور تجربات کے مزاح کو اَدبیت سے سنوارتا ہے۔ اُس نے اپنی کتاب کا نام بھی سوچ سمجھ کر رکھا ہے۔ محاورہ کا تنوع تحریر کو نہایت دلچسپ بنا کر پیش کرتا ہے لیکن اُس میں متن کسی بھی بے ترتیبی کا شکار ہو جائے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ لسانی انبساط سے جو بھی واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ لفظوں کا انتخاب و اِنسلاک کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نادر اُن لسانی تجربات میں کسی لسانی جبر کا قائل نہیں، اُس کے ہاں Spontaneity اُس لسانی مشقت سے بہتر ہے جس سے نثری بہاؤ متاثر ہو جائے۔

"آج پیسے پر کچھ بولنے کو جی للچا رہا ہے۔ میں پیسے پر کیا بول سکتا ہوں کہ پیسہ خود بولتا ہے۔ پیسہ کچھ لوگوں پر نظر آتا ہے تو کچھ لوگ پیسے کو اپنے اوپر نظر آنے دیتے ہیں۔ کچھ لوگ جان بوجھ کر ایسے نظر آتے ہیں کہ اُن کے پاس کوئی پیسا ویسا نہیں ہے، تاکہ کہیں سے چار پیسے مل جائیں۔ یوں بھی ایسے لوگوں کی حالت دیکھ کر پیسا، دو پیسا دینے کو جی چاہتا ہے۔"

نادر کے پاس سیاسی ہنسی کا تصور بھی نہیں، نہ ہی کوئی دفتری یا سرکاری ہنسی اُس کی لطافت کا سروکار نظر آتی ہے۔ ایسی کھسیانی ہنسی، مسکراہٹ اور کراہت میں فرق محسوس کرنے کے لیے بہت کارآمد نسخہ ہے۔ اس لیے یہ بھی خیال کیا جاتا ہے انسانی تجربات میں وسعت ہی انسانی رویوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ بعض سرکاری افسر اپنے منہ کے ایک حصہ کو اِس طرح بل دیتے ہیں کہ ایک حصہ ہنستا اور دوسرا روتا نظر آتا ہے۔ ہے تو یہ بڑا مکروہ عمل لیکن فنکار کی ریاضت کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نادر کی تصویر دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ نادر کوشش بھی کرے تو ایسی شکل نہیں بنا سکتا۔ دوسری بات دلیل یہ کہ نادر وہی کچھ لکھتا ہے جو اُس کے ذاتی تجربے میں ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے کہ ثقافتی شعور و لاشعور اس کے متون کی قرات میں کتنے اہم ہیں۔ اُس کے سارے مضامین ٹٹول ڈالے، یہ مثال تلاش کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کہ کوئی ایسا اقتباس اس مضمون میں شامل کیا جائے جس میں مزاح نگار سیاسی مسکراہٹ کا شکار نظر آئے۔ وہ Euphimism کا اچھی طرح شکار نظر آتا ہے۔ کسی تاریخی سماجی تلخی کو بھی اِس طرح بیان کرتا ہے کہ خود کردار بھی اُس کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ "ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جوتوں پر کچھ لکھیں گے۔ اور بے حمیت سیاست دانوں کو پڑنے کے بعد تو جوتے اِس قابل ہی نہیں رہے کہ اُن پر کچھ لکھا جائے۔ لیکن جب ہم نے بُش کو جوتے پڑنے کے بعد سب قلم کاروں کی جوتوں پر لکھنے کی اِشتہا دیکھی تو ہمارے پیٹ میں بھی جوتے دوڑنے لگے۔ چاروناچار ہمیں بھی جوتوں کی شان میں قصیدہ گوئی کا قصد کرنا پڑا۔ یوں تو اَب سے پہلے بھی بے شمار سیاست دانوں کی شہرت میں جوتوں سے چار چاند (کے دھبے) لگے ہیں لیکن بش پر ہوئی جوتوں کی غلہ باری (نشانہ بازی) کو میڈیا اور ادبی حلقوں نے عراق پر ہوئی گولہ باری سے زیادہ اچھالا۔ لیکن اس کی ڈھٹائی دیکھیے کہ:

جوتیاں کھا کے بے مزانہ ہوا

نادر کے مضامین میں انسانی خسارے کا موضوع بھی بہت دلچسپ لگا۔ یہ خسارہ کرکٹ میں ہو یا روزمرہ زندگی میں، اُس کے مشاہدہ کا حصہ نظر آتا ہے۔ وہ لاشعوری طور پر بھی نقصان سے ڈرتا ہے۔ لیکن نقصان ہو جائے تو ہنس دیتا ہے۔ کئی مضامین ایسے ہیں، جیسے وہ نقصان کے بعد لوگوں کا حوصلہ بڑھاتا نظر آتا ہے۔ وہ حالاتِ حاضرہ، ٹیکنالوجی، کارٹونز، گلی محلے کی ثقافت، ادبی ثقافت، ٹرکی ادب، شعر و نثر۔ دیارِ غیر میں قدیم خاں اَزلی جیسی شخصیات کا علم، انسانی نفسیات، خوبیاں کمزوریاں، ڈاکٹروں اور فارماسسٹوں کی سرگرمیاں اور پولیس چور کا اَزلی رشتہ۔ غرض ایک

معاشرت اپنی کلیت میں پیش کی گئی ہے۔ اِس معاشرت میں سارے انسان مختلف سماجی وثقافتی اِکائیاں ہیں جن کی عادتیں، رویے، اور اُن سے چھٹی رنگینی نادر کو ایٹریکٹ کرتی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نادر انسانی رویے سے زیادہ معاشرت کی اجتماعیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ کسی کردار کو معاشرت سے الگ کر کے اُس کو تضحیکی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ مزاح ویسے بھی بڑی سے بڑی قباحت کو قابلِ قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ اصل مزاح اپنے جوہر میں جمہوری ہوتا ہے۔ اُس کا متن کبھی بھی تعزیراتی نہیں ہوتا، نہ کسی کے خلاف تادیبی کاروائی ہوتی ہے، جس طرح ہجو کا منظر نامہ ہے۔ مزاح میں بھی کیتھارتک افیکٹ ہوتا ہے اور نادر کے مضامیں سے گزرتے ہوئے یہ سارے احساسات ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک اچھے اور منجھے ہوئے مزاح نگار کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدے سے چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی خوشگوار احساس کشید کرے اور اپنے اندازِ بیاں، اسلوب اور لسانی تشکیلات سے ہمہ جہت مزاح پیدا کرے۔ غرض وہ مکھی پر مکھی نہ مارے بلکہ اپنے تجربے اور مطالعے کی بنیاد پر اپنی انفرادیت قائم کرے۔ نادر کا مشاہدہ اِس ضمن میں قابلِ تحسین ہے۔ اُس نے چوہے بلی کے استعاراتی اور علامتی کھیل سے مائکرو لیول اور میکرو لیول پر معانی اخذ کیے ہیں۔ ''ہشیار باش'' میں کیمرے کی ایک آنکھ سے خبردار ہونے کی تلقین تک، ہسپتالوں کی بے رخی سے دَم اور دُم میں لسانی، بشری اور حیاتیاتی افتراق تک، اِن مضامیں سے نادر کا فکری نظام سامنے آتا ہے۔ مجھے امید ہے مستقبل کا طالب علم اِس کتاب میں موجود شگفتہ احساسات کے ساتھ ساتھ نادر کے تصورِ مزاح کو بھی سمجھے گا اور موجودہ عہد میں نادر نمونوں سے نئے معنی اخذ کر کے مزاح اور معاشرت کے انسلاک سے تفہیم وتعبیر کے نئے در وَا کرے گا۔

میں نشے میں ہوں

بغیر کسی سے معذرت کیساتھ

میکش نشے میں ہے ابھی، صہبا نشے میں ہے
لگتا ہے آج شہر یہ، سارا نشے میں ہے

ایسے میں بزمِ کیف سے، جاؤ نہ ساتھیو!
پنڈت نشے میں ہے ابھی، ملا نشے میں ہے

پی کر تمہاری چشم سے، تھوڑی سی نازنیں
لوگوں سے یہ سنا ہرا پوتا نشے میں ہے

ایسے میں اس وکیٹ پہ، رن کس طرح بنے
فلڈنگ بہت ہی چست ہے، بلّا نشے میں ہے

جاتی نہیں ہے گیند کبھی باؤنڈری کے پار
چوکا ہے بد حواس تو، چھکا نشے میں ہے

عقل و خرد کی بات وہ کرتا ہے ہر گھڑی
نایابؔ آج کل ہرا سالا نشے میں ہے

جہانگیر نایاب

اخترِ صبح

علامہ اقبالؒ سے معذرت کیساتھ

گلی کا عاشقِ ناکام رو کے کہتا تھا
"ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی"
زمانے بھر کے جو عاشق ہیں سُرخرو لوٹے
اماں! مجھی کو وہ سیمیں بدن اِدھر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا مجھ سے غم کے مارے کی
"نفس حباب کا، تابندگی شرارے کی"

"کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر"
کھڑا ہے رات سے تو اِس گلی کے نکڑ پر
تجھے تلاش ہے جس کی وہ اب نہ آئے گی
اور اُس کی ماں نے جو دیکھا، پولیس بلائے گی

میں چوکیدار ہوں میرا کہا ذرا سُن لے
نکل یہاں سے، مجھے نوکری تو کرنے دے

محمد خلیل الرحمٰن

پھولوں کی شہزادی

علامہ اقبالؒ سے معذرت کے ساتھ

محمد خلیل الرحمٰن

پڑوسن کہہ رہی تھی ایک دن مجھ سے گلستاں میں
رہی میں ایک مدت سامنے ہی باغِ رضواں میں

مگر بیوی کی سختی نے تمہیں نا آشنا رکھا
تمہیں ہم سے جدا رکھا، ہمیں تم سے جدا رکھا

تمہاری نصف بہتر سے تو میں بھی سخت نالاں ہوں
گزر کیسے کیا کرتے ہو اس کے ساتھ حیراں ہوں

کبھی موری دکھانے کے لیے ہی مجھ کو تو لے چل
بٹھا کر اپنی گاڑی میں برنگِ موجِ بو لے چل

کہا میں نے سریر آرا ہماری ہے وہ شہزادی
کہ جس کی سخت نظروں سے نہیں ہے مجھ کو آزادی

کھڑی ہے گھر کے دروازے پہ بیگم اس طرح تن کر
کہاں ممکن کہ میں نکلوں تمہارا ہم نشیں بن کر

مری آزاد ہے فطرت مگر ہوں گربۂ مسکیں
نہیں ممکن کہ نظریں پھیر لے مجھ سے مرا گلچیں

''نظر اس کی پیامِ عید ہے اہلِ محرم کو
بنا دیتی ہے گوہر غم زدوں کے اشکِ پیہم کو''

صوفی غلام مصطفیٰ مرحوم کی روح سے معذرت

وہ مجھ سے ہوئے ہمکلام اللہ اللہ
کہاں میں کہاں "ٹھڈو جام" اللہ اللہ

یہ بچوں کی چوں چوں، یہ بیگم کی چاں چاں
یہ ہنگامۂ صبح و شام اللہ اللہ

یہ حلوے کی تابانیوں کا تسلسل
یہ ذوقِ شکم کا دوام اللہ اللہ

وہ جھینپا ہوا اِک میاں کا تبسم
وہ گھر میں کسی کے دھڑام اللہ اللہ

مرا گھر، مری سیلری مختصر سی
وہ سسرال کا اژدھام اللہ اللہ

وہ بزمِ سخن میں ٹماٹر کی بارش
ظفر کا وہ لطفِ کلام اللہ اللہ

نوید ظفر کیانی

روبینہ شاہین بیناؔ

موجِ غزل اور طنز و مزاح

وقت کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر فی البدیہہ آن لائن شعری نشستوں کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی ہے۔ موجِ غزل بھی ایک ایسا ہی شعری گروہ ہے جو منفرد اور جاندار مشاعروں کے سبب شعراء و شاعرات میں خاصا مقبول ہے۔ اِن شعری نشستوں کا فارمیٹ ہر ہفتے مختلف ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شعراء کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

موجِ غزل کے مشاعروں میں چند ایسے شعراء بھی تسلسل کے ساتھ حصہ لیتے ہیں جو طنز و مزاح شاعری کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اپنی ان کارستانیوں پر اس طرح قائم ہیں جیسے لیڈر "کرپشانہ" روش پر۔ اس رپورٹ میں گزشتہ سہ ماہی (جولائی ۲۰۱۷ء تا ستمبر ۲۰۱۷ء) میں ہونے والے مشاعروں میں اسی عنصر کی کھوج لگائی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔

یکم جولائی ۲۰۱۷ء کو موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۶۳ موجِ غزل کے خوبصورت شاعر جناب شاہین فصیح ربانی کے طرحی مصرع "سر پر ہمارے آن پڑی ہے" پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں شعراء کی ایک کبہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اِس شعری نشست کے طنز و مزاح پر مبنی چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

ہم کو ضرورت آن پڑی ہے
رستے میں دو کان پڑی ہے

احمد مسعود قریشی

ساس ہے بھڑکیلی ساڑھی میں
یا کوئلے کی کان پڑی ہے

پانامہ ہے کیس ہمارا
جا کیا تجھ کو خان پڑی ہے
ساس کے لہجے سے نکلی ہے
جو گرمی ملتان پڑی ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

پچھلی عید سے اب تک گھر میں
بکرے کی اک ران پڑی ہے

نور جمشید پوری

مشاعرہ نمبر ۶۴ کا انعقاد مورخہ ۸ جولائی ۲۰۱۷ء کی شام کو کیا گیا۔ اِس بار "پابند ردیف" پر مبنی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس

نوع کے مشاعرے کے تحت ردیف میں سلسلہ وار حروف تہجی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بار شعراء کو حرف "ت" پر ختم ہونے والی ردیف استعمال کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اِس شعری نشست میں پیش کردہ طنز و مزاح پر مبنی منتخب چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

اور ہو گا نہ کچھ بدلنے سے
ڈھونڈ لیں گے وہ پھر کوئی عادت

ذیشان فیصل شان

اس عشق نامراد کے قابل نہیں ہوں میں
سوری! مرے رقیب! مرے یار! معذرت

ہاشم علی خان ہمدم

۱۵ جولائی ۲۰۱۷ء کا موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۶۵ احمد ندیم قاسمی مرحوم کے طرحی مصرع "ہم دن کے پیامی ہیں مگر کشتۂ شب ہیں" پر منعقد کیا گیا تھا۔ اِس شعری نشست کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

اس دور کے مجنوں ہیں نہیں دشت کے راہی
کاہل ہیں، تن آسان ہیں، آرام طلب ہیں

عرفان قادر

اس بار مری جھوٹی خوشامد نہ چلے گی
اس بار مری ساس کے انداز غضب ہیں

استاد غزلیات جنھیں دیتا تھا لکھ کے
اب خیر سے وہ آپ گلستان ادب ہیں

وہ جن سے کرپشن بھی نہیں ہوتی ہے بینا
لینے کو سیاست میں بھلا آئے وہ "امب" ہیں

روبینہ شاہین بینا

موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۶۶ مورخہ ۲۲ جولائی ۲۰۱۷ء کی شام منعقد کیا گیا۔ یہ شعری نشست منفرد ردیف پر مشتمل تھی۔ اس مشاعرے کے فارمیٹ کے مطابق شعراء و شاعرات ردیف "ساون" کا ستعمال کرتے ہوئے اپنی کاوشیں پیش کر سکتے تھے۔ کاوشیں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر بھی مشتمل ہو سکتی تھی۔ اِس شعری نشست میں کہے گئے طنز و مزاح پر مبنی منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

ایک پل کے لئے بھی سانس کہاں لیتے ہو!
کام پر جیسے لگی ہو کوئی دھوبن ساون

کرتے پھرتے ہیں یہ سورج سے بھی غنڈہ گردی
ابر آوارہ ہوئے ہیں تیرے کارن ساون!

جھونپڑے سب کے بہالے گئے نالے تیرے
کتنا اوباش ہے توبہ! تیرا جوبن ساون
نویدؔ ظفر کیانی

واسا نے بھی لکھ بھیجا ہے
پیاس لگے تو پینا ساون
روبینہ شاہین بیناؔ

موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۶۷ کا انعقاد مورخہ ۲۲ رجولائی ۲۰۱۷ء کی شام کو کیا گیا۔ یہ شعری نشست موجِ غزل کی خوبصورت شاعرہ محترمہ دلشادؔ نسیم کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ محترمہ موجِ غزل کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتی ہیں۔ اس مشاعرے میں اُن کی ایک غزل سے لیا گیا مصرع ''ہوا کے پاس کوئی مصلحت نہیں ہوتی'' شعری مشق کے لئے دیا گیا تھا۔ اِس شعری نشست میں پیش کردہ طنز و مزاح پر مبنی منتخب اشعار کچھ یوں تھے۔

میں گھر میں ہوں تو عبث ہے یہ پرسشِ احوال
میں ہوں وہاں کہ جہاں خیریت نہیں ہوتی
ہزار دل سے کریں رویتِ ہلال کا کام
جو تاڑوں میں ہے وہ محویت نہیں ہوتی
نویدؔ ظفر کیانی

شباب میں جسے چاہت کی لت نہیں ہوتی
سراس کے پاس تو ہوتا ہے ''مت'' نہیں ہوتی
زمانہ ہم کو بہت معتبر سمجھتا ہے
ہماری گھر میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی
نویدؔ صدیقی

کرو کہیں سے کھلانے پلانے کا چکر
قبول ایسے ہی اب معذرت نہیں ہوتی
ڈاکٹر شاہدؔ رحمان

بتوں پہ مرنے میں تو عافیت نہیں ہوتی
اگر اسی میں رہے ، مغفرت نہیں ہوتی
بلال قاصرؔ

گرینڈ ساس کا عہدہ بھی باس جیسا ہے
کہ بات جو بھی کہے وہ غلط نہیں ہوتی
روبینہ شاہین بیناؔ

مشاعرہ نمبر ۶۸ کا انعقاد مورخہ ۲۲ رجولائی ۲۰۱۷ء کی شام کو کیا گیا۔ اس بار ''پابند ردیف'' کے تحت شعراء کو حرف ''ٹ'' پر ختم ہونے والی ردیف استعمال کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اِس شعری نشست میں پیش کردہ طنز و مزاح پر مبنی منتخب چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

چلے گئے ہیں آپ آج پھر بدل کے رُوٹ
کھڑے ہیں منتظر جناب پہنے لال سُوٹ

خضر حیات خضر

یہاں پر قیس دیوانہ نہیں ہے
اسی کی دشت میں ہے چودھراہٹ

محمد ظہیر قندیل

میزان پر کسی نے جو رکھا سفید جھوٹ
کالے زباں دراز نے بولا سفید جھوٹ
گویا کسی کو جرأت اظہار ہی نہیں
بولا گیا ہے آج بھی گویا سفید جھوٹ

ہاشم علی خان ہمدم

جیسے اکڑ بکڑ ہم
ویسے رہبر ٹوٹ بٹوٹ
کیچڑستاں سب اعمال
سنگِ مرمر ٹوٹ بٹوٹ
دیوارِ گریہ پر بھی
تھاپے گوبر ٹوٹ بٹوٹ

نوید ظفر کیانی (نظم "ٹوٹ بٹوٹ")

کچھ خواتین اتنی نازک ہیں
اُن کو درکار ہوں گے سلکی نوٹ
اِن کے اثرات کھل جا سم سم " سے
گویا ہر قفل کی ہیں چابی نوٹ

روبینہ شاہین بینا

ہے کوئی قائدِ اعظم! بجز جناح کہیں
جگہ جگہ ہے پکارے عوام! آئے نوٹ
جو امتحان کرے پاس نوٹ دے دے کر
دکھائے کام وہ پا کر بلا دکھائے نوٹ

عبد رضا کاشر (نظم "نوٹ")

موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۷۰ مورخہ ۱۹ اگست ۲۰۱۷ء کی شام کو منعقد کیا گیا۔ یہ شعری نشست منفرد ردیف پر مشتمل تھی۔ اس بار ردیف کے طور پر لفظ "یقیناً" کا انتخاب کیا گیا۔ اہلِ ادب نے دل کھول کر حصہ لیا۔ کاوشیں حسبِ روایت غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر بھی مشتمل تھیں۔ اِس شعری نشست میں کہے گئے طنز و مزاح پر مبنی منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

بتاتا ہے ترا طرزِ خطابت
بسوں میں بیچا ہے منجن یقیناً
یہ جو ہے نقشِ پا ماتھے پہ تیرے
یہی ہے عشق کا ٹوکن یقیناً

نصیب دشمناں بریانیاں ہیں
مرے حصے میں ہے کھرچن یقیناً

نوید ظفر کیانی

جو پوز کیا کرتا ہے خود کو کوئی ہیرو
اوروں کو نظر آتا ہے لنگور یقیناً
تکرار میں باتوں سے تو جی سیر نہ ہوگا
گھونسہ ہی جواب اس کا ہے بھرپور یقیناً
اب ذکر سیاست پہ یہی ذہن میں آئے
دولت کی ڈھلائی کا ہے مذکور یقیناً

نوید ظفر کیانی

وہ چور پرانا ہے کبھی قید نہ ہو گا
چل جائے گا آخر میں کوئی چال یقیناً"
ماضی سے سبق اس نے کوئی سیکھا نہیں ہے
یہ حال کرے گا اسے بے حال یقیناً
جب فون کو دیکھا ہے تو بھاگا ہے بیچارہ
بیگم کا بلاوا ہے یہ مس کال یقیناً

روبینہ شاہین بینا

لگائی بجھائی ہے عادت تمھاری
رہے تُم ہوٹی وی پہ اینکر یقیناً

رہو دور سسرال سے تم ہمیشہ
کراچی سے جیسے پشاور یقیناً

عرفان قادر

منڈی میں ابھی تیل کا بھاؤ نہیں بدلا
نکلے گا غریبوں کا ابھی تیل یقیناً
ورنہ کبھی دنیا میں یوں بدنام نہ ہوتا
پپو کو عدالت نے کیا فیل یقیناً
جلسے میں دھڑلے سے ملن ہونے لگا ہے
میلے میں ہوا کرتا تھا جو میل یقیناً

ہاشم علی خان ہمدم

ٹوٹیں گے بہت جلد ہی تم دیکھنا برتن
رہتی ہو جہاں روز ہی تکرار یقیناً

ڈاکٹر شاہد رحمان

مشاعرہ نمبر ۱۷ کا انعقاد مورخہ ۲۶ راگست ۲۰۱۷ء کی شام کو کیا گیا۔ اس بار "پابند ردیف" کے تحت حروفِ تہجی میں حرف "ش" پر ختم ہونے والی ردیف استعمال کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس شعری نشست میں پیش کردہ طنز و مزاح پر مبنی منتخب چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

کچھ بھی بتا نہ پایا کہ جو بات کی گئی

ردیف: یقیناً قوافی اور بحر: حسبِ ذوق

ضرورتِ شعری کے تحت ردیف میں معمولی کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔
قوافی اور بحر بدل کر مزید غزلیں کہی جاسکتی ہیں۔ ردیف کے عنوان پر کسی بھی ہیئت میں نظم کہی جاسکتی ہے۔
مشاعرہ ۱۹ راگست ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ سہ پہر ۳ بجے شروع ہوگا اور اتوار رات ۹ بجے تک جاری رہے گا۔
کلام مقررہ وقت پر ایک ایک شعر کی صورت میں پیش کیا جائے، جو یکجا کلام کی صورت میں ڈیزائن ہوگا۔
کلام یکجا پوسٹ پر اتوار رات ۹ بجے تک آویزاں کردیا جائے تاکہ ڈیزائننگ بروقت ہوسکے۔

میزبان: ہاشم علی خان ہمدم، نوید ظفر کیانی، روبینہ شاہین، قدسیہ ظہور، نور جمشید پوری، دلشاد نسیم، شہناز رضوی، جیا قریشی، عرفان قادر، نوید صدیقی اور احبابِ موجِ غزل

سر کو کھجاتا رہ گیا ہر ناقلِ بحث
زور آوروں نے پسٹل جو ٹیبل پہ دھر دیا
آسانی سے نمٹ گئی ہر مشکلِ بحث
جو "تک" کی ہانکتے تھے، فقط منمناتے تھے
شورش بپا رہا ہے بہت جاہلِ بحث

نوید ظفر کیانی

وہ تھی بس یونہی سی مگر پھر بھی ہر سو
تھی بھونڈوں کی بھرمار کہ تھی مؤنث
اُسے تاڑ میں رکھنا دشوار تر تھا
یوں چوکس تھا ریڈار کہ تھی مؤنث
میں چاہتا تھا اِس عید پر تگڑا بکرا
اُسے "پنک" درکار کہ تھی مؤنث

نوید ظفر کیانی

بنا رکھے ہیں جس نے فیس بک پر ڈھیر یارانے
محبت ہو گئی رُسوا اک ایسی ہیر کے باعث
نہیں ہے چیز کوئی بھی نکمی اس زمانے میں
بہت سے لوگ شاعر بھی بنے تبخیر کے باعث
لیے دل میں ارادہ عقدِ ثانی کا کئی شوہر
رہے خاموش بیلن، سینڈلوں، کفگیر کے باعث

عرفان قادر

کر رہے ہیں وہ بیگماتی بحث
شاعری میں ہے تجرباتی بحث
شاعروں کا مذاکرہ کیا ہے؟
کر رہے ہیں تصوراتی بحث
ماہر عملیات کرتے ہیں
اشتہاروں میں وارداتی بحث
میڈیا پر فقط سیاست ہے
ختم ہے اب ترقیاتی بحث

روبینہ شاہین بینا

موجِ غزل کا مشاعرہ نمبر ۲۷ مورخہ ۲ ستمبر ۲۰۱۷ء کی شام کو منعقد کیا گیا۔ چونکہ یہ شعری نشست عیدالاضحیٰ کے نیک اور رنگا رنگ موقع پر تھی اس کے لئے جو مصرعِ طرح دیا گیا وہ اسی حوالے سے تھا۔ اس کا مصرعِ طرح تھا "شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا"۔ اِس شعری نشست میں چونکہ موقع اور مصرعِ طرح کی مناسبت سے شعوری طور پر طنز و مزاح کا ماحول بنایا گیا تھا اس لئے زیادہ تر شعراء نے طنز و مزاح پر مبنی اشعار کہے۔ چند حسبِ ذیل ہیں۔

بیوی نے سنبھالا ہے یہ بپھرا ہوا بکرا
"شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا"

محمد خلیل الرحمن خلیل

۲۷ واں
شگفتہ شگفتہ عیدالاضحیٰ رنگ
طرحی مصرع
میں میں کی بلکتی ہوئی آواز سنی ہے
شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا
موجِ غزل
عالمی طرحی مشاعرہ
افاعیل مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن
قوافی خریدا، چھپایا، سنبھالا، اڑایا، دیکھا، مارا، کاٹا، بپھرا ردیف ہوا بکرا
میزبان ہاشم علی خان ہمدم، نوید ظفر کیانی، روبینہ شاہین، قدسیہ ظہور، عرفان قادر، نوید صدیقی، نور جمشید پوری
شہناز رضوی، دلشاد نسیم، حیا قریشی اور احباب موجِ غزل

"میں میں کی بلکتی ہوئی آواز سنی ہے"
لگتا ہے پڑوسن کا ہے بھاگا ہوا بکرا

انعام الحق معصوم

آجائے گا قربانی کے بھی کام یقیناً
سیلفی کے لئے خاص خریدا ہوا بکرا
قربانی محلے میں تو دی ہوتی ہے سب نے
مل سکتا ہے واپس بھی یوں بانٹا ہوا بکرا
اب مالی پوزیشن ہی کچھ ایسی ہے کہ اس سے
لے سکتے ہیں کاغذ پہ بنایا ہوا بکرا

نوید ظفر کیانی

دیکھو جو ذرا غور سے کچھ فرق نہیں ہے
شوہر بھی تو لگتا ہے سدھایا ہوا بکرا
استاد بہت بھد پٹی فن کی گلی میں
چوری ہوا چوروں سے چرایا ہوا بکرا

ساز دہلوی

نہ دیکھا نہیں ہم نے کبھی بپھرا ہوا بکرا
شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا

ذہینہ صدیقی

ہنستے ہوئے کل شیخ نے یوں ہی ہمیں پوچھا
تم نے کبھی دیکھا نہیں ہنستا ہوا بکرا
مرنے پہ بھی چھوڑی نہیں جاوید شرارت
پکنے پہ ذرا دیکھو تو آدھا ہوا بکرا

جاوید احمد خان جاوید

خاور اُسے دیکھو تو، ذرا غور سے جا کر
"شوہر ہے کہ منڈی سے، خریدہ ہُوا بکرا"

خاور چشتی

مہنگائی نے اس عید پہ یوں تیل نکالا
اوپر تھی چھری میں تھا گرایا ہوا بکرا
آتا نہیں مہماں کوئی گھر پر مرے لوگو
لگتا ہوں میں شہزاد سنبھالا ہوا بکرا

ضیا شہزاد

بجلی کی اچھل کود نے یہ راز بھی کھولا
چپ چاپ فریج میں تھا چھپایا ہوا بکرا
اس عید پہ اپ ڈیٹ سٹیٹس جو کیا ہے
تصویر کی صورت ہے بٹھایا ہوا بکرا
صد شکر کہ قربان جیا ہونے لگا ہے
بیوپاری کے ہاتھوں کا ستایا ہوا بکرا

جیا قریشی

دلہن کے اقارب یہ مجھے دیکھ کہ بولے
خوش باش نظر آتا ہے سلجھا ہوا بکرا

شیخ علیم اسرار

میں میں کی بلکتی ھوئی آواز سنی ہے
شوہر ہے کہ منڈی سے خریدا ہوا بکرا
سینگوں پہ جسے ناز تھا، ٹکر پہ بھروسہ
قصاب کے آگے ہے پھڑکتا ہوا بکرا
عشاق سیہ فام جو دیکھے تو خوشی سے
لیلیٰ کی طرح اور بھی کالا ہوا بکرا

ہاشم علی خان ہمدم

دن رات فقط اس کی ہی سیوا میں لگے ہیں
گویا میرے بچوں کا کھلونا ہوا بکرا
رشوت میں کھلایا ہے جو دم پخت کسی نے
پولیس نے پکڑا ہے چرایا ہوا بکرا
منکوں نے عجب طور سے کی جامہ تلاشی
رکھا ہے کہاں شیخ نے کاٹا ہوا بکرا

روبینہ شاہین بینا

اب لوٹ کے واپس کبھی آئیگا نہیں وہ
کہتے ہیں سبھی جس کو نکالا ہُوا بکرا

شہناز رضوی

موج غزل کا مشاعرہ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۶ ستمبر ۲۰۱۷ء کی شام کو منعقد کیا گیا۔ یہ شعری نشست موج غزل کے خوبصورت اور

صاحب طرز شاعر جناب قمر آسی کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔مشاعرے کے لئے اُن کی غزل میں سے جس مصرعے کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ کچھ یوں تھا ''آج جو انگلیاں اُٹھاتے ہیں''۔ طرحی مصرع سادہ اور زرخیز ہونے کے باعث شعراء وشاعرات کی ایک کثیر تعداد نے اس مشاعرے میں شرکت کی اور خوب پھلجڑیاں چھوڑیں۔ مشاعرے میں کہے گئے طنز و مزاح پر مبنی منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

واسطہ کیا انہیں سیاست سے
وہ جو رزقِ حلال کھاتے ہیں
ناچتے تھے کبھی اشاروں پر
آج جو انگلیاں اٹھاتے ہیں

خمار دہلوی

لکھنا پڑھنا جنہیں سکھایا تھا
آج کل ہم کو وہ سکھاتے ہیں
ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی
ہم تو شاعر ہیں اپنے مہماں کو
رات بھر شاعری سناتے ہیں
ان کی باتوں پہ تم نہ آنا یہ
سر چڑھاتے ہیں پھر گراتے ہیں

سالک ادیب جونتی

میں ہوں انسان یا کوئی ایندھن
رات دن مجھکو کیوں جلاتے ہیں؟

شہناز رضوی

بجلیاں مفت میں گراتے ہیں
لوڈ شیڈنگ میں مسکراتے ہیں
ایسی صورت کو کیا کریں جس کو
دیکھ کر لوگ بھاگ جاتے ہیں
کھانے پینے کی بات کیا بینا
چائے پر بھی غزل سناتے ہیں

روبینہ شاہین بینا

چھیڑ کیا خوب ہے، مرے آگے
غزلیں غیروں کی گنگناتے ہیں

شبانہ جہاں

باتوں باتوں میں کیا کہیں صاحب
چاند تارے بھی توڑ لاتے ہیں

رعنا حسین چندا

مشاعرہ نمبر ۵۷ کا انعقاد مورخہ ۲۳ رستمبر ۲۰۱۷ء کو کیا گیا۔اس بار ''پابند ردیف'' کے تحت حرف ''ج'' پر ختم ہونے والی ردیف استعمال کرنے کے لئے کہا گیا۔اِس شعری نشست میں پیش کردہ طنز و مزاح پر مبنی منتخب چیدہ چیدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

لوگ ایسے بھی ہیں جن کا ہے فقط گھونسا علاج
اور اس سے بڑھ کے ہو سکتا نہیں اُن کا علاج
دردِ سر دن بھر اگر بیوی کو ہو تو جان لو
ہے کسی ہوٹل پہ جا کے شام کا کھانا علاج
کوئی مستشفیٰ ابو ظہبی یا جدّہ میں نہ تھا
دشت میں ہی قیس کا جا کر ہوا گویا علاج

عرفان قادر

شیر کہلا رہے تھے منگنی پر
اپنی بیگم سے ڈر رہے ہیں آج
عقدِ نو کا یہ شاخسانہ ہے
جو کیا تھا، وہ بھر رہے ہیں آج

روبینہ شاہین بینا

اِن شاء اللہ اگلی بار اگلی دو ماہی کی رپورٹ کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں فیس بک میں موجود شعری گروپس کے منتظمین سے درخواست کروں گی کہ وہ اپنے گروپ میں ہونے والے پروگراموں میں طنز و مزاح کے پہلوؤں سے ہونے والی ''وارداتوں'' سے پردہ اُٹھائیں اور مجلۂ ہٰذا میں ان کا اشتراک کر کے مسکراہٹیں بکھیریں، شکریہ۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

مُدیر:
نوید ظفر کیانی